اشاعت خاص

مئی-جولائی ۲۰۲۰ء

Rs.100/-

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیات نو دہلی

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نمبر

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے
ایک قابل اعتماد ادارہ

الھند فارن سروس ایجنسی

- اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں
- اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں
- اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے
- اگر آپ کا کسی ہوٹل انڈسٹری سے تعلق ہے
- اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیوڈاٹا ہمیں بھیج دیجیے......اور دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجیے۔

وكالة الهند للخدمات الأجنبية

AL-HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

Head Off: No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)
E-mail: info@al-hind.com

Ph : 0091 - 11 - 26983980, 26983981
0091 - 11 - 26988375 / 76
Fax : 0091 - 11 - 26983982

Web: www.al-hind.com

Branch Office: 38, G.F. Ashoka Shopping Complex, Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)
Ph. : 0091-22-22652906 Fax: 0091 - 22 - 22652910

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

مدیر مسئول : سید راشد حامدی | مدیر اعزازی : ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

مدیر معاون : محمد اسعد فلاحی | منیجر : عبد الحاکم مجاہد

جلد:۵ شمارہ:۵ | مئی۔جولائی ۲۰۲۰ء/رمضان المبارک۔ذی قعدہ ۱۴۴۱ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9927206518،8287025094 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 7011838453

ای میل:jareedahayatenau@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، لندن

۲۔ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، علی گڑھ

۳۔مولانا انعام اللہ فلاحی، دہلی

۴۔مولانا عبد البر اثری فلاحی، ممبئی

۵۔مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، جامعۃ الفلاح

۶۔امتیاز وحید فلاحی، کولکاتا

۷۔محمد انس فلاحی مدنی، سنبھل

ہمارے نمائندے

۱۔رضوان احمد فلاحی، لندن

۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات

۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال

۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر

۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت

۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب

۷۔ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

پیغام	رحمت اللہ اثری فلاحی	۹
پیغام	مشرف حسین صدیقی فلاحی	۱۰
اداریہ	ضیاء الدین ملک فلاحی	۱۱

حیات، تأثرات اور خدمات

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ ایک نظر میں	محمد انس فلاحی مدنی	۱۶
رفیق عشق و وفا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ	نظام الدین اصلاحی	۱۹
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ کچھ یادیں	اشتیاق احمد ظلی	۳۰
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ مکمل نامۂ انکسار	ابوسفیان اصلاحی	۳۸
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!	محمد عنایت اللہ اسد سبحانی	۴۶
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ چند یادیں، چند باتیں	محمد طاہر مدنی	۵۵
آہ! میرے استاد و مربی	محمد عمران فلاحی	۶۰
فکرِ فراہیؒ و فکرِ مودودیؒ کا ترجمان	عبیداللہ فہد فلاحی	۶۹
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز	عبدالبر اثری فلاحی	۸۴
وہ سایۂ شفقت نہ رہا	انعام اللہ فلاحی	۸۹
امانت و دیانت کے پیکر مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ	محمد اسماعیل فلاحی	۹۳
وہ چاند اب بھی میرے دل میں نور افشاں ہے	افتخار الحسن ندوی	۹۸
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی یاد میں	محمد اسحاق فلاحی	۱۰۲

آہ! مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ	تحریر: اورنگ زیب اعظمی ترجمانی: محمد انس فلاحی مدنی	۱۰۸
اجلا اجلا پیراہن	صباح الدین اعظمی	۱۱۳
ایک کامیاب معلم، ایک دوراندیش منتظم	محمد حسن حبیب فلاحی	۱۱۹
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!	زبیر احمد ملک فلاحی	۱۲۴
مولانا عبدالحسیب اصلاحی۔ جیسا میں نے ان کو دیکھا	غلام نبی فلاحی	۱۲۹
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل	عارف حسین فلاحی	۱۳۶
گفتار اور کردار کے پیکر	محمد ادریس جمیل فلاحی	۱۴۴
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ دل نواز شخصیت	محی الدین غازی	۱۴۸
فکر فراہی و فکر مودودی کا سنگم: مولانا عبدالحسیب اصلاحی	رضوان احمد رفیق	۱۵۱
اخلاق و کردار کے روشن چراغ	سکندر علی اصلاحی	۱۵۶
انکساری و تواضع کی مجسم تصویر	محمد انس	۱۶۱
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں	انعام اللہ اعظمی فلاحی	۱۶۵
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر	نعمان بدر فلاحی	۱۶۸
گوشہ عبدالحسیب سے وابستہ چند یادیں	ابن العلم فلاحی	۱۷۴
کچھ یادیں، کچھ باتیں	ابوالمکارم فلاحی ازہری	۱۸۲
تمہارے بعد چمن لٹا لٹا سا ہے!	نصرت رضی فلاحی	۱۸۴
یادیں اتنی گہری کیوں ہیں؟	راحلہ بنت عبدالحکیم	۱۸۶
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے معمولاتِ زندگی	ابوسالم یحییٰ فلاحی	۱۸۸
مولانا عبدالحسیبؒ اور مرکزی لائبریری	عبدالرحمٰن خالد فلاحی	۱۹۳
نصاب تعلیم و تربیت کی تعمیر اور ترقی میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا حصہ	ظفر احمد اثری فلاحی	۲۰۱

اھلِ خاندان کے جذبات

ابّا کی یاد میں- چند باتیں	صفیہ عبدالحسیب فلاحی	۲۶۳
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان	عبدالحمید حاکم	۲۶۷
مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!	صفی الرحمٰن نبیل	۲۷۶
خدا بخشے! ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں	عبداللہ زکریا	۲۸۷
مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے ملاقات	صفی الرحمٰن نبیل	۲۹۰

ماثورات

مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے ایک انٹرویو	عمران احمد اصلاحی	۲۹۵
پیغام	مولانا عبدالحسیب اصلاحی	۳۰۹
استقبالیہ کلمات	مولانا عبدالحسیب اصلاحی	۳۱۲

منظومات

میرے استادِ محترم [مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی نذر]	سعید اختر اعظمی	۳۱۷
آہ! پیکرِ وفا کھو گیا	نصرت رضی فلاحی	۳۱۸
خوددار و باوقار تھے استادِ محترم	ضیاء الرحمٰن ضیاؔ فلاحی	۳۱۹

آپ کے خطوط

معروضات برائے جریدہ حیاتِ نو	عبدالرحیم قدوائی	۳۲۱

مقالہ نگاران

۱-ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

مدیر حیات نو، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ

۲-مولانا نظام الدین اصلاحی

استاد الاساتذہ، شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح

۳-پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی

سابق پروفیسر شعبۂ تاریخ اے ایم یو، مدیر معارف، ڈائرکٹر شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۴-پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

سابق مدیر تہذیب الاخلاق، پروفیسر شعبۂ عربی اے ایم یو علی گڑھ

۵-مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی

شارح فکرِ فراہی ومعروف اسلامی اسکالر

۶-مولانا محمد طاہر مدنی

ڈائرکٹر دعوہ وارشاد سینٹر جامعۃ الفلاح، جنرل سکریٹری علماء کونسل اعظم گڑھ

۷-مولانا محمد عمران فلاحی

سابق نائب صدر مدرس، جامعۃ الفلاح

۸-ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

سابق چیئرمین، پروفیسر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

۹-مولانا عبد البر اثری فلاحی

سابق ناظم اعلیٰ فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ممبئی ومؤسس القرآن اکیڈمی ممبئی

۱۰-مولانا انعام اللہ فلاحی

سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح وسابق صدر مدرس جامعہ مصباح العلوم

۱۱-مولانا محمد اسماعیل فلاحی

سابق شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح، مقیم حال علی گڑھ

۱۲-مولانا افتخار الحسن ندوی

استاذ ادب وشریعہ جامعۃ الفلاح

۱۳-پروفیسر محمد اسحاق فلاحی

سابق صدر شعبہ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز، جامعۃ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، وسابق ڈائیرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

۱۴-ڈاکٹر صباح الدین اعظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شارجہ، یواے ای

۱۵-ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، مدیر سہ ماہی مجلّہ 'الھند'

۱۶-مولانا محمد انس فلاحی مدنی

رفیق ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

۱۷-جناب زبیر احمد ملک فلاحی

سابق مدیر حیات نو، ادیب وسماجی کارکن، لکھنؤ

۱۸-مولانا محمد حسن حبیب فلاحی

صدر نیپال مساجد کونسل، ناظم جامعہ ضیاء العلوم نیپال

۱۹-ڈاکٹر غلام نبی فلاحی

ایڈوائزر منسٹری آف جسٹس، لندن

۲۰-مولانا عارف حسین فلاحی

استاذ تفسیر وادب، جامعۃ الاسلامیۃ، سنسری نیپال

۲۱-مولانا محمد ادریس جمیل فلاحی

ناظم جامعۃ الحسنات بھوکراہا، سنسری نیپال

۲۲-ڈاکٹر محی الدین غازی
مدیر زندگی نو، سکریٹری تصنیفی اکیڈمی مرکز جماعت اسلامی ہند نئی دہلی
۲۳-ڈاکٹر رضوان احمد رفیقی
اسسٹنٹ سکریٹری شعبۂ امور خارجہ جماعت اسلامی ہند و سابق صدر انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح
۲۴-ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی
مدیر سہ ماہی دعوت القرآن، لکھنؤ
۲۵-ڈاکٹر انعام اللہ اعظمی فلاحی
رکن شوریٰ جامعۃ الفلاح، مقیم حال ریاض، سعودی عرب
۲۶-جناب نعمان بدر فلاحی
ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
۲۷-ڈاکٹر ابن العلم فلاحی
معاشی صلاح کار، ادراک انٹرنیشنل کمپنی
۲۸-مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری
سابق صدر انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح، مقیم حال دہلی
۲۹-محترمہ نصرت رضی
لائبریرین، جامعۃ البنات، جامعۃ الفلاح
۳۰-محترمہ راحلہ بنت عبدالحکیم
شاعرہ، اندھیری، ممبئی
۳۱-جناب ابوسالم یحییٰ فلاحی
علاء الدین پٹی، اعظم گڑھ
۳۲-مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی
معاون لائبریرین، مرکزی لائبریری جامعۃ الفلاح

۳۳-مولانا ظفر احمد اثری فلاحی

اسلامک دعوہ سینٹر، یوکے اسلامک مشن، برطانیہ

۳۴-محترمہ صفیہ عبدالحسیب

دختر نیک مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ، مقیم حال نوئیڈا

۳۵-جناب عبدالحکیم حاکم

لندن

۳۶-مولانا عمران احمد اصلاحی

دبئی، یواے ای

۳۷-جناب سعید اختر اعظمی

استاد، دارۃ السلام انٹرنیشنل دہلی پبلک اسکول، ریاض سعودی عرب

۳۸-ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن ضیا مدنی فلاحی

استاذ الجامعہ الاسلامیہ شانتا پورم کیرلہ

۳۹-پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

پروفیسر شعبہ انگریزی، ڈائرکٹر خلیق احمد نظامی، مرکز برائے علوم القرآن ڈائیرکٹر UGC HRDC اے ایم یو علی گڑھ

۴۰-جناب صفی الرحمٰن نبیل

طالب علم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۴۱-جناب عبداللہ زکریا

علاء الدین پٹی، مقیم حال ممبئی

۴۲-جناب محمد انس

طالب علم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

JAMIATUL FALAH
P.O. Bilariaganj, Distt. Azamgarh-276121(U.P.) INDIA

جامعۃ الفلاح
بلریاگنج، اعظم گڑھ، ۲۷۶۱۲۱ (یو.پی) الهند

Ref. ....
Date ....

الرقم ۸۸۳۶/۲۰
التاریخ ۱۲/جولائی ۲۰۲۰ء

برادر مکرم جناب ضیاء الدین ملک فلاحی صاحب (مدیر جریدہ حیات نو)　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ جان کر بے حد خوشی اور اطمینان بھی ہوا کہ ''حیات نو'' کا خاص نمبر استاد محترم، مربی، مشفق اور فنافی الفلاح حضرت مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی حیات وخدمات پر مشتمل ہوگا۔

علمی وتحریکی حلقوں میں مولاناؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے بلکہ عوام میں بھی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ بلاشبہ مولاناؒ کے قابل قدر کارناموں کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ ان کی تحریکی، تعلیمی اور دعوتی خدمات اور ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیات واوصاف سے موجودہ اور آنے والی نسلوں کو واقف کرایا جائے تاکہ وہ اپنی اپنی زندگی میں اس سے روشنی حاصل کرسکیں۔

مولاناؒ سے میری جو قربت ومناسبت رہی ہے اور جو احسانات رہے ہیں اس کا حتمی تقاضا تھا کہ میں کچھ لکھتا اور میں نے بارہا لکھنے کی کوشش بھی کی لیکن قلم نے ساتھ نہیں دیا۔

استاد محترم نے جس طرح جامعہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا وہ مثالی تھا۔ اس وقت جو جامعہ ''اصلها ثابت وفرعها في السماء'' کی مثال ہے آپ کی جیسی ہستی ہی کی شب وروز جدوجہد اور انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے۔

مولاناؒ نے ہم بچوں کی صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت بھی کی۔ زبان وبیان، آداب وسلیقہ مندی پر بھی خصوصی توجہ دی، انہوں نے ہم طلبہ کے گھریلو حالات سے واقفیت کی روشنی میں ایک بزرگ باپ کی طرح جو تربیت ورہنمائی کی وہ ہم اساتذہ کے لئے قابل تقلید ہے۔

یوں تو ایک سے ایک استاد آئے اور انہوں نے اپنے علم واخلاق سے ہمیں استفادہ کا موقع دیا لیکن خود میری زندگی میں جن دو اساتذہ نے انمٹ نقوش چھوڑے ان میں سے ایک مولاناؒ کی ذات تھی، مولانا ہمارے لیے "أب بعد أب" کے صحیح مصداق تھے۔

مجھے امید ہے کہ یہ نمبر ایک جامع دستاویز کا حامل ہوگا، جو ہمیں اپنی تاریخ کو یاد رکھنے اور اسکی روشنی میں اپنا کردار ادا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ مادر علمی کو ایسے مخلصین ملتے رہیں جو اس چمن کو بنانے، سنوارنے اور سدابہار رکھنے اور بام عروج پر پہونچا کر بارآور اور مثمر بنانے میں تن من دھن سے لگے رہیں۔ آمین!　　خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

والسلام

۲۰۲۰/۷/۱۴

رحمت اللہ اثری فلاحی (خادم جامعہ)

Web:- www.jamiatulfalah.org, Email:- jamiatulfalah1962@gmail.com
Contacts:- Nizamat-9415985742, Taleemat-9651046619, P.R.O.- 9452203788, Girl's Sec.-7843850399

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Anjuman Talaba-e-Qadeem
Jamiatul Falah

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

Ref No. ۲/۱۴۰۶/۳م

Date ۰۹/۰۷/۲۰۲۰ء

پیغام

بسم الله الرحمن الرحيم. وبه نستعين والصلاة والسلام على رسوله الكريم اما بعد!

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان 'حیاتِ نو' استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحسیب اصلاحی۔رحمۃ اللہ علیہ۔ کی وفات کے موقع پر ایک خصوصی شمارہ ان کی حیات وخدمات پر شائع کر رہا ہے۔ یہ ابنائے قدیم کی طرف سے مادرِ علمی کے ایک مخلص سپہ سالار کی خدمت میں ادنیٰ سی خراجِ عقیدت ہے۔

نصف صدی سے زائد کا عرصہ حضرت مولانا نے جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی میں صرف کیا۔ وہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ جامعۃ الفلاح کے لیے یکسو تھے۔ قلب وذہن، حرکت وعمل، ذکر وفکر غرض یہ کہ مولانا کا سب کچھ جامعۃ الفلاح کے لیے تھا۔ جامعۃ الفلاح کے در ودیوار سے ان کو یک گونہ محبت تھی، اور آخر ایسا کیوں نہ ہو؟ مولانا نے یہاں پر اپنی زندگی کے قیمتی ایام لگائے تھے اور اس چمن کی آب یاری اپنے خونِ جگر سے کی تھی۔

انتظامی امور ہوں یا تعلیمی وتدریسی ذمہ داریاں، مولانا نے کبھی بھی معذرت کا سہارا نہیں لیا اور جو بھی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی، بہت ہی احسن طریقے سے انجام دیا اور اس راستے میں سرد وگرم کا بڑی جانفشانی سے مقابلہ کیا۔

مولانا بڑی دل نواز شخصیت کے مالک تھے۔ کیا بڑا کیا چھوٹا، ہر ایک سے ان کا رشتہ بڑی اپنائیت کا تھا۔ جامعۃ الفلاح میں مختلف ذمہ داریوں پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ کے تعلقات جامعہ کے ہر فرد سے تھے۔ ذمے دارانِ جامعہ ہوں یا اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز ہوں یا کارکنان جامعہ، ہر کوئی مولانا کی اس دل نوازی کا قائل ہے۔

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح سے بھی آپ کو والہانہ لگاؤ تھا اور انہیں مادرِ علمی کے لیے انجمن سے بڑی توقعات تھیں۔ جب بھی انجمن نے مولانا کو زحمت دی، اپنی کبرسنی وضعف کے باوجود فارغین جامعہ کی حوصلہ افزائی کے لیے حاضر رہے۔ جزاه الله عنا خير الجزاء

اصل خراجِ عقیدت تو یہ ہوگا کہ فارغین جامعہ وطلبۂ جامعہ بھی اسی مشن کو حرزِ جاں بنالیں، جس پر مولانا تا حیات قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ استاذِ محترم کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور جنت میں انبیاء، صدقین وشہداء کی معیت حاصل ہو۔

مشرف حسین صدیقی
صدر، انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح

فکر اسلامی کی تشریح وتنفیذ میں

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا حصہ

فکر اسلامی کے جن ممتاز اساطین کا مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ اور اثر ہے، ان میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ (م ۱۹۳۰) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) کے علمی، فکری اور تحقیقی رجحانات واکتسابات کو نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح میں قرآن مجید کی تدریس و تفسیر کا منفرد و بے مثال انداز اور جماعت اسلامی کے علمی وفکری سرمائے نے مولاناؒ کو صلاحیت وصالحیت سے ہم کنار کیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان دو گوہر نایاب کی خدمات کو راقم 'فکر اسلامی' کہہ کر زیادہ شرح صدر محسوس کرتا ہے اور نہاں خانۂ دل میں مستور 'عصبیت' سے اسے گلوخلاصی بھی نظر آتی ہے۔

فکرِ اسلامی اپنے تصور، منہج اسلوب اور طریقۂ کار کے ساتھ مخدومی استاذ گرامی کے ذریعہ ۱۹۶۱ء میں جامعۃ الفلاح اور اطراف جامعہ میں تشریح، تنفیذ اور تعمیر وترقی کے مراحل سے گزرتی رہی اور کم وبیش ۶۵ سالوں تک اپنے مخصوص مزاج اور منفرد انداز میں یہ خدمت انجام دیتی رہی۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 'نظریۂ فکر اسلامی' کے ساتھ اس کی تعریف کرنے والوں نے زیادتیاں کی ہیں اور اس خلط مبحث کے نتیجے میں اسلام کی ہر تشریح وتعبیر اور تحقیق وتدوین کو فکر اسلامی مان لیا گیا ہے۔ فکر اسلامی کے عناصر اور اساسیات کی روشنی ہی میں اسلامی مفکرین کی شناخت ونشان دہی کی جانی چاہیے۔ ایک زیادتی یہ کی گئی کہ فرد کی 'تحریر' کے ذریعے فکر اسلامی کی تفصیلات طے کی گئیں۔ حالانکہ فکر اسلامی کی تعبیر، تشریح اور تشکیل کے لیے 'تحریر' کے ساتھ فرد کی تقریر، درس، موعظت، قافیہ آرائی، تشبیہات، امثال وحکم، اخلاقیات کی پیکری وہم نشینی، فرد واجتماع کے مصالح کی رعایت، الغرض فرد کی پوری شخصیت کو فکر اسلامی کی تعریف اور تعمیر وترقی کے لیے معاون تصور کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہوجاتا ہے تو فکر اسلامی کے شارحین و خادمین کی ایک کثیر تعداد کو فکرِ اسلامی کی خدمت کا شرف حاصل ہوجائے گا اور مفکرین اسلام کے دوش بدوش شارحین فکر اسلامی کا قابلِ ذکر گلدستہ تیار ہوجائے گا۔ راقم مولاناؒ کی تحریر وتقریر، پند ونصائح، امثال وحکم، بے نفسی وانکساری اور انتظامی

صلاحیت کوفکر اسلامی کی تشریح وتنفیذ کا اہم حصہ تصور کرتا ہے۔ غالبًا مولاناؒ کی اسی خدمت کوخراج تحسین پیش کرتے ہوئے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

''بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ کسی علمی ادارہ کی علمی اساس، دراصل اس کے مقاصد، نصاب تعلیم اور منہاج تدریس ہوتے ہیں۔ جامعہ کے مقاصد کے تعین اور نصاب کی صورت گری میں بھی ان کا پورا حصہ رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ ان میں بھی برابر شریک رہے۔ مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے جامعہ میں نصابِ تعلیم، منہاجِ تدریس اور اندازِ تربیت کے تعین اور عمل آوری میں وہ شریک وسہیم رہے۔ چنانچہ جامعہ میں مجموعی طور پر جو علمی فضا بنی اور تعلیم وتربیت کا جو انداز و معیار قائم ہوا جس کے لیے وہ دور ونزدیک جانا جاتا ہے، اس کی تعمیر وترقی میں ان کا جو کردار رہا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔'' (مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کچھ یادیں)

حیاتِ نو کے اس خاص نمبر میں بنیادی طور پر تاریخ کے اسی حصے کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ مولانا کی شخصیت کی تشکیل سے ان کے علمی وعملی عطایا تک کا طویل سفر فکر اسلامی کی خدمت سے شاد وآباد ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ چار درجن اصحابِ علم وتحقیق نے مولاناؒ کی خاکہ نگاری میں شرکت کی ہے اور اس طرح یہ مولاناؒ کی سوانح پر ایک دستاویز ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ بلاشبہ سوانح نگاری میں جہاں شخصیات کے حسنات کو گل ہائے عقیدت پیش کی جاتی ہے وہیں انسانوں کے مستقبل کو یک طرفہ رد وطرفہ انسانی لغزشوں سے مامون ومحفوظ رکھنے کی خاطر باریک چھلنی کے ذریعہ جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ تنقید واحتساب کی یہ تہذیبی روایت مغربی سوانح نگاروں کے یہاں ایک لازمی قدر تسلیم کی جاتی ہے اور ناقد محض 'ناقل' کے مقابلے میں تحسین وآفریں کا مستحق قرار پاتا ہے، لیکن بدقسمتی سے مشرقی سوانحی ادب میں تنقید واحتساب کو تنقیص پر محمول کیا جاتا ہے اور بے چارہ تجزیہ نگار عتاب وغضب کا شکار بنا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی خاکہ نگار اپنے ممدوح کو مقام ولایت تک پہنچانے میں قلم کو ناحق پریشان کرتا چلا جاتا ہے۔

تاہم بیسویں صدی میں حیات جاوید کے مصنف الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴) اور حیات شبلی کے جامع مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳) نے ایک طرف اپنے ممدوح کی اعلیٰ خدمات اور فضائل کا اعتراف کیا، وہیں بعض بشری کمزوریوں اور علمی وتعبیری فروگزاشتوں کے حوالے بھی ریکارڈ کرائے ہیں۔ حیاتِ نو کے اس خاص نمبر میں اگرچہ احتساب وجائزے کی قدر موجود ہے لیکن بعض مقالات یک طرفہ اور غلو کا شکار ہو گئے ہیں۔

راقم نے طے کیا تھا کہ اس دستاویزی نمبر میں کسی متنازع قضیے کو جگہ نہیں دے گا، لیکن پھر اسے اس اقدام میں تاریخ کے ساتھ زیادتی نظر آئی۔ مشاجرات صحابہ کی الم ناک انسانی اور فطری داستان کی مستند مؤرخین کے یہاں موجودگی نے راقم کو شرح صدر عطا کیا۔ چنانچہ اس نے اس مجموعے میں بعض مکررات کو حذف کرنے کے سوا ہر قسم کے تصرف سے احتراز کیا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ تلخ وشیریں کے مجموعے کا نام ہی تاریخ ہے اور تاریخ کو من وعن پیش کر کے 'خذما صفا و دع ما کدر' پر عمل کرنا، تابناک مستقبل کا تقاضا بھی ہے!

اس نمبر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد شارحین فکر اسلامی نے مولاناؒ کے تعلق سے قیمتی خیالات وتاثرات اور اثرات کے نمایاں خد وخال کی وضاحت کی ہے۔ مولانا نظام الدین اصلاحی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر عنایت اللہ سبحانی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، مولانا ظفر اثری فلاحی، پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی، پروفیسر محمد اسحٰق، مولانا محمد طاہر مدنی، مولانا محمد عمران فلاحی اور ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی کے علاوہ شاگردوں کی ایک کہکشاں نے مولانا کی مقصدیت، ان کی عصریت، معروضیت اور ادبیت پر بیش قیمت مقالات تحریر کیے ہیں۔ ان کی برجستہ قافیہ آرائی، شاہ کار ترجمہ نگاری، امثال وحکم اور تمثیلات کی فراوانی کی داستان سنائی ہے۔ تیسری جانب تاریخ جامعہ اور اطراف جامعہ میں تاریخ جماعت اسلامی کے واقعات قلم بند کیے ہیں اور اس طرح ان تمام مشارکین نے فکر اسلامی کی تشریح وتعبیر کے کینوس کو توسیع بخشا ہے۔ صفحات کی تنگی کے باعث صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ استاذ الاساتذہ مولانا نظام الدین اصلاحی مدظلہ العالی نے ۱۳؍۳؍۱۹۶۱ء (تاریخ اخراج اساتذہ مدرسۃ الاصلاح) تا حال کی تعلیمی وتحریکی تاریخ کی نقشہ گری کرتے ہوئے شواہد کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ جامعۃ الفلاح سے قبل شہر اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی کے زیر انتظام ایک دارالعلوم کی تشکیل کی تجویز 'خود انھوں' نے جماعت کے اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۸ تا ۲۳؍اپریل ۱۹۶۱ء میں پیش کی تھی۔ جس کا مفصل ریکارڈ روداد مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند حصہ اول، ص ۲۰۱ پر 'جامعۃ الرشاد' کے نام سے موجود ہے۔ (رفیق عشق ووفا۔ عبدالحسیب اصلاحیؒ)

۲۔ علامہ فراہیؒ کی قرآنی خدمات کو عرب دنیا میں متعارف کروانے والی شخصیت مولانا عنایت اللہ سبحانی حفظہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا اصلاحیؒ کو قرآن مجید کی تدریس سے ایک عشق تھا لیکن ان کی خواہش پر مولاناؒ نے فرمایا: مجھے خوشی ہے کہ آپ قرآن پاک پر تیاری کرنی چاہتے ہیں اس لیے میری طرف سے ہر طرح کا تعاون آپ کو حاصل رہے گا۔'' انھوں نے نہایت خوشی سے درجہ عربی سوم کا قرآن پاک ہمیں پڑھانے کے

لیے دے دیا۔ مولانا سبحانی اس مقام پر ریکارڈ کراتے ہیں:

''یہ میری زندگی کا تاریخی لمحہ تھا، یہیں سے میرے علمی سفر کا رخ متعین ہوگیا اور میں ہمہ تن قرآن پاک پر غور و تحقیق اور کلام الٰہی پر ریسرچ کے لیے یک سو ہوگیا اور پھر ہمیشہ کے لیے میری زندگی کا محور اور میرے غور و فکر کا مرکز قرآن پاک بن گیا۔'' (مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کا خصوصی طور پر ممنون ہوں جنھوں نے احقر کی خواہش پر اپنا وقیع مقالہ ہمیں عطا کیا اور مولاناؒ کے عربی زبان وادب، نیز ان کی ترجمہ نگاری کے اسلوب پر روشنی ڈالی۔ ناسپاسی ہوگی اگر برادر عزیز ومحترم مولانا ظفر احمد اثری فلاحی کے جامع مقالہ پر ان کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ درحقیقت مولانا اثری نے اپنے محبوب استاذ کی گوناگوں خدمات کا احاطہ کرکے ان کی تشکیل کے عناصر ترکیبی کو تلاش کیا ہے۔ انھوں نے جامعۃ الفلاح اور تحریک اسلامی کے روحانی ومادی رشتوں کی وضاحت کی ہے اور جامعۃ الفلاح کے معنوی عناصر کی تشکیل میں متعدد فاضل ومدبر اساتذہ کی شان وبرہان کو سلام پیش کرکے تاریخ جامعۃ الفلاح کے لیے مفید معلومات کو جمع کر دیا ہے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر راقم اس تاریخی واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے کہ والد گرامی ماسٹر/مولانا خلیل الرحمان صاحب (۱۹۲۵۔۲۰۱۲) نے اپنے قیام مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (۱۹۴۷۔۱۹۵۸) میں انگریزی کے استاد کی حیثیت میں جن اصلاحی نگینوں کو انگریزی زبان وادب کی تعلیم دی اور اس ذریعۂ علم سے جنھوں نے مشرقی ومغربی ادب کا مطالعہ کیا، ان میں ایک نام نامی استاد گرامیؒ کا بھی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں راقم الحروف متعلم عربی چہارم نے مودودی ہاسٹل کے 'حجرہ حسیبی' میں استاذ وشاگرد کی ملاقات کو نہایت عبرت کی نگاہ سے دیکھا۔ مولاناؒ کی خاکسارانہ اور عاجزانہ تکریم وضیافت کے لمحات آج بھی اس کے لیے زادِراہ ہیں۔

امید ہے حیات نو کی یہ خاص اشاعت حضرت الاستاذ کے لیے ثواب جاریہ کا ذریعہ ثابت ہوگی اور جامعۃ الفلاح کے ارباب حل وعقد کو حال کا جائزہ لے کر مستقبل کی تعمیر کرنے میں معاون ہوگی۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس خصوصی اشاعت پر اپنے تبصروں اور تجزیوں سے نوازیں۔ وماتوفیقی الاباللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۱۵/ذی قعدہ ۱۴۴۱/ ۷/جولائی ۲۰۲۰ء

حیات
تأثرات
خدمات

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ایک نظر میں

محمد انس فلاحی مدنی

نام: محمد عبدالحسیب

والد کا نام: محمد عثمان

تاریخ پیدائش: ۱۳؍اگست ۱۹۲۸ء۔ بعض جگہ ۲۰؍اگست ۱۹۲۸ء درج ہے۔

وطن: علاؤالدین پٹی، اعظم گڑھ

تعلیم: ابتدائی تعلیم اپنے والد کے قائم کردہ مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد بلریا گنج کے مکتب میں تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) میں ۱۹؍نومبر ۱۹۴۰ء کو داخلہ لیا اور ۱۹۵۰ء میں فراغت ہوئی۔

تدریسی اسفار:

☆ **مدرسۃ الاصلاح:** ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء تقریباً چھ سال تدریسی فرائض انجام دیے۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں مدرسۃ الاصلاح کی انتظامیہ نے جماعت اسلامی کے دیگر ارکان کے ساتھ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو رخصت کر دیا۔

☆ **جامعۃ الرشاد:** ۱۹۶۲ء۔۱۹۶۳ء تقریباً دو سال تدریسی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

☆ **جامعۃ الفلاح سے وابستگی:** جنوری ۱۹۶۴ء کو وابستہ ہوئے، ۲۹؍جون ۱۹۶۴ء کو انتظامیہ کے ممبر منتخب ہوئے۔

صدر مدرس: مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا دور صدارت چار ادوار پر مشتمل ہے۔ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں صدر منتخب ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۷۱ء۔۱۹۷۳ء، تیسری بار ۱۴؍اکتوبر ۱۹۷۷ء تا ۲۴؍جنوری ۱۹۷۸ء اور چوتھی بار

۱۹۸۱ء میں صدر مدرس منتخب ہوئے۔ بعض وجوہ کی بنا پر نومبر ۱۹۸۹ء میں مستعفی ہوگئے۔

مہتمم تعلیم وتربیت: ۱۹۹۶ء تا ۱۹۹۸ء

ناظم: ۱۷؍ نومبر ۱۹۸۱ء تا ۱۸؍اپریل ۱۹۸۲ء

جامعۃ الفلاح سے رخصت: تقریباً چالیس (۴۰) سال خدمت کرنے کے بعد ۲۰۰۴ء میں ضابطہ ریٹائر منٹ کے تحت سبک دوش کردیے گئے۔

بندول میں تدریس: مدرسۃ البنات نسواں میں جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد تقریباً بارہ سال شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔

تحریک اسلامی سے وابستگی: ۱۹۴۹ء میں انھیں جماعت اسلامی ہند کا رکن منتخب کیا گیا اور وہ تاعمر جماعت سے وابستہ رہے۔

ترجمہ وتالیف:

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے باقاعدہ تصنیفی کام تو نہیں کیا۔ البتہ آپ کے بعض مقالات ومضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ تعلیقات قرآنیہ، اردو زبان میں سہ ماہی مجلّہ 'دعوت القرآن' (لکھنؤ) میں شائع ہوئیں۔

عربی زبان وادب سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ پہلا عربی مقالہ '**حکمة السعی والرمی فی الحج**' ۱۹۶۱ء میں '**صحیفہ قریش اسبوعیہ**' کے حج نمبر میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اردو سے عربی ترجمہ 'المجتمع' (کویت)، 'الدعوۃ' (دہلی)، 'صحیفۃ مکہ المکرّمۃ' (مکۃ المکرّمۃ) میں شائع ہوئے۔ عربی سے اردو ترجمے 'دعوت' (دہلی) اور 'ایشیا'، لاہور میں شائع ہوئے۔ ان تراجم کے ساتھ آپ نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی چند اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ اس ترجمہ کی اجازت مولانا امین احسن اصلاحی نے انھیں خود دی تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ آپ کی عربی زبان وادب سے شغف، دسترس اور مہارت سے واقف تھے۔ اسی وجہ سے اپنی کتابوں کے ترجمے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی کتابوں کے تراجم حسب ذیل ہیں:۔

'**احکام الحجاب فی القرآن**' یہ پہلے مطبعۃ الکوثر سے، پھر ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

'**الدعوة الاسلامیه و منهاجها**' یہ 'دعوت دین اور اس کا طریقہ کار' کا عربی ترجمہ ہے۔ ۲۰۱۸ء میں ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

'**حقیقة الشرک**'، زیر طبع ہے۔ 'حقیقت شرک' کا ترجمہ ہے۔

اس کے علاوہ مولانا سید عروج احمد قادری کی کتاب '**التفسیر الحقیقی للا سلام**' کو عربی میں منتقل کیا تھا۔

سفر حج: ۱۹۶۱ء

تاریخ وفات: ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء

اساتذہ: منشی محمد کاملؒ، مولانا قمر الزماں، مولانا شمیم احمد، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ، مولانا مشتاق احمدؒ، مولانا صدر الدین اصلاحیؒ اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے بہ طور خاص کسب فیض کیا۔

مشہور تلامذہ: پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، مولانا محمد عمران فلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی، مولانا ظفر احمد اثری فلاحی، مولانا صباح الدین ملک فلاحی، پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی، پروفیسر توقیر عالم فلاحی، پروفیسر فیضان احمد فلاحی، پروفیسر غفران احمد فلاحی، پروفیسر ملک وسیم احمد فلاحی، ڈاکٹر محی الدین غازی وغیرہ کے علاوہ متعدد اور بے شمار ہیں۔ البتہ سب کا نام لکھنا مشکل ہے۔

وہ شخصیات جن سے آپ متاثر ہوئے: مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ۔

اولاد: پانچ بیٹیاں، دو کا انتقال مولانا کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ ایک بیٹا پیدا ہوا جو معذور ہے۔ مولانا ساری زندگی اس کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے رہے۔

رفیق عشق ووفا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی

مولانا نظام الدین اصلاحی

مولانا عبدالحسیب صاحب سے میرا تعلق طالب علمی کے زمانے سے رہا ہے۔ طالب علمی کا دس سالہ دور اور تدریسی زندگی کا بیالیس سالہ دور شامل کرلیا جائے تو نصف صدی سے زائد کا عرصہ بنتا ہے، جس میں ہم دونوں ایک ساتھ رہے۔ میرا خیال ہے کہ مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ میں یہ اعزاز ہمیں دونوں کو حاصل ہے کہ اتنا لمبا عرصہ باہمی صحبت کا ملا۔ آزاد ہندوستان میں جماعت اسلامی ہند کا پہلا مرکز مدرسۃ الاصلاح بنا اور مدرسۃ الاصلاح کے ایک استاذ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اس کے امیر۔ اس کارواں میں ہم دونوں شامل ہوگئے اور خدمات انجام دینے لگے۔ یہ دورانیہ بھی کئی عشروں پر محیط ہے۔

میرا داخلہ مدرسۃ الاصلاح میں ۱۹۳۹ء میں پرائمری کے درجہ چہارم میں ہوا۔ میرے داخلہ کے محرک میرے استاذ اور رشتے کے بھائی مولانا ابواللیث صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند تھے۔ میرے داخلہ کے دوسال بعد مولانا عبدالحسیب صاحب مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے دوسال پیچھے رہے۔ مولانا صغیراحسن اصلاحی (مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے والد) مجھ سے ایک درجہ پیچھے تھے۔ میں ۱۹۴۸ء میں فارغ ہوا۔ میرے لیے تخصّص فی القرآن کا شعبہ قائم کیا گیا۔ یہ ایک سالہ کورس میں نے مکمل کیا۔ مدرسہ کی طرف سے مجھے اسکالرشپ جاری کی گئی۔ یہ کورس مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ میں نہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے کھولا گیا تھا اور نہ میرے بعد اب تک کسی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ فراغت کے بعد مولانا اختر احسن صاحب نے مجھے اعلیٰ درجات میں استاذ مقرر کردیا۔ محلّہ کوٹ علی گڑھ میں ایک ابتدائی درس گاہ جو جماعت اسلامی کے زیرنگرانی قائم تھی۔ مولانا عبدالحسیب صاحب فراغت کے بعد اس درس گاہ میں تدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ یہاں آپ کب تک رہے میں اس سے ناواقف ہوں۔ چند سالوں کے بعد ہی مولانا مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت مدرس تشریف لائے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ مولانا کا تقرر

مدرسۃ الاصلاح میں کب ہوا۔میرا اور مولانا کا تدریسی ساتھ رہا،سوائے اس کے کہ میں دس سال مدھیہ پردیش میں اور پانچ سال گجرات میں امیر حلقہ کی حیثیت سے متعین رہا۔اس کے علاوہ ہم دونوں اصلاح اور فلاح دونوں جگہوں پر ایک ساتھ رہے۔

مدرسۃ الاصلاح کی ایک صدسالہ تاریخ میں مولانا کی ایک انفرادی خصوصیت،جس سے میں واقف ہوا یہ ہے کہ وہ عربی لکھنے پر قادر تھے اوران کو اپنی عربی نویسی پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ان کی شاہ کار کتاب ''دعوت دین اوراس کا طریقۂ کار'' کے عربی ترجمہ کی باقاعدہ اجازت لی اور انھوں نے بخوشی اس کی اجازت دے دی۔پاکستان قائم ہونے کے بعد حکومتی سرپرستی میں ایسے ادارے قائم ہونے لگے جو عورتوں کی آزادی اور ملک میں ثقافتی تبدیلی کے علم بردار تھے۔مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کے خلاف دو کتابیں تحریر فرمائیں:''پاکستانی عورت دوراہے پر'' اور'' قرآن میں پردہ کے احکام''۔ ان کتابوں کی بڑی پزیرائی ہوئی اور اکابرین حکومت اور مغربی تہذیب کے علم برداروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ان کتابوں کی افادیت کے پیش نظر مصنف کی خواہش تھی کہ ان کو عربی میں منتقل کیا جائے۔مولانا عبدالحسیب صاحب نے'' قرآن میں پردہ کے احکام'' کا عمدہ ترجمہ کیا۔یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی۔(مجلّہ علوم القرآن ششماہی علی گڑھ کا خصوصی نمبر مولانا امین احسن اصلاحی نمبر ص ۴۳۷)

''دعوت دین اوراس کا طریقہ کار'' کا عربی ترجمہ حال ہی میں ہدایت پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا ہے۔ اصلاحیوں میں کسی کے اندر میں نے عربی کی یہ صلاحیت نہیں پائی۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ کچھ اصلاحی حضرات عرب ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے گئے ہوں یا تدریسی سروس میں رہے ہوں وہ اتنی صلاحیت رکھتے ہو کہ اردو کتابوں کو عربی میں منتقل کرسکیں، میں ان کو سامنے نہیں رکھتا کیوں کہ یہ بہت بڑا کمال نہیں ہے۔صلاحیت کا کمال تو وہ تھا جو مولانا کے اندر تھا کہ وہ اپنی زندگی میں فریضۂ حج (جامعۃ الفلاح کے کاموں) کے سوا عرب ملکوں میں کبھی نہیں گئے۔اعظم گڑھ جیسی جگہ پر رہ کر اتنی صلاحیت پیدا کرپانا ایک غیر معمولی بات ہے لیکن مولانا کی یہ صلاحیت ترقی نہ کرسکی کہ **تجری الریاح بمالا تشتھی السفن**۔

مولانا کو اللہ نے بیٹیوں سے نوازا تھا۔آخر عمر میں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی،مگر وہ پیدائشی مفلوج تھا۔ اس کے علاج میں مولانا کی پوری زندگی گزر گئی۔علمی ارتقا ایسے حالات میں کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ تدریسی خدمت کے معمولی معاوضہ کے ذریعہ اتنا مہنگا علاج اور وہ بھی تاحیات بہت مشکل ہے

۔ہوائیں اللہ کے حکم کے برخلاف نہیں چلتی جس طرح اللہ تعالی مخالف ہوا چلا تا ہے ویسے ہی مواقف ہوائیں چلانے پر بھی قادر ہے۔معذور شخص کی شادی کا مرحلہ بھی بڑا پریشان کن ہوتا ہے۔مولانا نے بیٹے کی شادی بندول کردی لیکن معذوری کے سبب یہ رشتہ نہ چل سکا۔نکاح ثانی چاند پٹی میں ہوا۔اللہ کا کرم ہوا کہ معذوری بھی آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔اللہ نے اولاد سے بھی نوازا۔مولانا کو جوایک قلق تھا اللہ نے عمر کے آخری پڑاؤ میں پوتے اور پوتیاں دے کر دور کردیا۔سورۂ نحل میں اللہ نے بشارت سنائی ہے: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ۔(آیت:۷۲)مولانا کو مطلوبہ دولت اس وقت حاصل ہوئی جب زندگی کا سورج غروب کے قریب تھا۔جب انسان کوئی کام نہیں کرسکتا۔

ان کی زندگی میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر کسی سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس کی شکایت کسی سے نہیں کرتے۔جب ان کا اور ان کی پوری ٹیم کا مدرسۃ الاصلاح سے اخراج ہوا تو ان کو تکلیف ہوئی،مگر کبھی بھی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا۔اخراج نامہ کا خط جو ہم سب کو ملا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

تاریخ:۱۹۶۱/۳/۱۳

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدرسۃ الاصلاح کی مجلس منتظمہ منعقدہ ۱۸/شعبان ۱۳۸۰ ہجری کی تجویز کی روشنی میں منتخبہ کمیٹی نے مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم وتربیت کے مسئلہ پرغور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ اسٹاف کی موجودہ ہیئت ترکیبی میں مدرسہ کے تعلیمی وتربیتی مقاصد کے بروئے کار لانے کی اب کوئی توقع نہیں رہ گئی۔اس لیے آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ ۷/شوال ۱۳۸۰ ہجری سے مدرسہ مفوضہ تعلیمی خدمت سے سبک دوش کئے گئے۔

والسلام

بدرالدین اصلاحی

مذکورہ بالا تحریر مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب،مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی اور راقم الحروف نظام الدین اصلاحی کو بذریعہ ڈاک روانہ کی گئی تھی۔سبھی لوگوں کے یہاں سے یہ خط ضائع ہوگیا۔چونکہ اس خط کی ایک تاریخی حیثیت تھی لہٰذا میں نے اسے محفوظ کرلیا۔اب اس موقع سے پیش ہے۔موضع چھاؤں،اعظم

گڑھ کے مقبول صاحب مدرسہ میں منشی (کلرک) تھے۔کسی طرح کی نوٹس یا خطوط وغیرہ کے جواب وہی تحریر کرتے تھے۔اخراج نامہ کا خط لکھنے سے انھوں نے مولوی بدرالدین اصلاحی صاحب کے سامنے سختی سے انکار کردیا اور کہا کہ ''ایسا ظالمانہ خط میں اپنے قلم سے نہیں لکھ سکتا۔'' یہ بات سفر حج سے واپسی پر شاہ گنج میں ملاقات کے وقت منشی مقبول صاحب نے خود مولانا عبدالحسیب صاحب سے بیان کیا اور انھوں نے بتاریخ ۷/ مارچ ۲۰۱۵ء دوپہر بارہ بجے دن مودودی منزل کمرہ نمبر دس میں ملاقات کے وقت مجھ سے بتائی۔

مدرستہ الاصلاح سے سبک دوشی کے بعد مولانا حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ حج سے واپسی میں اعظم گڑھ بس ڈپو پر استقبال کے لیے مولانا ابواللیث صاحب اور مولانا مجیب اللہ ندوی موجود تھے۔اسی موقع سے مولانا مجیب اللہ صاحب نے مولانا سے وعدہ لے لیا کہ وہ شوال میں جامعۃ الرشاد میں تدریسی خدمات انجام دیں۔مولانا نے اسے منظور کرلیا۔شوال کے آنے میں چھ ماہ باقی تھے۔اس درمیانی وقفہ میں مولانا اپنے وطن میں مقیم رہے اور بلریا گنج کے ایک مکتب میں اعزازی خدمات انجام دیتے رہے۔یہ مدرسہ مسجد جامعۃ الفلاح سے متصل ایک سفالہ پوش کمرہ میں تھا، دیواریں کچی تھیں۔موضع ہنگائی پور کے مولوی ادریس صاحب ناظرہ، دینیات اور اردو پڑھاتے تھے۔ایک کمرہ اور ایک مدرس والے اس مکتب میں مولانا نے پڑھانا شروع کردیا اور جب شوال کا مہینہ آیا تو حسب وعدہ جامعۃ الرشاد چلے گئے۔

بلریا گنج کے معروف معالج حکیم محمد ایوب صاحب اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور چند دوسرے لوگوں نے مولانا کو روکنے کی بہت کوشش کی کہ مولانا بلریا گنج میں رہیں اور اسی مکتب کو ترقی دیں لیکن مولانا کو وعدہ ایفا کرنا تھا لہٰذا جامعۃ الرشاد کو ترجیح دی اور وہاں چلے گئے۔

جامعۃ الرشاد کے قیام کی ایک تاریخ ہے، جس سے کم لوگ واقف ہیں جب کہ یہ تحریر شدہ واقعہ ہے۔ مدرستہ الاصلاح سے اخراج کے بعد میری خواہش تھی کہ شہر اعظم گڑھ میں جماعت اسلامی ہند کے زیر نگرانی ایک دارالعلوم قائم کیا جائے۔میں نے اس تجویز کو اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۸/اپریل تا ۲۳/اپریل ۱۹۶۱ء کے سامنے پیش کیا۔مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی میں ایک قانون تھا جواب بھی ہے کہ شوریٰ کے اجلاس میں ارکان شوری کی تجاویز لازماً زیر غور آئیں گی اور غیر ارکان شوریٰ کی تجویز اسی وقت پیش ہوسکتی ہے، جب کوئی رکن شوریٰ اس پر دستخط کردے۔چوں کہ میں شوریٰ کا رکن تھا اس لیے میں نے جامعۃ الرشاد کے نام سے ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش کی۔شوریٰ نے یہ طے کیا کہ مجوزہ دارالعلوم کا پورا خاکہ اگلے اجلاس میں پیش

کرے۔ چنانچہ میں نے اس پر عمل کرتے ہوئے ۱۴/دسمبر تا ۱۸/دسمبر ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں پورا خاکہ پیش کردیا۔شوریٰ نے یہ فیصلہ دیا کہ جماعت اسلامی کوئی دارالعلوم قائم نہیں کرے گی۔البتہ اس کے ارکان ایسا دارالعلوم قائم کرنا چاہیں تو وہ آزاد ہیں۔ جماعت سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس فیصلہ سے ہم لوگ مطمئن ہوگئے اور یہ ادارہ قائم کردیا گیا۔اس کا ذکر ''رودادمجلس شوریٰ'' حصہ اول صفحہ ۲۰۱ پر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ: مجلس شوریٰ منعقدہ اپریل ۱۹۶۱ء میں ایک عربی دارالعلوم کے قیام کی تجویز زیر غور آئی تھی جس کے متعلق طے کیا گیا تھا کہ درس گاہ کی پوری اسکیم مع تفصیلات امیر حلقہ مشرقی یوپی اور مجوز سے معلوم کی جائے چنانچہ یہ اسکیم اب شوریٰ کے سامنے رکھی گئی اور طے کیا گیا کہ جماعت کی طرف سے جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی البتہ کچھ لوگ اپنے طور سے ایسی درس گاہ قائم کرنا چاہیں تو ان کو مرکز سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

جن لوگوں نے اس مدرسہ کو قائم کرنے میں تعاون دیا وہ جماعت اسلامی اعظم گڑھ کی کمیٹی کے ارکان تھے۔ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔مولانا حبیب اللہ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (امیر جماعت اسلامی اتر پردیش مشرق)

۲۔مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب (ناظم جماعت اسلامی ہند، ضلع اعظم گڑھ)

۳۔مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب امیر جماعت اسلامی ہند شہر اعظم گڑھ

۴۔راقم الحروف (نظام الدین اصلاحی) رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

مؤرخہ ۷/مارچ ۲۰۱۵ء دوپہر بارہ بجے دن میں جامعۃ الفلاح مولانا مودودی منزل کمرہ نمبر دس میں مولانا عبدالحسیب صاحب مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔اسی موقع سے جامعۃ الرشاد کا تذکرہ چھڑ گیا۔مولانا مرحوم نے اس موقع پر کچھ ابتدائی باتوں سے واقف کرایا۔مولانا نے فرمایا کہ حسب وعدہ میں شوال میں جامعۃ الرشاد چلا گیا۔درس وتدریس کا سلسلہ دفتری مسجد متصل تکیہ اعظم گڑھ میں شروع ہوا۔طلبہ کی رہائش کے لیے مسجد سے متصل مسافر خانہ کے پاس ایک مال گودام تھا۔اس میں پانچ چھ کمرے تھے۔ایک کمرہ میں میرا ابھی قیام رہا۔حمد اللہ فراہی اور اور سعد اللہ فراہی پڑھنے کے لیے یہیں آ گئے۔رحمت اللہ اثری فلاحی نے

اسی مدرسہ میں داخلہ لیا۔مولانا مرحوم نے کہا کہ مدرسۃ الاصلاح سے بھی کچھ طلبہ آ گئے۔مثلاً ڈاکٹر نیاز احمد چاند پٹی، ڈاکٹر ابرار احمد زمین رسول پور، درس گاہ اسلامی چتر پور سے کچھ طلبہ تعلیم کی غرض سے آ گئے۔طلبہ کی جب درجہ بندی کی گئی تو پہلے ہی سال عربی کے چار درجات کھل گئے۔معروف مفسر قرآن مولانا جلیل احسن ندویؒ کو تحریکی اساتذہ کے اخراج سے اتنا دکھ پہنچا کہ انھوں نے احتجاجاً استعفادے دیا اور درس گاہ اسلامی چتر پور چلے گئے اور پھر جامعۃ الرشاد آ گئے۔مولانا مجیب اللہ ندوی رکن جماعت تھے،شہر میں ان کا قیام تھا اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی میں مصروف کار تھے لہٰذا انہیں مدرسہ کا ناظم بنا دیا گیا۔دو سال تک جامعۃ الرشاد ارکان جماعت کے زیر اثر رہا۔اس کے بعد ناظم جامعۃ الرشاد کا رخ بدل گیا اور انھوں نے جماعت کی مخالفت شروع کر دی۔ ان حالات میں ارکان جماعت مایوس ہو گئے اور جامعۃ الرشاد سے تعلق ختم کر لیا۔ادھر بلریا گنج میں مکتب اسلامیہ کو ترقی دینے کے لیے مولانا شبیر احمد صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئیں،مکتب اسلامیہ کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا اور پھر جامعۃ الفلاح ہو گیا۔جامعۃ الفلاح کے محسنین کی کوششوں سے کئی نئے درجات قائم ہو گئے۔۱۹۶۴ء میں مولانا عبدالحسیب صاحب دوبارہ جامعۃ الفلاح تشریف لائے تو ان کے ساتھ آنے والے طلبہ کی بدولت عربی درجات درجہ چہارم تک قائم ہو گئے۔جامعۃ الفلاح کو ابتدا سے ہی جو علمی شخصیات میسر رہیں ان میں مولانا عبدالحسب صاحب کا خاص مقام ہے۔انتظامیہ کے ممبر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب ۲۹/جون ۱۹۶۴ء کو ہوا جو تا حیات جاری رہا۔آپ کو ۱۹۶۵ء میں صدر مدرس بنا دیا گیا اور یہ دورانیہ مختصر رہا۔دوبارہ آپ کو ۱۹۷۱ تا ۱۹۷۳ء ایک میقات کے لیے صدر مدرس منتخب کیا گیا۔تیسری بار ۱۴/اکتوبر ۱۹۷۷ء تا ۲۴/جنوری ۱۹۷۸ء صدر مدرس رہے۔ چوتھی بار ۱۹۸۱ء میں صدارت کے لیے منتخب کیا گیا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر آپ ۱۹۸۹ء میں مستعفی ہو گئے۔۱۹۹۶ء میں جامعہ کے دستور میں بعض تبدیلیاں کی گئیں اور مہتمم تعلیم تربیت کا منصب قائم ہوا۔نظر انتخاب ایک بار پھر مولانا پر پڑی لہٰذا جامعہ کا پہلا مہتمم تعلیم وتربیت آپ کو منتخب کیا گیا۔۱۹۹۶ تا ۱۹۹۹۸ آپ مہتمم رہے۔عارضی طور پر ۱۷/نومبر ۱۹۸۱ سے ۱۸/اپریل ۱۹۸۲ تک آپ ناظم بھی رہے۔

جماعت اسلامی ہند جامعۃ الفلاح یونٹ کے مقامی امیر کی بھی ذمے داریاں آپ کے کاندھوں پر رہی۔

مکتب اسلامیہ جو صرف ایک استاذ کی نگرانی میں چل رہا تھا اس نے اتنی ترقی کی کہ آج معلمین کی تعداد ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) اور طلبہ وطالبات کی تعداد چار ہزار سات سو سے زائد ہے۔جامعۃ الفلاح کی نگرانی میں

سنٹرل لائبریری کا قیام ایک اہم پیش رفت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔سینٹرل لائبریری کے کھلنے کے اوقات متعین ہیں۔ یہ لائبریری صبح آٹھ بجے سے کھل کر رات دس بجے بند ہوتی ہے۔درمیان میں نماز کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔اس کے کارکنان کی تعداد آٹھ ہے جن کی ڈیوٹی کا وقت متعین ہے۔استفادہ کرنے والے طلبہ کے علاوہ تحقیق کے لیے باہر سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں۔اس لائبریری کی مثال ضلع اعظم گڑھ کے کسی تعلیمی ادارے میں نہیں ہے۔

مولانا ابوالبقا ندوی صاحب کی نظامت کے زمانے میں مولانا عبدالحسیب صاحب کو ریٹائر کیا گیا تھا۔ ناظم جامعہ نے دوبارہ تقرر اور نئے مشاہرہ پر ان کا عندیہ لینا چاہا اور پیش کش کی کہ وہ کلیۃ البنات کی تدریس قبول کرلیں۔مولانا چاہتے تھے کہ انھیں حسب سابق طلبہ کی تدریس کی ذمہ داری دی جائے۔اس بات پر ارباب جامعہ تیار نہ ہوئے اور مولانا کا تدریسی تعلق جامعہ سے ختم ہوگیا۔اس فیصلہ سے مولانا کو دلی رنج پہنچا۔ انھوں نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ایک مطبوعہ پرچہ بھی عوام میں تقسیم کیا تاکہ دوبارہ طلبہ کی تدریس کے لیے ان کو موقع فراہم کیا جائے لیکن کامیابی نہ مل سکی۔مطبوعہ پرچے کی عبارت من وعن ہدرج ذیل ہے۔

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مظلوم ہیں ہم

دسمبر۱۹۶۳ء کے آخری ایام کی ایک شام تھی جب رفیق محترم حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم بلریا گنج کے دس پندرہ رفقاء کے ساتھ میرے گھر علاء الدین پٹی تشریف لائے اور جامعہ کی خدمت کرنے کی دعوت دی۔ اتنے خلوص ومحبت اور اتنے اصرار کے ساتھ دی تھی کہ اس سے انکار کا کوئی سوال نہ تھا۔میں جنوری ۱۹۶۴ء میں جامعہ آ گیا۔مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم تشریف لائے ۔ جامعہ کا نصاب بنا، درجہ بندی ہوئی اور ایک باقاعدہ نصاب تعلیم اور ایک نظام تعلیم وتربیت کے تحت نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ جامعہ کا تعلیمی سفر شروع ہوا۔اس وقت بلریا گنج میں ''آپ مدرسہ کے اور مدرسہ آپ کا'' کے الفاظ سب کی زبان پر تھے۔اس وقت ہم سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ جب آپ ساٹھ یا ستر سال کے ہوں گے تو ریٹائر کردیے جائیں گے۔نہ ہی کوئی ضابطہ ریٹائرمنٹ تھا اور نہ ہی کوئی قید وشرط لگائی گئی تھی۔میں نے اس دن سے اپنے آپ کو جامعہ کے لیے وقف کردیا۔رات دن ایک کر کے اس کی تعمیر وترقی میں لگا رہا۔اپنی جوانی اور زندگی کی ساری توانائی اس کی راہ میں قربان کردی اور اس دوران تعلیم قرآن کا اپنا دیرینہ ارمان پورا کرتا رہا اور یہی تمنا تھی کہ جامعہ سے مر کر ہی جدا ہوں گا۔جیسا کہ مولوی ادیس صاحب اور مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم نے کیا:''منهم من قضى نحبه و

منهم من ينتظر و ما بدلوا تبديلا‘‘لیکن نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے کہ مجھے جامعہ کی خدمت اور تعلیم قرآن کی سعادت سے محروم کردیا جائے گا’’**جزاء سنمار و ما کان ذا ذنب** ‘‘جب کہ ابھی میں صحت مند ہوں اور کسی جوان سے کم کام نہیں کرتا رہا ہوں۔جوان تو جب دیکھیے پابہ رکاب رہتے ہیں۔ ہم تو خاموشی سے اپنے تعلیمی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

حق تو یہ تھا کہ ہم اساسی اور بنیادی اساتذہ پر اس ضابطہ ریٹائرمنٹ کا اطلاق اور اس کا نفاذ نہ کیا جاتا جو ضابطہ جامعہ کے قیام کے ایک طویل عرصہ کے بعد کسی ضرورت کے پیش نظر بنایا گیا۔اس ضابطہ اور دفعہ کی زد میں وہ اساتذہ آئیں تو آئیں جو اس کے پاس ہونے کے بعد آئے اور جان کر اور مان کر ملازمت اختیار کی لیکن اگر کسی کو دونوں طرف کے اساتذہ پر اس کے نفاذ کے لیے اصرار ہے تو خود شوریٰ کے اس فیصلہ کے بعد جو چند سال پہلے ہوا تھا کہ ’’صحت مند افراد کو تاصحت اور تاقوت کار برسر کار رہنے دیا جائے‘‘ وہ دفع بے ضرر اور بے اثر ہو جاتی ہے۔اور دونوں طرح کے اساتذہ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود عاملہ نے یکم اکتوبر۲۰۰۴ء کے اجلاس میں اہم اساسی اور بنیادی سینئر اساتذہ کی سبک دوشی کا فیصلہ کر ڈالا،حالانکہ عاملہ کا کام شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنا ہے نہ کہ اس کو منسوخ کرنا ہے۔یہ فیصلہ بھی اختلافی تھا۔عہدے داران تو اس کے لیے مصر تھے جب کہ غیر عہدے دار ارکان (منشی محمد انور صاحب وغیرہ) کو اس سے شدید اختلاف تھا۔ فیصلہ کا انداز نرالا تھا۔مہتمم جامعہ دورۂ امریکہ سے آتے ہیں۔ایک دن بعد عاملہ کی نشست ہوتی ہے اور اس میں یہ فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ہمارے شعبہ (شعبۂ اعلیٰ عربی) کے ہیڈ کو مدعوخصوصی کی حیثیت میں نہ شریک نشست کیا گیا،اور نہ ان سے مشورہ کیا گیا بلکہ ان کو بالکل بے خبر رکھا گیا۔نہ ان کی رپورٹ کا لحاظ کیا گیا۔ (بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی کہ شعبہ کے ہیڈ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کی رپورٹ اچھی تھی) جب کہ دنیا کا یہ دستور ہے کہ ماتحت استاد کے بارے میں غور و فیصلہ کرتے وقت شعبہ کے ہیڈ سے مشورہ ضرور کیا جاتا ہے۔جب کہ ماضی قریب میں سالہا سال سے ناظم جامعہ (مولانا ابوالبقا ندوی) مولانا طاہر صاحب کو جو اس وقت شعبۂ عربی کے ہیڈ تھے،مہتمم نہ تھے۔شوریٰ کی نشستوں میں برابر پابندی سے مدعوخصوصی کی حیثیت سے بلاتے رہے۔جو اپنے زور بیان سے ناظم صاحب کی وکالت،مدافعت اور حمایت کرتے اور ہاؤس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے۔مدعوخصوصی کوئی کبھی بھی بنایا جاتا ہے نہ کہ بالالتزام اور بالاستمرار پابندی سے اور لگاتار نہیں۔

محترم شیخ الجامعہ کو جب اس فیصلہ کی کسی ذریعہ سے اطلاع ملی تو انھوں نے ناظم کو بذریعہ فیکس اس فیصلہ پر عمل درآمد سے روکا لیکن ذمہ داروں نے اسے نظر انداز کر دیا اور فیصلہ کو برقرار رکھا، حالانکہ ماضی میں عاملہ کے کتنے ہی فیصلہ بدل گئے ہیں۔اس پر عمل ہونے کے باوجود لوگ بحال کئے گئے ہیں لیکن اس بار اپنے فیصلے اور اس کے نفاذ پر اس درجہ اصرار کیا گیا اور ہمیں دوران تعلیم قرآن سے محروم کر کے نہایت تکلیف اور قلق میں مبتلا رکھا گیا۔اب شوری سے التماس ہے کہ وہ عاملہ کے اس غیر ضروری، غیر دستوری اور جامعہ کے لیے غیر مفید فیصلے کی توثیق نہ کر کے ہمیں انصاف دلائے اور ہمیں قرآن کی تعلیم دینے کا موقع فراہم کرے اور جامعہ کے مفاد کی حفاظت کرے۔

نیز جامعہ کے مفاد کے پیش نظر اب اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جب بھی دستور میں ترمیم کی مطلوبہ (تعداد) پوری ہو جائے اس ضابطہ ریٹائر منٹ میں ترمیم کر دی جائے اور اسے منسوخ کر دیا جائے کہ جامعہ کے دستور میں چاہے یہ ضابطہ لکھا ہو لیکن عملاً یہاں روز اول سے آج تک ہمیشہ ریٹائر افراد سے کام لیا جاتا رہا ہے اور آج بھی لیا جارہا ہے۔کیا ستم ہے کہ جو افراد خدمت غیر کر کے ریٹائر ہوں وہ تو یہاں کار آمد قرار پائیں اور گلے لگائے جائیں اور جو روز ازل سے اپنے اسی ادارے کی خدمت میں اپنی ساری توانائیاں نچوڑتے ہوئے ساٹھ ستر سال کے ہو جائیں تو انھیں لازماً ٹھکانے لگا دیا جائے۔چاہے وہ صحت مند ہوں، چاہے وہ قوت رکھتے ہوں۔ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے تمام عظیم اداروں دیو بند، ندوۃ العلماء، جامعہ سلفیہ اور دارالسلام عمرآباد کہیں بھی یہ ضابطہ نہیں ہے۔ہر جگہ بزرگ اساتذہ تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ تصنیف و تالیف ہو یا تعلیم و تدریس یہ چیزیں عمر کی پابند نہیں ہیں۔عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ علم میں پختگی اور علم و تجربہ میں رسوخ اور کمال پیدا ہوتا ہے اور ایسے افراد اداروں کے لیے مفید، سودمند اور باعث وقار و اعتبار ہوتے ہیں۔

عبدالحسیب

۲۰۰۵/۲/۲۶

مولانا عبدالحسیب صاحب جامعہ میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے اہل وطن کو پکار سکتے تھے لیکن انھوں نے جاہ و منصب کے لیے کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی رویہ کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔مولانا نے درس گاہ نسواں بندول کو اپنی خدمت پیش کر دی۔یہ مدرسہ مولانا کے گھر سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔پیدل چل کر

مدرسہ جاتے اور بچیوں کو پڑھا کر گھر واپس آجاتے ۔ چند سال کے بعد یہ مدرسہ بھی ختم ہوگیا۔عمر کا وہ حصہ بھی اب آ گیا تھا جہاں قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں ۔اعصاب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لہٰذا کسی مدرسہ کا رخ نہ کیا۔محلّہ کی مسجد میں نماز کے بعد درس قرآن کا جو سلسلہ برسوں پہلے قائم تھا جاری رہا۔

مولانا نے اپنی پوری توانائی جامعہ کے لیے وقف کردی تھی ۔آپ کی خدمات کا دورانیہ ۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۵ء تک محیط ہے ۔ مسلسل اکتالیس برس تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اور جامعہ کے ہر منصب پر فائز رہے ۔مولانا کے فیض یافتہ طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے لیکن ایک شکایت عام رہی کہ بہترین صلاحیت ہونے کے بعد بھی مولانا درجہ میں بچوں کو سوال کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے ۔سوال کرنے پر اگر کوئی طالب علم اصرار کرتا تو درجہ چھوڑ کر باہر نکل جانے کے بھی واقعات ہیں ۔ایک ذی علم معلم کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہوتی ۔

ایک اچھے فرد کے لیے جن خوبیوں کو شمار کیا جاتا ہے مولانا میں وہ تمام موجود تھیں ۔سادگی ،صبر وقناعت ، طلبہ کے ساتھ ہم دردی اور امانت و دیانت مولانا کی نمایاں خصوصیات تھیں ۔امیروں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ،ان کی ''چائے'' سے بڑا پرہیز کرتے ۔گھر سے جامعہ تک پیدل آنا اور عصر کے بعد واپس پیدل لوٹ جانا معمول کا حصہ تھا۔دوپہر کے لیے اپنا کھانا ساتھ لاتے ۔عصر کے وقت چائے معمول میں شامل تھی ۔طلبہ سے خدمت لینا نہایت برا مانتے تھے ۔ان کی خوبیوں کو جامعہ کے ذمہ داروں نے بھی محسوس کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے دور صدارت میں جامعہ کی ترقی کی رفتار کافی اچھی رہی۔اسی سے اس امر کی بھی نشان دہی ہوجاتی ہے کہ ہر کام کا ارتقا خلوص دل سے منسلک ہے ۔ ذرائع تو خلوص کے پابند ہوتے ہیں جو چاہے اس کا تجربہ کر لے۔ جامعہ کی عالی شان مسجد کی تعمیر میں مولانا کا کردار بہت اہم رہا۔کبھی کسی کی غیبت یا شکایت نہ کرتے تھے ۔مولانا کی مجلس میں کسی کی بھی غیبت نہیں سنی جا سکتی تھی ۔خود کئی بار آزمائشوں سے دوچار ہوئے لیکن کبھی حرف شکایت زباں سے ادا نہ ہوا۔سادگی اتنی تھی کہ طلبہ سے بھی معذرت کر لینے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے تھے ۔

شہرت اور نام ونمود سے بہت بچتے تھے ۔یہ بات ان کے مزاج میں اس قدر شامل ہوگئی تھی کہ اپنے علمی کاموں کو بھی چھپانے کی کوشش کرتے ۔آپ نے کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جو مقبول بھی ہوئی لیکن طلبہ کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے ۔ میں نے ان کے ساتھ طویل عرصہ کام کیا ہے ۔ میں ان کے مزاج سے خوب واقف ہوں ۔ ہر موقع پر چپ رہنا اور نہ بولنا ان کی شخصیت کا ایک بہت بڑا عیب تھا۔ مضامین

لکھنا، جلسوں میں تقریر کرنا اور کسی علمی بحث میں حصہ لینا ان کو پسند نہ تھا۔ وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ کہیں شہرت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ میں اسے مولانا کی شخصیت کا بہت بڑا عیب سمجھتا ہوں۔ اگر یہ بات عام ہو جائے تو کوئی بھی نہ کتاب لکھے نہ رسالہ جاری ہو نہ ترجمہ و تحقیق کا کام آگے بڑھے۔ دنیا اندھری ہو جائے گی۔ آدمی صرف اپنی نیت درست رکھنے کا پابند ہے۔ شہرت اور نام ونمود تو علمی کاموں پر ہونا عام بات ہے۔ ایک مسلمان کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ خوب محنت اور توجہ سے کام کرے۔ شہرت اور دکھاوا کا نقص نیت میں شامل نہ کرے۔ اللہ صرف نیتوں کو دیکھتا ہے۔

●●

وَهُوَ الَّـذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَیَنشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْد.

(الشوریٰ:۲۸)

’وہی اللہ ہے جو بارش اس وقت برسانے لگتا ہے جب کہ لوگ اس سے مایوس ہو جاتے ہیں، وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔ وہی سب کا سرپرست اور قابل تعریف ہے۔‘

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ۔ کچھ یادیں

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

نامور عالم اور مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کے ممتاز استاد مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء کو اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ان کے رخصت ہو جانے سے دکھ اور محرومی کا جو احساس ہوا اس کا اظہار مشکل ہے۔علم وتقویٰ، بے نفسی، فروتنی، خاک ساری اور انکساری کا ایسا نادر اور دل کو چھو لینے والا نمونہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا۔ وہ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے جس کی کوئی مثال ذہن کے پردے پر نہیں ابھرتی۔اجلا ظاہر، پاکیزہ باطن، بلند کردار اور اخلاق حمیدہ کا ایسا پیکر اب کہاں ملے گا۔زندگی میں بہت سے نشیب وفراز آئے لیکن شکوہ اور شکایات کی عادت کبھی نہیں رہی۔فکرمندی ہمیشہ یہی رہی کہ کسی کے لیے باعث زحمت نہ بنیں، کسی کے لیے بار خاطر نہ ثابت ہوں۔اپنے آپ میں سمٹے سمٹائے۔اس شان استغنا سے زندگی کے نو (۹) دہے گزار دیے، کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے اور کسی کا بار احسان نہیں اٹھایا۔عزیزوں، شاگردوں اور چاہنے والوں کو حسرت ہی رہی کہ کبھی خدمت کا موقع ملتا۔

ہم سے یہ بار لطف اٹھایا نہ جائے گا
احسان یہ کیجیے کہ یہ احسان نہ کیجیے

نام ونمود اور شہرت سے بچنے والی بعض اور شخصیات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا لیکن اس سے ہراساں اور پشیماں ہونے والا ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھا۔جب ایسا کوئی موقع آجاتا تو ان کے اوپر ایک عجیب قسم کی سراسیمگی، بیچارگی اور پشیمانی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے کسی بڑی مصیبت اور آزمائش سے دوچار ہو گئے ہوں۔

مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی ۲۰ر اگست ۱۹۲۸ء کو اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی میں پیدا ہوئے۔گھر کا ماحول دینی اور علمی تھا۔اردو کے مایہ ناز محقق مولانا عبدالسلام ندوی کا تعلق

اسی خانوادے سے تھا۔ وہ رشتہ میں مولانا عبدالحسیب صاحب کے چچا اور بچپن سے ان کے رول ماڈل تھے۔ ان کے دادا نور محمد ترابی صاحب عالم تھے۔ **عون المعبود علی سنن ابی داؤد** کے مصنف مولانا شمس الحق عظیم آبادی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۱ء) سے ان کا قریبی تعلق تھا اور ان کے ساتھ پٹنہ میں کئی سال تک ان کا قیام بھی رہا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے بیان کے مطابق انھوں نے اس تصنیف کی تیاری میں مصنف کی مدد کی تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی رسالے بھی تصنیف کیے تھے جو غالباً مولانا کے ذاتی ذخیرہ کتب میں موجود تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے ریکارڈ کے مطابق ۱۹/نومبر ۱۹۴۰ء کو انھوں نے وہاں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۰ء میں فراغت حاصل کی۔ تحریک آزادی کے آخری ماہ وسال، آزادی کا حصول اور تقسیم ملک کا عہد ساز زمانہ انھوں نے مدرسہ میں گزارا۔ اس وقت وہاں کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلم، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا اظہار الدین اصلاحی شامل تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۴۳ء میں مدرسہ سے رخصت ہوگئے تھے جب وہ ابھی بالکل ابتدائی درجات کے طالب علم تھے، چنانچہ ان کو ان سے مستفید ہونے کا موقع تو نہیں ملا ہوگا، البتہ ان کو دیکھنے اور سننے کا موقع ضرور ملا ہوگا۔ ان کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی اور مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی بھی مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ان سب اصحابِ علم وفضل سے استفادہ کیا۔ البتہ ان کو خصوصی نسبت تلمیذ فراہی مولانا اختر احسن صاحب سے تھی۔ دورانِ درس وہ ان کی گفتگو کو بغور سنتے اور بعد میں ان کے افادات کو ممکن حد تک احتیاط اور اہتمام سے قلم بند کر لیتے۔ زمانۂ طالب علمی کے ان افادات کو انھوں نے زندگی بھر حرز جان بنائے رکھا اور اس سے نہ صرف خود استفادہ کرتے رہے بلکہ بعض دوسرے اہلِ علم نے بھی استفادہ کیا۔ ان اہلِ علم میں مولانا جلیل احسن ندوی صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی سے خصوصی طور پر استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان کو ان افادات سے ذہنی مناسبت تھی۔ وہ اکثر ان افادات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ تدبر قرآن کے جائزہ میں انھوں نے خاص طور سے ان سے استفادہ کیا ہے۔

مدرسۃ الاصلاح میں جماعت اسلامی کے اثرات ابتدا ہی سے قائم ہوگئے تھے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی شروع ہی میں اس سے وابستہ ہوگئے تھے، مولانا صدرالدین اصلاحی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ۱۹۳۸ء میں پٹھان کوٹ میں دارالاسلام کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس کے پانچ تاسیسی ممبروں میں شامل تھے۔ جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت وہ ہندوستان سے دور برما میں تدریسی خدمات انجام دے

رہے تھے۔ لیکن تحریک کے مقاصد سے ان کی وابستگی پر مولانا مودودیؒ کو اتنا بھروسہ تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر ان کی رکنیت منتقل کر دی گئی اور ان کو اس کی اطلاع دے دی گئی۔ مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب بھی بالکل ابتدا میں جماعت سے وابستہ ہو چکے تھے۔ جب آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں جماعت کی تشکیل ہوئی تو مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب اس کے پہلے امیر مقرر ہوئے اور چوں کہ وہ اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اس لیے جماعت اسلامی کا پہلا مرکز مدرسۃ الاصلاح قرار پایا۔ اگرچہ وہ جلد ہی ملیح آباد اور وہاں سے رام پور منتقل ہو گیا۔ اس طرح جماعت اسلامی اور اس کی فکر مدرسۃ الاصلاح میں اجنبی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فراغت کے بعد مولا ما عبدالحسیب اصلاحی مدرسہ اور وطن میں مختصر قیام کے بعد رام پور اور وہاں سے علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ ان دونوں جگہوں سے ان کی وابستگی جماعت کے تعلق اور اس کی ضرورتوں کے تحت ہوئی تھی۔

انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بحیثیت استاد مدرسۃ الاصلاح سے وابستگی کی تاریخ ۱۹۵۴ء بتائی ہے۔ اس سلسلے میں ان کو شاید کچھ سہو ہوا ہے۔ مدرسہ کے ریکارڈ میں ان کا نام ربیع الاول ۱۳۷۶ میں نظر آتا ہے، جس کا مطلب ہے، ستمبر ۱۹۵۶ء۔ جب وہ علی گڑھ سے مدرسہ آئے، جہاں تک یاد ہے راقم حروف درجہ عربی دوم کا طالب علم تھا۔ میرا داخلہ مدرسہ کے ریکارڈ کے مطابق ۱۹۵۴ء میں درجہ چہارم مکتب میں ہوا تھا۔ درجہ چہارم کے بعد میرا داخلہ عربی اول میں ہو گیا تھا۔ اس طرح مدرسے پر ان کی آمد سے پہلے میں مدرسہ پر دو سال گزار چکا تھا۔ اس طرح بھی ان کی مدرسہ سے وابستگی کی تاریخ ۱۹۵۶ء سے پہلے ممکن نہیں۔ انھوں نے اسی انٹرویو میں اپنے قیام مدرسہ کی مدت چھ (۶) سال بتائی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ان کا مدرسہ سے قطع تعلق ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس لحاظ سے بھی مدرسہ میں ان کی آمد کی تاریخ ۱۹۵۶ء کے آس پاس ہی بنتی ہے۔

وہ مدرسہ پر ادب، قرآن مجید اور عربی انشا کی تعلیم دیتے تھے۔ عربی ادب کا ان کا بڑا پاکیزہ ذوق تھا۔ بہت اچھی عربی لکھتے تھے۔ قرآن مجید سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم درجہ عربی سوم سے شروع ہوتی تھی۔ قرآن مجید کے ہمارے پہلے استاد وہی تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے طریقۂ تعلیم کے مطابق طلبہ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ ممکن حد تک مطالعہ اور تیاری کر کے آئیں۔ تدریس میں کسی تفسیر کی مدد نہیں لی جاتی تھی البتہ وقت ضرورت تفاسیر سے رجوع کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب تدبر قرآن چھپ گئی تو سننے میں یہ آیا کہ وہ اپنی تدریس میں اس سے بہت مدد لیتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سے بحیثیت استاد ان کی وابستگی مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مدرسہ کے احاطے میں ان کی موجودگی تمام وابستگان مدرسہ کے لیے ایک سہارا کی حیثیت رکھتی تھی۔ علمی رہ نمائی کے علاوہ ان کا بابرکت وجود ایک نعمت سے کم نہیں تھا، جس کے اثرات محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر مدرسہ کی زندگی کے ہر پہلو پر پڑتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے انتقال سے جہاں مدرسہ میں ایک بڑا علمی خلا پیدا ہو گیا وہیں اب وہاں کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں رہ گئی جو سب کا مرجع اور یکساں طور پر قابل احترام ہو اور جس کا فیصلہ سب کے لیے قابل قبول ہو۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں انتظام مدرسہ اور بعض اساتذہ کے ذہن میں کسی قدر تحفظات پائے جاتے تھے۔ جب تک مولانا اختر احسن صاحب موجود تھے وہ بہت زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آ سکے اور جب کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو ان کے ناخن تدبیر اس کو سلجھا دیا کرتے تھے۔ ان کے بعد ایسی کوئی شخصیت باقی نہیں رہی۔ ان کے انتقال کے چند سال کے اندر نوبت یہاں تک آ گئی کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کرام کو مارچ ۱۹۶۱ء میں مدرسۃ الاصلاح سے سبک دوش کر دیا گیا۔ ان محترم اساتذہ میں مولانا عبدالحسیب صاحب بھی شامل تھے۔ اس وقت راقم حروف منتہی درجات کا طالب علم تھا۔ ان اساتذہ کرام کے لیے مادر علمی سے جدائی جتنی شاق رہی ہو گی اس سے کم طلبہ کے لیے نہیں تھی جن کو اپنے شفیق اساتذہ کے فیض تعلیم و تربیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے انتقال کے بعد اب ان اساتذہ کرام میں سے صرف مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں۔ صحت و عافیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ تادیر ان کے سایۂ شفقت کو باقی رکھے۔ آمین

مولانا عبدالحسیب صاحب پہلے ہی حج کی نیت کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ سفر حج پر روانہ ہو گئے۔ مولانا سے خصوصی لگاؤ کی وجہ سے راقم حروف حج کے لیے روانگی سے پہلے ان سے ملنے اور دعاؤں کے لیے درخواست کرنے کے مقصد سے علاء الدین پٹی گیا۔ حسب معمول بہت شفقت سے ملے۔ حج سے واپسی اور جامعۃ الفلاح سے طویل وابستگی کے درمیان جامعۃ الرشاد سے تعلق کا ایک مختصر عرصہ ہے۔ میرے لیے اس وقفہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ایک بار پھر کچھ دنوں کے لیے ان کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ جہاں تک یاد ہے یہ ۱۹۶۲ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں مدینۃ منورہ سے واپسی کے بعد ابھی گھر ہی پر تھا اور مستقبل کے لیے کوئی لائحۂ عمل طے نہیں کر سکا تھا۔ مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب ایک دن ہمارے گھر تشریف لائے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ جب تک آئندہ کے لیے کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا میں جامعۃ الرشاد آ جاؤں۔

چنانچہ اگلے سال لکھنؤ یونی ورسٹی میں داخلہ لینے تک میں چند مہینے وہاں سے وابستہ رہا اور ابتدائی درجات میں کچھ تدریسی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اس وقت وہاں مولانا عبدالحسیب صاحب کے علاوہ میرے بعض اور اساتذہ بھی موجود تھے۔ اس وقت جامعہ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ تدریس مسجد جالندھری میں ہوتی تھی اور اساتذہ اور طلبہ قریب ہی ایک مکان میں رہتے تھے۔ میرا قیام تو وہاں نہیں تھا لیکن اس طرح اپنے محترم اساتذہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ضرور مل جاتا تھا۔

بعد میں خود لکھنؤ اور وہاں سے تین سال بعد علی گڑھ منتقل ہوگیا، جہاں اللہ کے فضل و کرم سے ابھی تک موجود ہوں۔ میرے اساتذہ بھی بعد میں جامعۃ الفلاح منتقل ہوگئے۔ مولانا عبدالحسیب صاحب جنوری ۱۹۶۴ء میں جامعۃ الفلاح سے وابستہ ہوئے اور عمر عزیز کے اگلے چالیس سال انھوں نے اس کی خدمت میں صرف کیے۔ اس داستانِ عزیمت سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں جامعہ کی تعمیر میں ان کا کردار اساسی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے ایک ایک اینٹ جوڑ کر اس درس گاہ کو عظمت اور عروج کے اس مقام تک پہنچایا، جہاں وہ اللہ کے فضل و کرم سے آج کھڑا ہے۔ وہ جب وہاں سے وابستہ ہوئے تھے ان کی عمر ابھی چالیس سال سے کم تھی۔ جسم میں ابھی توانائی تھی اور قوی میں اعتدال تھا۔ ساتھ ہی کام کا جذبہ اور خدمت کی لگن تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے اس کی خدمت میں اپنی ہڈیاں گھلا دیں۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ انھوں نے اپنے مزاج کے خلاف جامعہ کی صدارت کی ذمہ داریاں بار بار سنبھالیں اور اس کے سخت تقاضوں کو بحسن و خوبی ادا کیا۔ میرے کئی اساتذہ جامعہ سے وابستہ تھے: مولانا جلیل احسن ندوی صاحب، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب، مولانا صغیر احسن اصلاحی اور مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب۔ اس لیے کم و بیش بلریا گنج جانے کا سلسلہ قائم رہا اور اس ویرانے میں علم و دانش کے اس مرکز کو صورت پذیر ہوتے دیکھتا رہا۔ ایک مکتب سے ایک عظیم الشان جامعہ کی صورت اس نے ہماری آنکھوں کے سامنے اختیار کی ہے۔ اس کی صورت گری میں جن شخصیات کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے ان کی مختصر سے مختصر بھی جو فہرست بنائی جائے گی اس میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے چار دہوں پر محیط اس عرصہ میں نہ صرف پورے احساس ذمہ داری، اخلاص اور لگن سے تدریسی اور انتظامی ذمے داریاں انجام دیں، بلکہ اس کے لیے درکار وسائل کی فراہمی کے مقصد سے کویت کے کئی سفر کیے۔ اب نام تو یاد نہیں رہا لیکن وہاں ان کے بعض اہم شخصیات سے اچھے تعلقات استوار ہوگئے تھے۔

ان تعلقات کو وہ اس کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کی افتادِ طبع اور مزاج سے جو لوگ واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جامعہ سے غیر معمولی محبت اور تعلق خاطر ہی نے ان کو اس کام کے لیے آمادہ کیا ہوگا۔ ان کو جاننے والے جانتے ہیں کہ حرف سوال زبان پر لانا ان کے لیے کتنا مشکل تھا۔ ہندوستان میں دینی تعلیم کے منظر نامہ میں جامعۃ الفلاح کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس کو اس سطح اور معیار تک لانے میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔

عمارتیں اداروں کو ظاہری شناخت فراہم کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بنانے والوں کے عزم و حوصلہ اور ارادوں کی بلندی کی شہادت بھی دیتی ہیں اور بحیثیت مجموعی وہ ماحول فراہم کرتی ہیں، جس میں طلبہ کی کسی مخصوص ذہنی اور فکری انداز میں تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ یوں تو جامعہ کی سبھی عمارتیں اپنے اپنے انداز میں اپنے معماروں کے عزم و حوصلہ کی داستان سناتی ہیں، لیکن ان کے درمیان مسجد کی شان ہی کچھ اور ہے۔ جامعۃ الفلاح کی خوبصورت اور وسیع مسجد صرف ان کے عزم و حوصلہ کی داستان نہیں سناتی جن کے حسن تخیل کی وہ شاہ کار ہے بلکہ جامعہ کی عظمت کا استعارہ بھی بن گئی ہے: **ہے ہمالہ سے بھی اونچا میرا مینار فلاح**۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کا بڑا حصہ رہا ہے۔ بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ کسی علمی ادارہ کی اساس دراصل اس کے مقاصد، نصاب تعلیم اور منہاج تدریس ہوتے ہیں۔ جامعہ کے مقاصد کے تعین اور نصاب تعلیم کی صورت گری میں بھی ان کا پورا حصہ رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی رہیں وہ ان میں برابر کے شریک رہے۔ مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے جامعہ میں نصاب تعلیم، منہاج تدریس اور انداز تربیت کے تعین اور عمل آوری میں وہ شریک و سہیم رہے۔ چنانچہ جامعہ میں مجموعی طور پر جو علمی فضا بنی اور تعلیم و تربیت کا جو انداز اور معیار قائم ہوا، جس کے لیے وہ دور نزدیک جانا پہچانا گیا اس کی تعمیر و تشکیل میں ان کا جو کردار رہا ہے وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔

جامعہ سے ان کا جو گہرا جذباتی اور قلبی تعلق تھا، اس کی تعمیر و ترقی میں ان کا جو حصہ تھا اور اس کے لیے ان کی جو خدمات تھیں ان کے پیش نظر ان کی خواہش تو یہی تھی کہ وہ اس وقت تک اس ادارہ کی خدمت کرتے رہیں جب تک قویٰ اجازت دیں اور جسم و جان میں توانائی باقی رہے اور اپنے فرائض کو بحسن و خوبی ادا کر سکیں۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ جس ادارے کی انھوں نے مدت العمر خدمت کی تھی عمر کے آخری پڑاؤ میں اس کی جدائی کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا اور ریٹائرمنٹ کے قانون کے مطابق ان کو ادارہ

سے سبک دوش کر دیا گیا۔ انھوں نے دواداروں سے ٹوٹ کر محبت کی اور دونوں نے ان کا دل توڑا۔ پہلے ان کی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح نے جماعت اسلامی سے تعلق کی سزا میں ان کو ملازمت سے سبک دوش کیا۔ پھر جامعۃ الفلاح نے جس کی انھوں نے چالیس سال تک خدمت کی تھی۔ ان تجربات نے ان کے دل و دماغ پر جو اثر ڈالا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ لیکن اس شدید کرب واذیت کے باوجود جو اس سلوک سے ان کو پہنچا وہ ان دونوں اداروں کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتے رہے اور ان کو جب بھی یاد کیا گیا اسی ذوق وشوق سے وہاں جاتے رہے اور ان کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے تھے اس سے کبھی گریز نہیں کیا۔

جامعۃ الفلاح سے علاحدگی کے بعد وہ پاس کے گاؤں بندول کے لوگوں کے اصرار پر وہاں کے مدرسۃ نسواں میں پڑھاتے رہے۔ دل چسپی یہ تھی کہ وہاں بچیوں کو قرآن پڑھانا تھا۔ صبح کو وہ اپنے گاؤں سے پیدل بندول جاتے اور شام کو گھر لوٹ آتے۔ بعد میں ضعف کی وجہ سے اتنا فاصلہ پیدل طے کرنے میں زحمت ہونے لگی تو راستے میں ایک دو جگہ بیٹھ کر ستا لیتے۔ جب تک ممکن ہوا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب ممکن نہ رہا تو یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ مدرسہ بند ہو گیا۔

قریب ساٹھ سال کے عرصہ پر محیط تدریسی زندگی میں وہ بنیادی طور پر قرآن مجید اور ادب عربی پڑھاتے رہے۔ قرآن مجید سے ان کے گہرے تعلق کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ وہ اپنے گاؤں کی مسجد میں جہاں وہ امامت بھی کرتے تھے، پابندی سے درس قرآن کا اہتمام کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ صرف ایک آیت پر گفتگو ہوتی۔ قرآن مجید کی مدت نزول ۲۳ سال ہے۔ اس انداز میں قرآن کا درس مکمل کرنے میں ان کو تیس سال لگے۔ اس انداز میں وہ دوبار قرآن مجید کا درس مکمل کر چکے تھے۔ تیسری بار کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ قضا کا پروانہ آ گیا۔

عربی زبان وادب سے گہرا شغف تھا۔ اعلیٰ درجہ کی عربی لکھنے کی قدرت تھی۔ ہم کو انھوں نے عربی انشا بھی پڑھائی تھی۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں مجلۃ الحج میں ان کا مضمون رمـــی جـمـــار کے موضوع پر چھپا تھا۔ بعد میں جہاں تک اندازہ ہے انھوں نے عربی زبان میں مضامین تو نہیں لکھے لیکن متعدد کتابوں کے عربی میں ترجمے ضرور کیے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے ان کو تلمذ کی نسبت تو نہیں حاصل تھی البتہ ان سے ان کو بہت عقیدت تھی۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے لاہور گئے تو ان سے ملاقات کی تھی۔ مولانا اصلاحی نے ان کو اپنی تمام تصانیف کے ترجمہ کی اجازت دے دی تھی۔ وہ خود اردو کے نہایت اعلیٰ درجہ کے نثر نگار تھے۔ زبان و بیان کے سلسلے میں ان کا معیار بہت بلند تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ مولانا

عبدالحسیب صاحب کے عربی طرزِ نگارش سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی ان کو اپنی تصانیف کے ترجمہ کی اجازت دی ہوگی۔ انھوں نے مولانا اصلاحی کی کئی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا جن میں 'قرآن میں پردے کے احکام' اور 'دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار' شامل ہیں۔ انھوں نے غالباً حقیقت شرک کا بھی ترجمہ مکمل کرلیا تھا۔ آخری دنوں میں وہ جہاں تک معلومات ہوسکی ہیں حقیقت توحید کا ترجمہ کررہے تھے۔ اس کا ترجمہ غالبًا وہ پہلے کرچکے تھے اور الدعوۃ میں وہ بالاقساط چھپ بھی چکا تھا لیکن اس کی فائلیں دست یاب نہیں ہو سکیں اس لیے پھر سے اس کو ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب **التفسیر السیاسی للاسلام** کا جواب مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے دیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی نے **التفسیر الحقیقی للاسلام** کے نام سے اس کا ترجمہ کیا تھا جو **التفسیر الحقیقی للاسلام فی الرد علی کتاب التفسیر السیاسی للاسلام للشیخ ابی الحسن الندوی** کے نام سے شائع ہوئی۔

دارالمصنفین کے مؤسسین اور اساطین میں مولانا عبد السلام ندوی شامل ہیں، ان کا تعلق مولانا عبدالحسیب صاحب کے خانوادے سے تھا۔ اس طرح دارالمصنفین کے نام سے بچپن ہی سے آشنا ہو چکے تھے۔ جب سن شعور کو پہونچے اور مدرستہ الاصلاح میں داخلہ ہوگیا تو گھر آتے جاتے راستے میں چچا سے ملنے اکیڈمی جاتے۔ اس طرح وہاں کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ بھی نیاز مندانہ تعلقات استوار ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب میں چچا کے پاس پہنچتا تو فرماتے کہ جاؤ سید صاحب کو سلام کرکے آؤ۔ عمر کے ساتھ ساتھ تعلق میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہاں کی علمی تقریبات میں وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ دارالمصنفین کے اراکین بھی ان رشتوں کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ اگست ۲۰۰۳ء میں جب کانفرنس ہال کی تعمیر کا فیصلہ ہوا تو سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انہی کا انتخاب کیا گیا۔ ان کے انتقال سے اکیڈمی بھی اپنے ایک مخلص بہی خواہ سے محروم ہوگئی۔

مولانا عبدالحسیب صاحب آخر تک اپنی علمی اور دینی مصروفیات میں منہمک رہے اور مختصر سی علالت کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنی رحمتوں کے سایے میں انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ-مکمل نامۂ انکسار

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیا تم نے دنیا کے سب سے منکسرالمزاج انسان کو دیکھا ہے؟ جواب اثبات میں ہوگا۔ جی دیکھا ہے اور اس کا نام نامی مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ (اگست ۱۹۲۸ء- ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء) ہے۔ یہ انکساری آئی کہاں سے؟ آپ کے مطالعۂ قرآن اور مطالعۂ شمائل النبی ﷺ سے، جو قرآن کریم میں مستغرق ہوتا ہے پندار اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ آپ کی طبیعت میں اتقاء وانابت کا دوسرا منبع ومنہل فکر فراہی تھا۔ مولانا فراہی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ بتانا آسان نہیں کہ ان کا علم زیادہ تھا یا تقویٰ؟ آپ کے تعبد وتورع کا تیسرا مشرب ومخرج شیدائے قرآن مولانا اختر احسن اصلاحی تھے۔ ایسے متورع ومتقی شخص کا سایہ جس پر پڑ جائے وہ حلیم بن جاتا ہے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی بخوبی جانتے تھے کہ اتقاء اور استکبار میں انتہائی معنوی بُعد ہے۔ مولانا نے اپنے مضمون ''انسداد استکبار'' (مجلّہ: الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ) میں استکبار کا قرآنی مفہوم کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ بہر کیف کہنا تو یہ ہے کہ مولانا عبدالحسب اصلاحی کو بخوبی معلوم تھا کہ تقویٰ خیر الزاد ہے اور یہی تقویٰ خیر الملابس بھی۔ یہاں ۹ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کی ایک داستان رقم کرنا مقصود ہے۔ مدرسۃ الاصلاح پر فراہی سمینار کا انعقاد تھا۔ تقریبِ تقسیمِ انعامات کے تعلق سے ایک سیشن کی نظامت خاک سار کے ذمہ تھی اور اس کی صدارت مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے کاندھوں پر۔ یہ صدارت انھوں نے بڑی جوکھم کے بعد قبول کی۔ کیوں کہ انھیں تشہیر وتقریر اور کرسیٔ صدارت سے سخت بیزاری تھی۔ اسٹیج پر شخصی رونمائی تو ان کے لیے وبال جان تھی، کم گفتاری ان کا وطیرۂ حیات تھی۔ رہ رہ کر دورانِ پروگرام آپ سے کئی بار ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان باتوں میں غضب کا تلطف وتکرم، ذرہ برابر اظہار واستکبار نہیں، بلکہ ان کی باتیں تورع وتذلل میں ملبوس ہوتیں۔ مولانا نے ننھی سی صدارتی تقریر کی لیکن اس میں مغز ہی مغز، مکمل مجموعۂ حکم وعبر، باتیں اچھی طرح یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کچھ پانے کے لیے

ضروری ہے کہ استمرار واستقرار کو اساسی ہتھیار بنایا جائے۔ کام کم کیا جائے لیکن اس میں مداومت ہو، اسی طرح جم کر بیٹھنے سے کام یابیاں بڑھ کر استقبال کرتی ہیں، بلکہ چل کر پاس آتی ہیں۔ مولانا کی اس مختصر تقریر کا ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ مطالعہ قرآن کو زندگی کا وصف بنایا جائے۔ اس وصف کا نام فکر فراہی ہے۔ فکر فراہی کا محور تمسک بالکتاب ہے۔ سید قطب کی زبان میں قرآن کریم سے ہم کلام ہونے کا نام ہے۔ مولانا سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ ہر ملاقات شفقت ومحبت کا جھونکا۔ غالب نے ''بادہ نوشی ہے بادپیمائی'' کی بات کی ہے لیکن غالب کا یہ خیال ہمارے نزدیک بے معنی، بالکل لاطائل، کیوں کہ اصلاً مولانا سے مل کر یہ احساس ہوا کہ مولانا سے ملاقاتیں یقیناً بادصبا کی مانند تھیں۔

مولانا کی اصل شناخت تدریس قرآن اور درس قرآن تھی۔ پوری زندگی اسی میں صرف ہوئی۔ اس سے بہترین مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ قرآن پڑھا اور پڑھایا جائے، سیکھا اور سکھایا جائے۔ یہ دونوں چیزیں فکر فراہی پر مبنی ہوتیں۔ مولانا فراہی کی پوری زندگی اسی پٹری پر دوڑتی رہی۔ مولانا فراہی کی تصانیف انھیں ازبر تھیں۔ مولانا فراہی کی طرح انھوں نے بھی یہی اصول اپنایا کہ ذریعۂ اظہار صرف عربی زبان ہو، اپنے طلبہ سے اکثر عربی زبان میں گویا ہوتے۔ اپنے درس وتدریس میں مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کو نقل کرتے۔ تفسیر نظام القرآن، تدبر قرآن اور تلخیص تدبر قرآن کی روشنی میں مشکلات القرآن کے حل ڈھونڈھتے۔ اپنے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی سے انتہائی محبت کرتے تھے، ان کی تصانیف اور ان کی تفسیر تدبر قرآن کو تاحیات سینے سے لگائے رکھا۔ وہی ان کے مطالعہ قرآن کا محور ومطاف۔ مرحوم خالد مسعود تلمیذ امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن کی تلخیص کردی ہے۔ درس قرآن سے قبل مولانا اسے دیکھتے۔ مولانا اصلاحی سے مولانا کا خصوصی تعلق تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ میری مولانا اصلاحی سے اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی آپ سے ملاقات ہوتی تو مولانا اصلاحی کی خیریت کے تعلق سے استفسار کرتے۔ ان کے احوال جانتے، مضطرب ہوتے۔ جب مولانا اصلاحی کی داستان سرائی شروع ہوئی تو چہرے کی تازگی سوا ہوگئی۔ ان کے کیف وانبساط کا عالم نہ پوچھیے۔ کتابوں میں پڑھتا رہا ہوں کہ استاذ اور شاگرد کا تعلق انتہائی گہرا بلکہ اتھاہ ہوتا ہے، مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے مل کر اس پر کلی یقین ہوا۔ مولانا فراہی سے مولانا اصلاحی کے تلمذ نے اسے مزید مبرہن کردیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انتقال پر جنازے میں شرکت کے لیے مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب لاہور گئے تو اپنے استاذ محترم مولانا اصلاحی سے آپ کی ڈھائی گھنٹے طویل ملاقات رہی۔ دنیا جہان کی باتیں

ہوئیں۔اسی ملاقات میں انھوں نے مولانا اصلاحی سے ان کی تصانیف کو عربی میں منتقل کرنے کی اجازت چاہی تو مولانا نے اجازت دے دی۔ظاہر ہے مولانا اصلاحی ایک لسانی رمزشناس تھے۔خوب صورت، مرصع اور متین زبان لکھنے کے عادی تھے۔ادبا اور انشاپرداز ان کے انداز بیان پر رشک کرتے تھے۔جناب ڈاکٹر الیاس اعظمی نے اپنے مضمون ''مولانا امین احسن اصلاحی کا اسلوب نگارش'' میں مولانا کے انداز نگارش پر اظہار خیال کیا ہے۔پروفیسر خورشید احمد نے مولانا اصلاحی کے حسین اسلوب بیان پر انتقال کے وقت مجلّہ ترجمان القرآن پر روشنی ڈالی تھی۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا اصلاحی کو بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے شاگرد مولانا عبدالحسیب اصلاحی ان کی کتابوں کو ایک شگفتہ زبان میں منتقل کرنے پر قادر ہیں۔یقیناً مولانا کو عربی زبان میں اپنے خیالات پیش کرنے کا فن آتا تھا۔مجلّہ ''الحج'' کے علاوہ بعض دیگر مجلّات میں آپ کے عربی مضامین شائع ہوئے۔مولانا اصلاحی کی مندرجہ تصانیف دعوت دین اور اس کا طریقہ کار، قرآن میں پردے کے احکام، حقیقت شرک کو عربی میں منتقل کیا۔اس وقت ''حقیقت توحید'' کو اردو جامہ پہنانے میں مصروف تھے لیکن اللہ نے انھیں بلالیا۔کاش منتقل شدہ حصہ ہی عربی قارئین کے لیے شائع کردیا جاتا۔اسی طرح مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کا جواب جب سید احمد عروج قادری صاحب نے تحریر کیا تو اسے بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے عربی میں منتقل کیا۔آپ کے مضامین جماعت اسلامی کے عربی ترجمان ''الدعوۃ'' دہلی میں شائع ہوتے تھے۔اس کے بند ہونے سے جماعت اسلامی کا ایک بہت بڑا چینل بند ہوگیا۔اسی کے ذریعہ دنیائے عرب میں جماعت اپنے رجحانات وخیالات کو پہنچاتی تھی۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ جماعت ''الدعوۃ'' اور روزنامہ دعوت کو دوبارہ جاری کرتی لیکن امید ڈگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے کیوں کہ دن بہ دن جماعت علمی افلاس سے قریب ہوتی جارہی ہے۔مناصب کی چاہتیں اراکینِ جماعت میں فروغ پارہی ہیں۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی خواہش تھی کہ فراغت کے بعد اپنی تمام تر زندگی اپنی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح کے سپرد کردیں، لیکن جماعت اسلامی اور مدرسۃ الاصلاح کے باہمی تال میل پر تنازع شروع ہوا، بہت سے قابل ذکر اساتذہ کرام اس کی زد میں آئے۔انھیں بھی بادل ناخواستہ اپنی مادر علمی سے جدا ہونا پڑا۔اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے صرف اتنی وضاحت ضروری ہے کہ جماعت کی سرگرمیاں مدرسہ پر حاوی ہورہی تھیں، فکر فراہی ماند پڑ رہا تھا۔اساتذہ کرام جماعت کے پروگراموں میں بڑی سرگرمی سے شریک ہوتے جس کی وجہ سے تدریس متاثر ہورہی تھی۔اساتذہ کرام کے بیچ میں کچھ طلبہ بھی تھے جو فکر فراہی کے ترجمان

مولانا بدرالدین اصلاحی کے خلاف آواز بلند کررہے تھے۔ بہرکیف یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ فکرفراہی کے نمائندہ، مولانا اختر احسن اصلاحی کے پرستار اور مولانا امین احسن اصلاحی کے حقیقی محبّ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کو بھی اپنی مادرعلمی سے علاحدہ ہونا پڑا۔ ظاہر ہے یہ علاحدگی ان کے لیے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ سنا ہے کہ دوران تدریس اور محافل ومجالس میں مولانا اکثر یہ کہہ دیتے کہ ہمارے اصلاح پر ایسا ہوتا تھا۔ دو لفظ ''ہمارے اصلاح'' میں عشق ومحبت کا ایک دریا موجزن ہے۔ مولانا اکثر اپنے اساتذہ کرام بالخصوص مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے اذکار و اوراداس طرح کرتے کہ اس سے ان کے تعلق کا اظہار پھوٹتا۔ مولانا اختر احسن اصلاحی کی زندگی کو جن تلامذہ نے ضابطۂ حیات بنایا ان میں سے ایک ممتاز نام مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا بھی ہے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی کا فقر اور سادگی ان کے رگ وریشے میں پوری طرح سرایت کرگئی تھی۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی پوری زندگی دو جوڑوں اور ایک شیروانی پرمبنی رہی۔ آخری دنوں میں آپ کی بیٹیوں نے خاصے اصرار کے بعد ایک شیروانی اور سلوادی۔ مولانا کی چاہتیں خواہشاتِ دنیا پر جاکر نہ ٹکتیں بلکہ آپ کی آرزوؤں کا مرکز مطالعہ قرآن تھا۔ قرآنی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہوئے تو حوادثِ روزگار نے آپ کے راستے روک دیے۔ یہی جذبہ قرآنی نے آپ کو جامعۃ الفلاح سے ہم آہنگ کیا۔ جامعہ کے ابتدائی دنوں کی تاریخ کا آپ سرنامہ تھے۔ سرنامے کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادوں کے ایسے پتھر بھی جو نظر نہیں آتے۔ اسی پتھر پر جامعہ آج لہلہارہا ہے، اس کی مسجد سے ایمان تازہ ہورہا ہے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے فکری اور مادی دونوں اعتبار سے جامعہ کو استحکام بخشا۔ مولانا کی طویل خدمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن ایک ملازم کے ہاتھوں مولانا کو نامۂ سبک دوشی تھمادیا گیا۔ ظاہر ہے مولانا کا دل مسوس کررہ گیا۔ یہ ان کے لیے ایک دل خراش خبر تھی۔ بہرکیف ٹوٹ کررہ گئے، اپنے اس رشتے کی بقا کے لیے ایک طریقہ یہ ڈھونڈا کہ ایک مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا۔ درس قرآن سے قبل تدبر قرآن کی تلخیص پر ضرور ایک نظر ڈالتے۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ مولانا کی تدریس اور درس قرآن میں فکرفراہی اور مولانا اصلاحی کے حوالے بکثرت ہوتے۔ زندگی بھر یہی چیزیں ان کی فکری راہ کا روشن چراغ بن گئیں۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزری، کل ایک کمرے میں مولانا کی رہائش گاہ تھی۔ خواب گاہ کے ساتھ یہی کتب گاہ بھی، یہ کمرہ اس لیے باعث برکت اور باعث رحمت ہے کہ یہیں مولانا قرآنیات کا مطالعہ کرتے، درس قرآن کی تیاریاں کرتے، نیز فکرفراہی سے طمانیت قلب حاصل

کرتے۔ یہ سب کچھ مولانا اختر احسن اصلاحی کا پرتو تھا۔ مجھے تین اصلاحیان میں خاصی مناسبت نظر آتی ہے۔ اسے یوں بھی کہیے کہ خاصی ثقافتی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور مولانا امانت اللہ اصلاحی، یہ سب ایک ہی راہ کے مسافر تھے بلکہ ایک ہی آسماں کے درخشندہ ستارے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی نے انھیں تفکر قرآن کی سوچ پر لگا دیا تھا۔ مولانا اختر احسن اصلاحی کی طرح مولانا داؤد اکبر اصلاحی اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے پاس دو ہی جوڑے کپڑے ہوا کرتے تھے۔ ہوائے نفس ان کے پاس پھٹک جائے یہ ممکن نہیں۔ مولانا اختر احسن اصلاحی کی طرح ان اصلاحیان کو دیکھ کر خدا یاد آتا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب ملتے تو جیسے بادصبا کا جھونکا آجائے، آواز بڑی لطیف ہوتی، یہ لطافت مسکراہٹوں سے ہوکر گزرتی، آواز میں شدت وحدت نام کو نہ ہوتی۔ اپنے طلبہ سے بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے باتیں کرتے، کرختگی کا ان کے مزاج سے کوئی ناطہ نہ تھا، اللہ کے رسول ﷺ معلم تھے۔ داروغہ نہیں تھے۔ جس کی وضاحت قرآن کریم نے ''لست علیھم بمصیطر'' کہہ کر کردی ہے۔ مولانا اپنے تلامذہ کے مابین شیر وشکر ہوجاتے، ان کے ساتھ چائے بھی نوش کرتے، آپ کے تلامذہ نے بتایا کہ اپنے گھر سے دودھ لاتے اور خالص دودھ کی چائے میں اپنے طلبہ کو شامل کرتے۔ اس سے آپ کی وسیع النظر فی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بچوں کے ساتھ عربی میں گفتگو کرتے تاکہ ان کی عربی دانی کو بہتر بناسکیں۔ زبان بڑی مرصع ہوتی، مترادفات پرزور ہوتا، اردو گفتگو تو غبار خاطر کے طرز پر چلتی۔ مولانا نے اپنے پوری زندگی تدریس اور مطالعہ میں صرف کردی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استحضار میں الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ تدبر قرآن کے چوں کہ بہت شیدائی تھے۔ اس کی سطر سطر ان کی نظروں سے گزر چکی تھی اگر اسے کوئی مکمل پڑھ لے تو قرآنیات کے ساتھ ساتھ اس کے ادب وانشا میں نکھار آئے گا۔ اس کی نگارشات پیکرِ جمال بن جائیں گی، لفظوں کو قوت گویائی میسر ہوگی۔ تدبر قرآن نے آپ کی زبان کو صیقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں یہ بات بیان کردینی مناسب ہوگی کہ مولانا امین احسن اصلاحی کی تمام تصانیف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں جس طرح زبان کے تعلق اور خوبصورت تحریر لکھنے کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی غبار خاطر اور خطبات آزاد کا مطالعہ کیا جائے جس سے زبان نکھرتی اور تحریر سنورتی ہے۔ یہی ٹھیک بات مولانا امین احسن اصلاحی کی نگارشات کے متعلق بھی کہی جاتی ہے۔ علامہ شبلی کی تحریر کا رچاؤ مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں میں موجود ہے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی بڑے توقف کے ساتھ مولانا اصلاحی کی تحریروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ انھیں اپنی

فہم وفراست کا حصہ بنالیا۔ اگر وہ اردو لکھتے تو یہ عکس ان کی تحریروں میں نظر آتا،لیکن مولانا نے مولانا فراہی کی طرح عربی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ اور ایسی معتبر عربی کہ عربوں نے اسے پسند کیا۔ اپنی سرزمین سے ان کی اشاعت کو اپنے لیے باعث افتخار تصور کیا۔ ''الدعوہ'' کے ایڈیٹر جناب مولانا سلمان ندویؒ سے خاکسار کی جماعتِ اسلامی کے مرکز چتلی قبر میں بے شمار ملاقاتیں رہیں۔ ان کے ساتھ افطار کی بھی سعادتیں حاصل ہوئیں، بالکل گورے اور سپید کپڑوں میں ان کی شخصیت نکھر جاتی تھی۔ ان کا گاؤں ''سکھولا'' کی سرحد میرے گاؤں طوی اعظم گڑھ سے ملتی ہے۔ ان کے بھائی رام ادھار سنگھ گھوڑے پر سوار ہوکر چلتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ وہ اکثر میرے گھر پر آتے تھے۔ چوں کہ میرے بھائی مرحوم عمران احمد خاں بھی گھوڑے پر سوار ہوکر ہی چلتے تھے جس کی وجہ سے مولانا کے بھائی اور میرے بھائی میں بہت چھنتی تھی۔ مولانا سلمان صاحب کا خاندانی رشتہ ٹھاکر گھرانے سے تھا، کسی وجہ سے گھر بدر ہوئے تو آغوش اسلام نصیب ہوئی، ندوۃ العلماء کی سند ہاتھ آئی۔ مولانا کا اپنی والدہ صاحبہ اور اپنے گھر والوں سے رابطہ برقرار رہا۔ ان کے اہل خانہ ان کی قبولیت اسلام سے برہم نہ تھے بلکہ دلی ان کے دیدار کے لیے آتے رہتے تھے۔ مولانا نے اپنی جائداد اپنے ہندو بھائی کے سپرد کردی، اس سے مولانا کے توکل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا سلمان ندوی کا ہندوستان کی عربی صحافت میں ایک بڑا نام ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے آثار وافکار کا ایک مبسوط مقالے میں جائزہ لیا جائے۔ خاکسار کی مولانا کے ساتھ بیسوں ملاقاتیں رہیں۔ خاکسار کو مولانا کی ضیافت، خوش گفتاری اور حلم سے بارہا مستفیض ہونے کے مواقع ملے۔ مولانا آفس میں آکر قرطاس وقلم سے جڑ جاتے اور الدعوہ کی تراش خراش میں لگ جاتے۔ یقیناً جماعتِ اسلامی کی ترجمانی میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا ہندوستان میں جن عربی لکھنے والوں کو پسند کرتے تھے ان میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا بھی ضرور نام لیتے تھے۔ لیکن یہاں پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کے کمال فن سے دنیا نے بہت کم استفادہ کیا۔ ان کی صلاحیتیں ان کا ادب اور ان کی تحریری گل کاریاں بہت کم منظر عام پر آسکیں۔ انھوں نے تدریس کو اپنا محور بنایا اور طلبہ کی تربیت پر اپنا تمام سرمایہ صرف کردیا، لیکن ذمہ دارانِ اصلاح وفلاح نے ان کی قدردانی نہیں کی، جب کہ آج بھی جامعہ کی بنیادوں میں جگہ جگہ مولانا بصورت سنگ نگ کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ انہی پتھروں پر کھڑی ہوکر جامعہ آج آسمان سے ہم کلام ہے۔ اہل جامعہ سے راقم درخواست گزار ہے کہ کوئی بڑی عمارت مولانا کے نام سے منسوب کی جائے، یہی انتساب اور ان کے محاسن کی اتباع ان کے لیے خراج تحسین ہوگا اور ان کے یاد کرنے کا

ایک بہانہ۔ظاہر ہے کہ مولانا کو معمارانِ جامعہ میں شمار کیا جائے گا۔اس معمار خاص کا نام اگر دور سے نظر آئے تو ان کے طلبہ اور محبین کے لیے باعث طمانیت ہوگا اور مولانا کے ساتھ انصاف بھی۔

اوپر یہ بات آچکی ہے کہ تدریس ہی مولانا کی اصل شناخت تھی۔اپنے پوتے ڈاکٹر ابورافع سے مولانا نے فرمایا کہ تدریس دنیا کا سب سے محبوب اور معیارترین مشغلہ ہے۔ یہ مشغلہ مولانا کے لیے باعث اعزاز اور وجہ کیف وانبساط رہا۔اپنے پوتے سے گویا یہ کہہ رہے تھے کہ تم بھی تدریس کو اپنا تشخص بناؤ،مولانا کی تدریسی روایت کی بقا کے لیے ڈاکٹر ابورافع شبلی کالج میں تدریسی فریضہ کی انجام دہی میں مشغول ہیں۔تدریس وتعلیم تو اسلام کا تشخص ہے اور سیرت پاک کا حقیقی محور بھی۔مولانا نے اپنے پوتے سے یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے استاذ محترم جناب پروفیسر شباب الدین اعظمی کے اعزاز واکرام میں کسی تساہلی کا ثبوت نہ دینا۔مولانا اصلاً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احترام استاذ سے علم نمو پاتا ہے۔ نیز آبشار بن کر فیض رسانی کرتا ہے اور طالب علم کو شرح صدر نصیب ہوتا ہے۔مولانا نے اپنے استاذان مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی توقیر وتعظیم میں کسی لمحے کوفروگزاشت نہیں کیا۔دونوں صاحبان کی رطب اللسانی سے ان کی زبانیں ہمیشہ تر رہیں۔وہ اپنی مادر علمی اور اساتذہ کرام کے ہمیشہ گن گاتے نیز ان کی علمی قدرومنزلت کا ذکر کرتے۔مولانا نے رشید رضا مصری کے طرز ذکر کو پسند کیا جنھوں نے اپنے استاذ محترم شیخ محمد عبدہ کے فکر کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دروس قرآن،کارناموں اور معاشرتی کارگزاریوں کے لیے دو جلدوں میں ''تاریخ الاستاذ'' ترتیب دیا۔یہ شعار مولانا کو اس قدر پسند آیا کہ اپنے استاذ محترم کی کتابوں کے تراجم میں جٹ گئے۔انھیں عربی حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے اپنی قوت ہی نچوڑ دی۔گویا مولانا اصلاحی آپ کا فکری لباس بن گئے۔ پاکستان میں جب بھی مولانا اصلاحی سے ملاقات ہوئی تو ان کے احوال دریافت کرتے،ان کے ذکر اور ان کی سلامتی کو سن کر ان کے چہرے پر تراوش دوڑ جاتی۔یا قرآن کریم کی زبان میں ''نظرۃ النعیم'' کی تصویر بن جاتے۔استاذ کے ساتھ حسن سلوک سے دنیا وعاقبت دونوں سنورتی ہیں۔مولانا اختر احسن اصلاحی کے خدمت گار تلامذہ کے اسماء گرامی یوں ہیں: مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی نے تو اپنے استاذ محترم کی کیا ہی خوب داستان سرائی کی ہے۔ان کی یتیمی کو سہارا دینے والے اور علم وادب سے آراستہ کرنے والے یہی مولانا اختر احسن صاحب تھے۔مولانا امانت اللہ اصلاحی صاحب کا اپنے استاذ مکرم سے بڑا عمیق وقریب تعلق تھا۔ جسے مولانا محی الدین غازی نے ''رہنمائے ترجمہ قرآن'' میں قلم بند کیا ہے۔خود عنایت اللہ سبحانی نے ''شیدائے قرآن'' کے عنوان

سے مولانا پر ایک پوری کتاب لکھ دی۔ مولانا کی زندگی، غریب پروری، فکر فراہی سے وابستگی، مادر علمی سے جذباتی تعلق اور تحریک اسلامی سے مخلصانہ اتصال واقتراب کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے استاذ کی حسین داستان کو اپنے کلیدی خطبہ (تاریخ مدرسۃ الاصلاح سمینار) میں رقم کیا ہے۔ مرقومہ بڑا ہی لذیذ ورغیب ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالحسیب اصلاحی اپنے استاذ کے واقعات اور زاویۂ حیات کو بڑے خوبصورت انداز میں سناتے، ایک خاص کیفیت مجلس پر طاری ہو جاتی۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی مادر علمی کی تاریخ تھے۔ اپنے اساتذۂ کرام کی دستاویز تھے نیز مولانا فراہی کے کتنے قصص ان کے سینے میں مدفون تھے۔ یہ سب چیزیں، یہ جواہر وحکم اور یہ قیمتی تاریخ ان کے ساتھ آسودۂ خاک ہوئی۔ آج آپ کا مسکراتا ہوا وجود، شیروانی میں ملبوس شخصیت، نامۂ انکسار اور تبسم ریز گفتگو سب سے بڑھ کر آپ کا طرزِ تدریس اور قرآنی محاضرات رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ ڈاکٹر ابورافع کا کہنا ہے کہ دادا راقم کو بہت یاد کرتے تھے، اس کی خامہ فرسائیاں انھیں بھلی لگتی تھیں۔ یہ تو اس کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ یہ ذکر جمیل ایک ایسی سعادت اور ایک ایسا اعزاز ہے جس کے بالمقابل تمام اعزازات کہتر ہیں۔ تا حیات مولانا کو یاد کرتا رہوں گا اور ان کے نامۂ انکسار کو ہمیشہ اپنی راہوں میں فروزاں رکھوں گا۔

ایک ہنگامہ ہے بیاباں میں
کوئی آمادۂ سفر تو نہیں

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

فروری، سن ۲۰۲۰ کی ۲۵ر تاریخ تھی، منگل کا دن تھا، دوپہر کا وقت تھا، ایک بج کر ۱۰ منٹ پر ایک ہفتے کی علالت کے بعد ہمارے بزرگ استاذ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اپنے ہزاروں شاگردوں اور بے شمار عقیدت مندوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے رب کریم سے جا ملے۔

مولانا اصلاحیؒ کی خبر مرگ ان کے تمام ہی جاننے والوں میں، خواہ وہ عوام ہوں یا خواص، بڑے رنج وغم سے سنی گئی۔ ان کی رحلت سے مدرسۃ الاصلاح اپنے ایک نہایت ہونہار فرزند سے محروم ہو گیا، ہندوستان کی تحریک اسلامی اپنے ایک نہایت مخلص اور سرگرم کارکن سے محروم ہو گئی۔

ہمیں امید ہے مولانا اصلاحیؒ اس وقت اپنے رب کے جوارِ رحمت میں ہوں گے، اس کی بے پناہ نوازشوں سے شادکام ہو رہے ہوں گے اور ملائکۂ قدس ان کی تکریم وضیافت میں مصروف ہوں گے۔

مولانا اصلاحیؒ ایک وضع دار اور با اصول انسان تھے، وضع داری اور اصول پسندی ان کی پہچان تھی، مگر خاص بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی بے ضرر، اور مرنجاں مرنج طبیعت کے انسان تھے، ہر ایک کو خوش رکھنا، اور خوش دیکھنا ان کا مزاج تھا۔ وہ نہایت رقیق القلب تھے، کسی کی پریشانی ان سے دیکھی نہ جاتی، خاص طور سے کمزوروں اور ضرورت مندوں پر تو وہ بہت ہی مہربان ہوتے۔

وہ بڑی پیاری اور جاں نواز شخصیت کے مالک تھے، ان کے چاہنے والے بے شمار تھے، ان کی زندگی بڑی سادہ اور صاف ستھری تھی۔ وہ بہت ہی خدا ترس اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ دوستوں کے جاں نثار اور دشمنوں کے قدرداں!

(اسوۂ صحابہ)، (اقبال کامل) اور (شعر الہند) کے مصنف مولانا عبدالسلام ندویؒ، جو صاحب (شعر العجم) اور صاحب (سیرۃ النبی) علامہ شبلی نعمانیؒ کے تلمیذ رشید تھے، وہ مولانا اصلاحیؒ کے سگے چچا تھے۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

مولانا اصلاحیؒ ان کی شفقتوں اور محبتوں کے سایے میں پلے بڑھے۔

وہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے خاص شاگردوں میں تھے، مولانا اصلاحیؒ اپنے بزرگ استاذ کو دل سے چاہتے تھے، اور عموماً طلبہ و اساتذہ کی ہر علمی مجلس میں کسی نہ کسی طور سے ان کا تذکرہ چھیڑ دیتے تھے۔

اپنے بزرگ استاذ کی طرح مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ بھی کتاب الٰہی کے عاشق تھے، وہ قرآنی علوم و معارف کے ساتھ ساتھ قرآنی اخلاق اور قرآنی کردار کے حامل تھے۔ ان کی اخلاقی سطح بہت بلند تھی، زندگانی ان کی تھی مہتاب سے تابندہ تر!

فطری طور سے وہ اپنے بزرگ استاذ کے عظیم مربی اور بزرگ رہنما امام حمید الدین فراہیؒ سے بھی بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ وہ ان کی کتابیں خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی پڑھاتے، اپنے طلبہ کو وہ خاص طور سے امام فراہیؒ کی تفاسیر بار بار پڑھنے، ان کا گہرا مطالعہ کرنے کا شوق دلاتے اور اس کی تاکید کرتے۔

وہ جہاں رہتے، فکر فراہی کے چراغ روشن کرتے، اور اس کی عظمت و اہمیت کے گن گاتے، فکر فراہی کی محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فکر فراہی کو، جو دراصل نظم قرآن، اور ربط آیات کی تلاش و دریافت کا دوسرا نام ہے، قرآنی علوم کی کلید، اور قرآنی معارف تک پہنچنے کا سب سے آسان اور بے خطر راستہ سمجھتے تھے۔

وہ جب کویت کے سفر پر گئے، تو وہاں بھی علمی حلقوں میں امام فراہیؒ کا چرچا کیا، اور وہاں کے ایک بڑے مکتبہ کو ان کی کتابیں اپنے ہاں سے شائع کرنے پر آمادہ کرلیا، چنانچہ وہاں سے (امعان فی اقسام القرآن) اور (الرأی الصحیح فیمن ہو الذبیح) کے نہایت خوب صورت ایڈیشن شائع ہوئے۔

وہ پہلی بار سنہ ۱۹۶۱ میں حج کے لیے گئے، تو مکۂ مکرمہ کے ایک عربی جریدے میں حج و قربانی کے سلسلے میں امام فراہیؒ کے نقطۂ نظر کا تعارف کرایا، اور رمی جمار کے تعلق سے امام فراہیؒ کی جو گراں قدر تحقیق ہے، اسے نہایت خوب صورت عربی میں دو قسطوں میں شائع کرایا۔

فکر فراہیؒ کے شارح و ترجمان ہونے کی ہی حیثیت سے وہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، اور ان کی خاص خاص کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کر رہے تھے۔ (دعوت دین اور اس کا طریق کار) اور (پردہ اور قرآن مجید) کے عربی ترجمے ہدایت پبلشرز۔ نئی دہلی سے کئی ماہ پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

اس وقت وہ مولانا امین احسنؒ اصلاحی کی مشہور کتاب (حقیقت شرک) کے ترجمے سے فارغ ہوئے تھے، اور (حقیقت توحید) کا ترجمہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، کہ رب کریم کے ہاں سے بلاوا آ گیا، اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ فکر فراہی کے زبردست مبلغ اور بہترین ترجمان تھے، وہ اس کی تبلیغ واشاعت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، وابستگان فکر فراہی ان کی کمی کو ہمیشہ محسوس کریں گے، اور ہر ہر موقع پر ان کے درمیان وہ یاد کیے جائیں گے۔ ع

جان کر من جملۂ خاصان مے خانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

آج سے تقریباً چالیس سال قبل مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب (**التفسير السياسي للإسلام**) کا تردیدی جواب اردو زبان میں مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے لکھا تھا، اس کا عربی ترجمہ بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے (**التفسير الحقيقي للإسلام**) کے نام سے کیا تھا، جو بہت پسند کیا گیا تھا۔

راقم الحروف جس زمانے میں مدرسۃ الاصلاح کا ایک ادنی طالب علم تھا، اس وقت مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ وہاں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، اور وہاں کے معزز اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

راقم الحروف کی یہ خوش نصیبی تھی کہ مدرسۃ الاصلاح پراسے مولانا اصلاحیؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے، اور ان کے جوئے علم سے سیراب ہونے کا کافی موقع ملا۔ مولانا سے دو سال قرآن پاک اور ادب عربی کا درس لیا۔

اس کے بعد ناگہانی طور پر مدرسۃ الاصلاح میں ایک ناخوشگوار انقلاب آ گیا، اور بیک وقت چار معزز اساتذہ وہاں سے سبک دوش کر دیے گئے، ان چاروں ساتذہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا نام نامی بھی شامل تھا۔ یہ مارچ سنہ ۱۹۶۱ کا واقعہ ہے۔

یہاں اس انقلاب کے اسباب، اور ان اسباب کی معقولیت یا نامعقولیت سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ جو چیز یہاں قابل ذکر ہے، وہ بس یہ کہ یہ حادثہ گو مولانا اصلاحیؒ اور ان کے ساتھیوں کے لیے نہایت سنگین حادثہ تھا، مگر ان کی طرف سے اس موقع پر کوئی منفی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ ان کی طرف سے جو چیز سامنے آئی وہ بڑی ہی عجیب وغریب تھی، جو ان کے عظمت کردار کی آئینہ دار تھی۔

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

مدرسہ کی تعطیل کلاں کے دوران میں یہ آپریشن ہوا، تعطیل ختم ہوئی، اور مدرسہ کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا، تو مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اوران کے رفیق کار مولانا صغیراحسن اصلاحیؒ کی طرف سے ناظم مدرسہ کے نام کچھ اس انداز کی تحریر موصول ہوئی، کہ مادر علمی کی خدمت کو ہم اپنے لیے موجب شرف اور باعث سعادت سمجھتے ہیں، اوراس سے ہر صورت میں وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم لوگ تعلیم وتدریس کے لائق نہ ہوں، تو مدرسہ کے اندر ایک جاروب کش (جھاڑو دینے والا) کی حیثیت سے رہنے، اور وہاں صفائی ستھرائی کے فرائض انجام دینے میں بھی ہمیں کوئی عار نہیں ہوگا!

مولانا صغیراحسن اصلاحیؒ بھی ان چاروں سواروں میں سے تھے، جو اس آپریشن کا نشانہ بنے تھے۔ بروقت ان دونوں بزرگوں کی تحریریں ہمارے سامنے نہیں ہیں، لیکن ان کا مضمون ذہن پر نقش ہے، جو موقع موقع سے یاد آجایا کرتا ہے۔ ع

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی!

علمائے صالحین ومخلصین کی یہ دل کش کہکشاں تھی، جو منتشر ہوئی، تو مدرسۃ الاصلاح کی فضا سونی سونی ہوگئی، اور پھر وہاں کے ماحول میں وہ دل کشی دوبارہ نہیں آسکی۔ اس وقت بہت سے طلبہ وہاں سے واپس چلے گئے، راقم الحروف کا بھی تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا۔

مولانا اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح سے سبک دوش ہونے کے بعد کچھ مہینے مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے ساتھ رہے، مولانا ندویؒ اس وقت تک جماعت اسلامی ہند کے رکن تھے، اور اعظم گڑھ شہر میں جامعۃ الرشاد کے نام سے ایک عربی ادارہ چلا رہے تھے۔

پھر قصبۂ بلریا گنج۔ اعظم گڑھ میں جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آگیا، اور وہاں والوں کے اصرار پر مولانا اصلاحیؒ جامعۃ الفلاح آگئے۔

جامعۃ الفلاح ابھی نیا نیا قائم ہوا تھا، وہ ابھی ایک چھوٹے سے مدرسے کے روپ میں تھا۔ مولانا اصلاحیؒ اک نئے ولولے کے ساتھ وہاں کی چھوٹی سی ٹیم میں شامل ہوگئے، اوراسے ترقی دینے، اوراسے اسم با مسمی بنانے کے لیے جی جان سے لگ گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ چند سالوں کے اندر جامعۃ الفلاح اس مقام پر پہنچ گیا، کہ (ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینار فلاح) کے دل کش ترانے وہاں کی فضاؤں میں گونجنے لگے۔ اور

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

تشنگان علم کے قافلے ملک کے کونے کونے سے وہاں آنے شروع ہوگئے۔

مولانا اصلاحی جامعۃ الفلاح آئے تو اپنے ساتھی مولانا صغیراحسن اصلاحیؒ کو بھی وہیں بلا لیا، کچھ دنوں بعد مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا شہباز اصلاحیؒ کو بھی بلا لیا، پھر کچھ عرصے کے بعد مولانا ابوبکرؒ اصلاحی، مولانا داؤدؒ اکبر اصلاحی، اور مولانا نظام الدین اصلاحی بھی آ گئے۔ اور بھی اہل علم موقع بموقع آتے رہے، رفتہ رفتہ وہ محفل مہ وانجم پھر سے آراستہ ہوگئی، جو چند سالوں پہلے مدرسۃ الاصلاح میں درہم برہم ہوگئی تھی، اور جس کے درہم برہم ہو جانے کا ہر صاحب دل کو قلق تھا۔

یہ رب کریم کا فضل واحسان تھا، اور مولانا اصلاحیؒ کی ذرہ نوازی، کہ اس موقع پر جامعۃ الفلاح میں تدریس کے لیے انہوں نے اپنے اس تلمیذ ناچیز کو بھی یاد کیا، جو اب تک طالب علمی کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میں اس وقت اپنے والدین کے ساتھ ضلع رام پور میں رہائش پذیر تھا، اور وہاں کے ایک معروف تعلیمی ادارہ (جامعۃ المعارف) میں دورۂ حدیث کا کورس کر رہا تھا۔

میں نے مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دورۂ حدیث کی مصروفیت کا حوالہ دیا، اور جامعۃ الفلاح آنے سے معذوری ظاہر کی، مولانا نے نہایت فراخ دلی سے میری معذرت قبول کر لی۔ اور میری اس نافرمانی یا حکم عدولی کا برا نہیں مانا۔

ایک سال گزر گیا، میں نے دورۂ حدیث کی تکمیل کر لی۔ اور جامعۃ الفلاح سے مولانا اصلاحیؒ کا مکتوب دوبارہ آ پہنچا کہ ہم ابھی بھی تمہارا انتظار کر رہے ہیں، یہاں تمہاری ضرورت ہے، جلد سے جلد آنے کی کوشش کرو۔

تلمیذ ناچیز نے استاذ گرامی کے اس حکم کو خدائی انتظام سمجھا، چند ہی دنوں بعد وہ جامعۃ الفلاح آ گیا، اور رب کریم کی مہربانی اور استاذ گرامی کی ذرہ نوازی سے اس قافلۂ علم میں شامل ہوگیا۔

ہمارے جامعۃ الفلاح آنے سے جامعہ کا کتنا فائدہ ہوا، اس کا فیصلہ تو طلبۂ جامعہ اور ذمے داران جامعہ کریں گے، البتہ خود ہمارے لیے یہاں کا قیام بہت مبارک ثابت ہوا، یہاں بزرگ اساتذہ، خاص طور سے مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا شہباز اصلاحیؒ کی رہ نمائی وسر پرستی میں ہمیں بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔

شروع میں چند سالوں تک تو میں حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھاتا رہا، پھر ایک روز میں نے استاذ گرامی مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ سے درخواست کی کہ مجھے قرآن پاک پر تیاری کرنی ہے، اگر آپ مجھے پڑھانے کے

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

لیےقرآن پاک کے بھی کچھ پیریڈ دے دیں، تو اس سے مجھے حوصلہ ملے گا، اور میں محنت اور لگن کے ساتھ قرآن پاک پر تیاری کرسکوں گا۔

اس وقت درجۂ سوم عربی، اور درجۂ چہارم عربی میں قرآن پاک مولانا عبدالحسیبؒ پڑھاتے تھے، اور اس سے آگے کے درجات میں مولانا جلیل احسن ندویؒ پڑھاتے تھے۔

میری اس درخواست کا سیدھا مطلب یہ تھا، کہ مولانا اصلاحیؒ درجۂ سوم عربی کا قرآن پاک ہمیں دے دیں، جسے وہ برسہابرس سے پڑھاتے آئے تھے، اور اس کی گھنٹیوں سے دست بردار ہو جائیں!

ظاہر ہے یہ درخواست ان کے لیے بڑی کٹھن تھی، اور میں نے بہت ڈرتے ڈرتے یہ درخواست کی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ مولانا اصلاحیؒ میری یہ درخواست قبول کرسکیں گے، اور میرے لیے اتنا بڑا ایثار کرسکیں گے، مگر میرا اندازہ غلط نکلا، مولانا اس وقت میری توقع سے بہت زیادہ بلند نظر آئے۔ چند لمحے وہ خاموش رہے، پھر فرمایا:

''مجھے خوشی ہے کہ آپ قرآن پاک پر تیاری کرنی چاہتے ہیں، اس کے لیے میری طرف سے ہرطرح کا تعاون آپ کو حاصل رہے گا۔''

انہوں نے نہایت خوشی سے درجۂ عربی سوم کا قرآن پاک ہمیں پڑھانے کے لیے دے دیا۔

یہ میری زندگی کا تاریخی لمحہ تھا، یہیں سے میرے علمی سفر کا رخ متعین ہوگیا۔ اور میں ہمہ تن قرآن پاک پر غور وتحقیق، اور کلام الٰہی پر ریسرچ کے لیے یکسو ہوگیا۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے میری زندگی کا محور، اور میرے غور وفکر کا مرکز قرآن پاک بن گیا۔

اس وقت جامعۃ الفلاح میں مولانا جلیل احسن ندویؒ، اور مولانا شہباز اصلاحیؒ موجود تھے۔ یہ دونوں بزرگ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے نہایت ہونہار اور صاحب نظر تلامذہ تھے، ان کی موجودگی سے ہم نے پورا فائدہ اٹھایا، ان سے ہمیں مطالعۂ قرآن اور تدبر قرآن میں بڑی مدد ملی، ان دونوں بزرگوں نے ہماری طاقت پرواز، اور جوش عمل میں کئی گنا اضافہ کردیا۔

یہ رب کریم کا کتنا زبردست فضل واحسان ہے کہ استاذ گرامی مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے دل میں اس نے میرے لیے بےلوث محبت ڈال دی، اس طرح ان کی شفقتیں شروع سے ہمارے شامل حال رہیں، ان کی شفقتوں نے میری زندگی کا سفر بہت آسان اور روشن کردیا۔ مجھے اپنی شخصیت کی ترقی، یا اپنے مستقبل کی تعمیر

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

کے لیے ادھر ادھر بھٹکنا نہیں پڑا، اور زندگی کا کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگیا۔ مولانا اصلاحیؒ نے اسی طرح نہ جانے کتنوں کی دست گیری کی، اور نہ جانے کتنوں کی زندگیاں بنا اور سنوار دیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا اصلاحیؒ کی قبر ٹھنڈی رکھے، انہیں کروٹ کروٹ جنت دے، اور آخرت میں انہیں صالحین اور صدیقین کی رفاقت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

مولانا اصلاحیؒ نے جامعۃ الفلاح کی صرف تعلیمی اور تربیتی ترقی میں ہی حصہ نہیں لیا، وہاں کی تعمیراتی ترقی میں بھی ان کا زبردست رول رہا۔ جامعۃ الفلاح کی وسیع وعریض عالی شان مسجد سرتاسر انہی کی جاں فشانیوں کا نتیجہ ہے، جس کے گنبد و مینار آج اپنے اس عظیم معمار کے غم میں سوگوار نظر آتے ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ نے اس مسجد کی تعمیر میں اپنی ساری قوت نچوڑ دی، بڑا بجٹ تھا، اس بھاری بھرکم سرمایہ کی فراہمی کے لیے ملک اور بیرون ملک کا سفر کیا، تعمیر کے دوران مزدوروں کے ساتھ مزدور بن کر کام کیا، اور طلبہ اور اساتذہ کو بھی اس کام میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔

جامعۃ الفلاح میں مولانا اصلاحیؒ کی حیثیت محض ایک استاذ کی نہیں تھی، وہ اس کے فاؤنڈر بھی تھے، ڈائرکٹر بھی تھے، منیجر بھی تھے، پرنسپل بھی تھے۔ وہ مکمل معنوں میں اس کے معمار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مخلصین کی ایک بڑی ٹیم ان کے ساتھ تھی، جو جامعۃ الفلاح کی تعمیر و ترقی میں سرگرم عمل تھی، لیکن مولانا اصلاحیؒ ان کے درمیان سب سے زیادہ سرگرم، اور سب سے زیادہ نمایاں تھے۔

اسی شان سے مولانا نے عمر عزیز کے چالیس سال جامعۃ الفلاح کی خدمت میں گزار دیے، یہاں تک کہ ریٹائرمنٹ کی عمر میں داخل ہوگئے، اور عام ضابطہ کے مطابق ۲۰۰۴ میں وہاں سے ریٹائر کردیے گئے۔

مولانا نے لاکھ چاہا کہ فیصلے پر نظر ثانی کی جائے، لیکن ان کی ایک نہیں سنی گئی، مسجد کے گنبد و مینار، اور جامعۃ الفلاح کے تمام شجر و حجر ان کے حق میں سفارش کررہے تھے، لیکن ذمے داروں کے کان بند رہے، اور مولانا اصلاحیؒ اپنا کلیجہ مسوس کے رہ گئے!

بہت دنوں تک ان کے آنسو تھم نہیں رہے تھے، شدت غم سے وہ جامعہ سے اپنی کتابیں لینے بھی نہیں آئے، گاؤں سے دو آدمیوں کو بھیج دیا، وہ ان کا سامان لے کر چلے گئے۔ قدیم طلبۂ جامعہ جب جب جامعۃ الفلاح آتے تو ان سے ملنے کے لیے ان کے گاؤں علاؤالدین پٹی جاتے، اور وہاں سے بھیگی ہوئی آنکھوں

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

کے ساتھ واپس آتے۔

کافی دنوں مولانا ماہی بے آب کی طرح اپنے گاؤں میں پڑے رہے، یہاں تک کہ کافی کمزور ہوگئے، بالآخر کچھ لوگوں کی خواہش پر قریب کے ایک گاؤں بندول میں بچیوں کے ایک مدرسہ میں پڑھانے لگے، اس طرح وقت کاٹنے اور دل بہلانے کی ایک صورت نکال لی، مگر اس سے کیا دل بہلتا، مولانا کا ہنستا مسکراتا، باغ و بہار چہرہ اب بالکل بجھ چکا تھا، مولانا کے چاہنے والوں کے لیے یہ بڑی دردانگیز صورت حال تھی! وہاں کا پورا ماحول بزبان حال یہ کہہ رہا تھا: ع

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے!
اے کما ل افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے!

ریٹائرڈ ہوجانے کے بعد مولانا تقریبا پندرہ سال حیات رہے۔ یہ پندرہ سال کتنے قیمتی تھے، جو یونہی گزر گئے۔ اگر یہ پندرہ سال جامعۃ الفلاح میں رہتے ہوئے گزرتے، تو جامعۃ الفلاح اور اس کے طلبہ کے حق میں کس قدر موجب خیر و برکت ہوتے، اور جامعۃ الفلاح پر شاید وہ خزاں طاری نہ ہوتی، جس کا مشاہدہ ادھر برسوں سے کیا جارہا ہے! ع

پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیوں کر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

بزرگ اساتذہ کسی بھی ادارے کے لیے اک متاع بے بہا ہوتے ہیں۔ وہ چاہے اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریسی گھنٹیوں کا نصاب پورا نہ کرسکیں، لیکن ادارے کے اندران کے رہنے سے ادارے کا وقار بڑھتا ہے، اور خود طلبہ و اساتذہ کو ان سے حوصلہ ملتا ہے، اور وہ کچھ ملتا ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اور اگر ایسے اساتذہ ہوں جنہوں نے ادارے کی ترقی کے لیے اپنے آپ کو مٹادیا ہو، اور وہاں کے درودیوار، اور گنبد و محراب میں ان کا خون پسینہ شامل ہو، تو ایسے اساتذہ ہمیشہ سرآنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں، اور اگر کوئی ادارہ ان کی ناقدری کرتا ہے، تو اس کا خمیازہ نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے!

اس حیثیت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنے بزرگ اساتذہ کو ہمیشہ عزت دی ہے۔ مفتی ظہور ندویؒ جن کا ابھی چند ہی ماہ پہلے انتقال ہوا ہے، جب اپنی کمزوری اور پیرانہ سالی کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے، تو وہ ریٹائر نہیں کیے گئے۔ وہ اپنے منصب پر برقرار رہے، اور وہیل چیر

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے!

پر ادھر سے ادھر لے جائے جاتے رہے۔ بلکہ اسی معذوری کے زمانے میں انہیں مہتمم سے ترقی دے کر نائب ناظم بنادیا گیا۔ اور وہ تادم واپسیں ندوے سے وابستہ رہے، اور اپنے عہدے پر برقرار رہے، یہاں تک کہ وہیں سپرد خاک ہوئے۔

ہمارے بزرگ استاذ مولانا شہباز اصلاحیؒ کو بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بڑی عزت دی، وہ کافی بوڑھے ہوگئے تھے، اور ہارٹ کے مریض بھی ہوگئے تھے، دہلی میں ان کے ہارٹ کا آپریشن ہوا تو ندوے نے ان کے علاج معالجے کا پورا خرچ برداشت کیا، جو بہت زیادہ تھا، پھر صحت یاب ہوکر وہ آخر تک وہیں پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ وہیں سپرد خاک کیے گئے۔

یہ ایک دردانگیز سانحہ ہے کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ جامعۃ الفلاح کی طرف سے جس قدر و منزلت کے مستحق تھے، اس کا عشر عشیر بھی وہ نہ پا سکے، جس طرح مولانا احتشام الدین اصلاحیؒ، اور مولانا ایوب اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے جس قدر و منزلت کے مستحق تھے، اس سے یکسر محروم رہے، ہمیں امید ہے دنیا میں ان بزرگوں کی جتنی حق تلفی، اور جتنی دل آزاری ہوئی ہے، رب کریم کے ہاں اتنی ہی ان کی عزت افزائی ہوگی۔

ابھی ہم مولانا احتشام الدین اصلاحیؒ، مولانا ایوب اصلاحیؒ، اور مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کے غموں سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ مولانا اصلاحیؒ اک تازہ زخم دے کر چلے گئے! ع

خاموش ہوگئے چمنستاں کے رازدار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رورہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

مولانا اصلاحیؒ نے اگست ۱۹۲۸ میں اس دنیا میں قدم رکھا، اور ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ کو عمر کی (۹۲) بہاریں گزار کر اپنے رب سے جا ملے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

مولانا عبدالحسیب اصلاحی علیہ الرحمۃ

چندیادیں، چندباتیں

مولانا محمد طاہر مدنی

۵رفروری ۲۰۲۰ء سے ۱۸رمئی ۲۰۲۰ءتک زنداں کی سیر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بلریا گنج میں ۴رفروری ۲۰۲۰ءکوخواتین پُرامن دھرنے پرتھیں، یہ احتجاج CAA، NRCاورNPR کے خلاف تھا۔ملک کے مختلف مقامات پراس طرح کے پُرامن احتجاج ہورہے تھے۔لیکن حکمراں جماعت کی زیرِاقتدار ریاستوں میں پُرامن مظاہرین کوظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیااوران پرفرضی مقدمات لاددیے گئے اورزنداں کے حوالے کر دیا گیا۔یہی داستان یہاں بھی دہرائی گئی اورخواتین پرتشدد کیا گیااورطاقت کے بل پران کے پُرامن احتجاج کو ختم کردیا گیا۔پولیس ایکشن کے دوران متعددافرادکوحراست میں لے لیا گیااورسنگین دفعات لگا کرجیل بھیج دیا گیا۔ایک خاتون سمیت کل ۲۰رافراد کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔

اس دوران جب کہ میں درس گاہِ زنداں میں تھا، متعددمشہورہستیاں داغِ مفارقت دے گئیں: مولانا عبدالحسیب اصلاحی، ڈاکٹرابراراعظمی اور جناب عبدالعلی خاں۔ان سب حضرات کاتعلق ہمارےضلع اعظم گڑھ ہی سے ہےاوران سےمیرے بہت قریبی تعلقات تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی مرحوم میرے عزیز تھے۔ میرا ننہال موضع علاؤالدین پٹی میں آپ کے خاندان ہی میں ہے۔ان کی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ایک لحاظ سے وہ میرے نانا اور دوسرے پہلو سے خالو لگتے تھے۔بچپن سے ان کو دیکھا اورسنا تھا۔عام طور پرشیروانی زیب تن کرتے تھےاور بہت وضع دار تھے۔گفتگو بہت شیریں تھی، فارسی آمیزاُردوبولتے تھے۔تفسیراورادبِ عربی ان کا خاص مضمون تھا۔مولانااختر احسن اصلاحی علیہ الرحمہ جیسے شیدائے قرآن سے انہیں استفادے کا موقع نصیب ہوا تھا۔مولانا نظام الدین اصلاحی حفظہ اللہ، والدِمحترم مولانا صغیراحسن اصلاحی مرحوم اورمولانا عبدالحسیب اصلاحی مرحوم مدرسۃ الاصلاح میں ہم عصر تھے،ان کا زمانۂ فراغت ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ءاور۱۹۴۹ءہے۔

اُس وقت مدرسۃ الاصلاح کی فضاؤں میں جماعتِ اسلامی کا غلغلہ تھا، مولانا اختر احسن اصلاحی علیہ الرحمہ جماعت کی مرکزی شوریٰ کے رکن تھے۔ یہ تینوں حضرات اپنے شفیق استاد کی زیرسرپرستی تحریکِ اسلامی کے کارواں میں شامل ہوگئے اور دعوت کے فروغ کے لیے اپنی توانائیاں لگا دیں۔ فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح ہی میں مدرّس ہوگئے۔ کچھ عرصے کے لیے مرحوم نے علی گڑھ کے ایک تعلیمی ادارے میں بھی تدریسی خدمت انجام دی تھی۔ مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم کے زمانۂ نظامت میں جب جماعت سے وابستہ افراد کو مدرسۃ الاصلاح سے الگ کیا گیا تو مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب جماعت کی ہمہ وقتی خدمت کے لیے یکسو ہوگئے اور باقی دو حضرات جامعۃ الفلاح تشریف لائے اور اس ادارے کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ میں انتظامی صلاحیت بھی اچھی تھی، جامعہ میں وقفے وقفے سے کئی بار صدر مدرّس رہے اور مہتمم تعلیم و تربیت کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دی۔

۱۹۷۰ء میں جب میں گاؤں کے مکتب سے پڑھنے کے بعد جامعہ آیا اور درجہ پنجم ابتدائی میں داخلہ لیا تو مولانا صدر مدرّس تھے۔ اُس زمانے میں مولانا جامعہ کی مسجد کی تعمیر کے کام میں لگے ہوئے تھے، اس کے لیے بیرونِ ملک دورہ بھی کیا۔ ۱۹۷۳ء میں اس پُرشکوہ مسجد کا افتتاح ہوا، بعد میں توسیع کا کام بھی ہوا۔

مولانا صبح میں اپنے گاؤں سے پیدل جامعہ آتے تھے اور عصر کی نماز کے بعد واپس جاتے تھے۔ یہ صبح وشام کی پیدل آمدورفت ان کی صحت کے لیے بھی مفید تھی۔ تاہم دارالاقامہ میں قیام نہ کرنے کی وجہ سے بورڈر طلبہ خصوصی استفادے سے محروم رہتے تھے۔

ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ایک خوشی کا موقع اُس وقت آیا جب کئی لڑکیوں کے بعد مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اولادِ نرینہ سے نوازا اور پورے جامعہ میں شیرینی تقسیم ہوئی۔

مجھے براہِ راست مولانا سے استفادے کا موقع نہیں ملا، کیوں کہ عربی دوم کے بعد میں مدرسۃ الاصلاح منتقل ہوگیا تھا۔ اگست ۱۹۸۳ء میں جب میں مدینہ منورہ سے واپس آیا اور جامعہ میں تدریسی خدمت انجام دینے لگا، تو مولانا ہی صدر مدرّس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جب جامعہ میں مہتمم تعلیم و تربیت کا منصب قائم ہوا تو پہلے مہتمم تعلیم و تربیت کی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۹۶ء سے ۱۹۹۸ء تک اپنی ذمہ داری نبھائی۔

طویل عرصے تک جامعہ کی خدمت انجام دینے کے بعد ریٹائرمنٹ کا مرحلہ آیا۔ جامعہ میں ریٹائرمنٹ کی عمر

۶۰ برس ہے۔ اس کے بعد توسیع کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ۷۰ برس کی عمر تک مولانا کو سالانہ توسیع ملتی رہی۔

اوصافِ نمایاں

۱- سادگی: مولانا کے اندر بہت سادگی تھی، تکلف اور تصنع سے دور تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں اسراف وتبذیر سے بہت دور تھے۔

۲- اپنا کام بہ دستِ خود انجام دیتے تھے۔ اپنے کمرے سے لوٹا لے کر پانی لینے کے لیے نکلتے تھے تو ہاتھ سے لوٹا لینا طلبہ کے لیے بہت مشکل تھا۔ اسٹوپ پر خود ہی چائے بناتے تھے اور چائے کا ذوق بہت نفیس تھا۔

۳- معیارِ گفتگو: زبان کا معیار بہت اچھا تھا۔ عربی اور فارسی پر بھی عبور تھا، اس لیے اُردو بھی بڑی دلکش تھی، لیکن بعض دفعہ ایسی تراکیب استعمال کرتے کہ عام لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر جاتیں۔

۴- مہمان نوازی: مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتے۔ مہمان داری تو ہمارے ننہالی خاندان کا بڑا خاصہ ہے۔

۵- صبر: مولانا بہت صابر وشاکر تھے۔ کئی بچیوں کے بعد اللہ نے اولادِ نرینہ سے نوازا تھا، لیکن سوئے اتفاق بیٹا پولیو کا شکار ہوگیا۔ بڑے صبر کے ساتھ برسہا برس اس کا علاج کراتے رہے۔ اسے لے کر لکھنؤ جاتے تھے، وہیں ایک ڈاکٹر کا علاج برسوں چلتا رہا۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔

۶- شفقت: طلبہ کے ساتھ مولانا کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ دستِ شفقت سے طلبہ کو دلاسہ دیتے، بیمار کی مزاج پرسی کرتے اور پریشان حال کی پریشانی دور کرتے۔ خاص طور سے دور دراز سے آئے طلبہ جو دارالاقامہ میں مقیم تھے، وہ ان کی ذات میں پدرانہ شفقت محسوس کرتے تھے۔

۷- نرم خوئی: مولانا بہت نرم خو تھے، لیکن جہاں نظم وضبط کا تقاضا ہو وہاں سختی بھی کرتے تھے، کیونکہ انتظامی امور میں بسا اوقات سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

۸- وضع داری: نشست وبرخواست، گفتگو اور لباس وغیرہ کے معاملے میں مولانا بہت وضع دار تھے۔ ہمیشہ گفتگو بہت شستہ اور معیاری ہوتی، دیہاتی زبان کا استعمال کبھی نہیں کرتے۔ بالعموم شیروانی پہنتے تھے۔ ہر چیز میں سلیقہ مندی اور قرینہ تھا۔

۹- پابندیٔ وقت: وقت کے بہت پابند تھے، اور طلبہ واساتذہ کو بھی پابند بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈھائی کلومیٹر پیدل چل کر آتے تھے، لیکن وقت پر جامعہ پہنچتے تھے۔

۱۰- تواضع: ممتاز عالمِ دین ہونے کے باوجود گاؤں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے تھے اور لوگ بے تکلفی سے ان سے بات کرتے تھے اور اپنی مشکلات میں رہ نمائی حاصل کرتے تھے۔

۱۱- دور اندیشی: مولانا نے جب مسجدِ جامعہ کی تعمیر کا خاکہ بنایا اور اس پر کام شروع ہوا تو یہ اعتراض ہوا کہ اتنی بڑی مسجد کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ مولانا کا منصوبہ درست تھا، مستقبل نظر میں تھا۔ بعد میں تو اس میں بھی توسیع کی ضرورت پڑی۔

علمی کام اور اندازِ درس وتدریس

مولانا کو ادبِ عربی سے خاص لگاؤ تھا، انشا اور عربی گفتگو پر دسترس تھی، جب کہ عام طور سے پرانے اصلاحیوں میں یہ بات مفقود تھی۔ ہمارے والدِ محترم پہلی بار جب ۱۹۶۱ء میں حج پر گئے تھے تو حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم، حاجی منیر احمد مرحوم اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی رفاقت تھی۔ والد صاحب بیان کرتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں دورانِ قیام ہمارے درمیان تقسیمِ کار کچھ اس طرح تھی: مولانا عربی بولتے تھے اس لیے سودا سلف لانا ان کے ذمے تھا، حکیم ایوب صاحب سبزی وغیرہ کاٹ دیتے تھے، حاجی منیر احمد صاحب طباخی کا فرض انجام دیتے اور والد صاحب کے ذمے ''دعا'' کا فریضہ تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب ''دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار'' کا عربی ترجمہ مولانا نے کیا۔ ''أحكام الحجاب في القرآن '' بھی ایک مترجم کتابچہ ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کی کتاب ''عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کا جائزہ مولانا سید عروج احمد قادری علیہ الرحمہ نے لیا تھا، اس کا عربی ترجمہ مولانا نے کیا جو ابتدا میں ''الدعوۃ'' میں شائع ہوا اور بعد میں ''التفسير الحقيقي للإسلام'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس نام کی وجہ یہ تھی کہ مولانا ندوی کی مذکورہ کتاب کا عربی ترجمہ ''التفسير السياسي للإسلام'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

مولانا فکرِ فراہی کے علم بردار اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر ''تدبّرِ قرآن'' کے بڑے شیدائی تھے، یہاں تک کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اسے حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ درس میں زیادہ سوالات کو پسند نہیں کرتے تھے، بسا اوقات بہت ناراض ہو جاتے تھے، حالانکہ مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کے طریقۂ تدریس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ کو سوالات کی پوری آزادی ہوتی ہے اور اساتذہ اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اس نیک عادت کی وجہ سے ہمارے بچے جب دوسرے مدارس میں داخلہ لیتے ہیں اور بے تکلف سوالات

کرتے ہیں تو انہیں گستاخ قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں تو اتنی آزادی ہے کہ ایک بار مولانا صدر مدرّس تھے اور ایک کلاس کے طلبہ نے ان کو درخواست دی کہ فلاں کتاب ہم آپ سے نہیں پڑھنا چاہتے، کسی دوسرے استاد کے حوالے کر دیں۔ مولانا نے اس کا برا نہیں مانا۔

مولانا کی عربی لکھنے کی صلاحیت بہت اچھی تھی، اگر درس وتدریس سے سبک دوشی کے بعد انہوں نے یکسوئی کے ساتھ اس پر توجہ دی ہوتی تو اُردو کی متعدد اہم کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ہوتا۔ مولانا اس معنی میں بڑا تکلف کرتے تھے۔ ان سے درس، خطبہ، تذکیر وغیرہ کی درخواست کی جاتی تو بالعموم معذرت کر دیتے تھے اور ان کا مشہور جملہ تھا: ''نہیں بچہ، نہیں بچہ''۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی علیہ الرحمہ بیش قیمت علمی، تحریکی اور تربیتی روایات کے امین تھے اور بڑی تعداد میں شاگردوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں جو اُن کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔

●●

يٰآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اصْبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَاتَّقُواْ اللّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُون.

(آل عمران: ۲۰۰)

'اے ایمان والو! صبر کرو اور ثبات قدمی میں دوسروں سے بازی لے جاؤ۔ آپس میں جڑے رہو، اللہ سے ڈرتے رہو۔ کام یاب ہو جاؤ گے۔'

آہ! میرے استاد ومربی

مولانا محمد عمران فلاحی

خطۂ اعظم گڑھ کی نمایاں علمی شخصیات میں ایک معروف نام مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا ہے۔ آپ کا تعلق ضلع اعظم گڑھ کے ایک قدیم گاؤں علاؤالدین پٹی سے ہے۔ آپ بیک وقت علم وتحقیق اور تحریک کے کئی اداروں سے وابستہ رہے، جن میں مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الرشاد، جامعۃ الفلاح اور جماعت اسلامی ہند قابل ذکر ہیں۔ آپ نہایت ہی سادہ اور نیک دل عالم واستاذ تھے۔ اگر سادہ مزاجی، حلم وبردباری، مستقل مزاجی، تقویٰ وصلہ رحمی، عفو ودرگزر جیسے رنگوں کو کینوس پر بکھیرا جائے تو مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کی شخصیت ابھر کر سامنے آئے گی۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی علاؤالدین پٹی کے ایک زمین دار گھرانے کے چشم وچراغ تھے، مگر جامعۃ الفلاح میں اساتذہ وطلبہ کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ طلبہ سے کبھی اپنا نجی کام نہیں کرواتے۔ چائے وغیرہ کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی تو گھڑا لے کر جاتے اور نل سے بھر کر خود اٹھا کر اپنے کمرے تک لے آتے۔ طلبہ زبردستی کرتے کہ ہم پانی پہنچا دیتے ہیں لیکن آپ طلبہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھرپور خیال رکھتے۔ مخرب الاخلاق لٹریچر کے مطالعہ سے روکنے اور وقتاً فوقتاً طلبہ کے کلاس جانے کے بعد ان کے کمروں اور بستروں کی ہم لوگوں سے تلاشی کرواتے اور جو بھی غیر مناسب لٹریچر یا رسالے ملتے ان کو ضبط کروا دیتے۔

بورڈر طلبہ کے کھانے کی کبھی کبھی نگرانی کرتے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مودودی ہاسٹل کے ہال کے برآمدے میں طلبہ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ ہمارے کلاس فیلو جناب مولانا ظفر احمد اثری (مقیم حال لندن) کے پلیٹ میں سبزی کے بجائے ہری مرچ کی چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی ظفر صاحب غصہ ہو گئے اور مولانا کی موجودگی میں پلیٹ کو باہر پھینک دیا۔ مولانا حیران ہو گئے کہ ایسا کیوں

ہوا؟ اصل صورت حال معلوم ہونے کے بعد آپ نے نہ ڈانٹا اور نہ کوئی سزا دی، بلکہ بہت ہی متاثر کن انداز میں سمجھایا کہ علم دین کے حصول میں قیام وطعام کی پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔ ذرا سی بات پر اتنا غصہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے اور دیگر طلبہ نے اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ تھا آپ کا انداز تربیت۔

مولانا چار مرتبہ صدر مدرس رہے۔ یہ تقریباً ۱۵؍سال پر محیط ہے۔ دستور بدلنے کے بعد صدر مدرس کی جگہ مہتمم تعلیم وتربیت کے عہدے کا تقرر ہوا تو ایک میقات تک مولانا مہتمم تعلیم وتربیت بھی رہے۔ آپ کی صدارت اور اہتمام کی کل مدت تقریباً ۱۹ سال رہی۔ اس دوران آپ نے اکثر مجھے اپنا نائب بنائے رکھا۔ اس مدت میں آپ نے جامعۃ الفلاح کو اتنی بلندی تک پہنچایا کہ اس کی شہرت اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک تک پھیل گئی اور داخلے کے لیے بعض ممالک سے درخواستیں بھی آنے لگیں لیکن احتیاط اور قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے ان سے معذرت کرنی پڑی۔ اندرون ملک کے ہر گوشے سے جوق در جوق متلاشیان علم سمٹنے لگے۔ بقول مولانا مودودیؒ جامعۃ الفلاح کو اپنی تنگ دامنی کی شکایت ہونے لگی۔ اچھے خاصے طلبہ کو واپس کرنا پڑا۔ بہت سے سرپرست حضرات یہاں تک کہنے لگے کہ ہمارا بچہ کمرہ کے بجائے برآمدے میں رہ لے گا، مگر جامعہ میں داخلہ کا شرف بخش دیں۔ ایسے طلبہ سے حسن البنا ہاسٹل کا پورا برآمدہ بھر جاتا اور اس وقت کی اصطلاح میں طلبہ اسے ویٹنگ روم سے تعبیر کرتے، چونکہ بہت سے طلبہ بقرعید میں گھر جاتے تو اپنی مجبوری کے تحت گھر پر ہی رک جاتے تو ان کی سیٹ پر برآمدے کے طلبہ کو جگہ دے دی جاتی۔ ہماری نگاہیں اس سنہرے دور کی پھر منتظر ہیں۔

مولانا کا اثر ورسوخ جامعہ کے باہر بھی تھا۔ اس کی صرف دو مثالیں اس موقعے پر پیش کروں گا:

۱۔ جامعہ میں جب بورڈنگ کا قیام عمل میں آیا تو بجلی کنکشن نہیں تھا، آج سے تقریباً ساٹھ سال قبل یہ مسئلہ حل کرنا بہت مشکل امر تھا، مگر آپ نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے زمانہ صدارت میں بغیر کسی رشوت کے بجلی کنکشن جامعہ میں لگوایا جس سے آج بھی طلبہ استفادہ کررہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ۲۔ ایسے ہی اسلامی مدارس کے لیے ریلوے کنسیشن فارم حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا، مگر آپ نے کوشش کرکے اس ناممکن کام کو ممکن بنایا اور اس کی منظوری کرواکر فارم حاصل کرلیا، جس سے طلبہ اس وقت سے لے کر آج تک ریلوے سے نصف کرایہ پر سفر کرتے ہیں۔

اس موقع پر ایک افسوس ناک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک موقر استاد نے ایک طالب علم کو امتحان حال میں نظم شکنی کرنے پر جسمانی سزا دے دی، جس سے اس کے ساتھی اور دیگر طلبہ نے دوسرے دن

اسٹرائک کردی۔ مولانا نے اساتذہ سے مشورے کے بعد احتجاج میں پیش پیش رہنے والے طلبہ کا جامعہ سے اخراج کردیا، مگر بعض حضرات ان طلبہ کی حمایت میں ہائی کورٹ تک پہنچ گئے اور ذمہ داران پر ایسا دباؤ بنایا کہ اخراج شدہ طلبہ کو واپس لینے کا فیصلہ کرلیا گیا اور اس کی اطلاع مولانا محترم کو کردی گئی۔ آپ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اوپر کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے ان کا اخراج واپس لے لیا۔ سبھی اساتذہ کے اندر بے چینی پھیل گئی، ناچیز سمیت کئی اساتذہ ایک کمرے میں بیٹھ کر رونے لگے اور بعد میں چند ایام کی چھٹی لے کر گھر چلے گئے۔ اس وقت سے جو تربیتی نظام متاثر ہوا وہ آج تک اپنی ڈگر پر نہیں آسکا۔

مولانا کا شمار اپنے وقت کے مایہ ناز عالموں میں ہوتا ہے۔ آپ نہایت سادہ اور عالم باعمل انسان تھے۔ قول وفعل میں تضاد نہ تھا۔ جو کہتے اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے۔ آپ بہت ہی باصلاحیت، تجربہ کار اور منجھے ہوئے استاد تھے۔ آپ نے مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے خوب فیض حاصل کیا جس کا ذکر اکثر باتوں کے دوران آجاتا تھا۔ چنانچہ انداز تدریس میں استاد کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی تھی، بلکہ اسی انداز سے قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ استاد کا نوٹ بھی مولانا کے پاس موجود تھا۔

مولانا کا طریقۂ تدریس بہت عمدہ تھا۔ آپ ترجمہ وتشریح کے دوران مسجع ومقفع الفاظ استعمال کرتے تھے۔ غیر درسی کتابوں اور اضافی مطالعات کے لیے طلبہ کو ترغیب دیتے رہتے تھے۔ مختلف موضوعات سے متعلق عمدہ وموزوں کتابوں کی طرف رہ نمائی کرتے تھے۔

مولانا قرآن مجید کے ایک اچھے استاد تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عربی سوم میں ہمارے قرآن کے استاذ رہے۔ آخر کی چند سورتیں چھوٹ گئیں اس کا احساس آج بھی ہوتا ہے کہ کاش وہ سورتیں بھی ہم لوگوں نے پڑھ لی ہوتیں لیکن نصاب کی تکمیل نہ ہوسکی۔ اس وجہ سے مطالعہ جب بھی ہوتا ہے اس کا افسوس ہوتا ہے کہ چند سورتیں ہم ان سے نہ پڑھ سکے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم جامعۃ الفلاح جو کہ اس زمانے میں مکتب تھا میں ہوئی۔ پھر آپ نے مدرسۃ الاصلاح سے سند فراغت حاصل کیا اور فراغت کے بعد وہیں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ چند ماہ بطور استاد آپ نے جامعۃ الرشاد میں بھی گزارے۔ زیادہ تر عرصہ جامعۃ الفلاح میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ فلاح سے ریٹائرمنٹ کے بعد بندول کے ایک عربی مدرسہ میں اخیر عمر تک بطور استاد فائز رہے۔

جب ہم لوگ درجۂ ہفتم میں تھے اور ہم طلبہ عربی پڑھنے کے خواہش مند تھے، مگر جامعۃ الفلاح میں عربی کا

کوئی استاد موجود نہیں تھا چنانچہ مولانا کو یہ شرف بخشا گیا۔ مولانا اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں۔ جس سال مولانا کو مدرستہ الاصلاح چھوڑنا پڑا، اسی سال مولانا حج کو چلے گئے۔ واپسی پر جب مولانا مجیب اللہ ندویؒ کو پتہ چلا کہ آپ کو مدرستہ الاصلاح سے ہٹادیا گیا ہے تو انہوں نے سوچا کہ میں اپنے یہاں بلالوں اور عربی درس گاہ قائم کروں۔ چنانچہ جب پتہ چلا کہ مولانا عبدالحسیب صاحب فلاں ٹرین سے آرہے ہیں تو مولانا ندویؒ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے اور مولانا کا استقبال کیا۔ مولانا ندوی مسلسل اصرار کرتے رہے کہ آپ ہمارے یہاں آجایئے۔ مولانا کہتے رہے کہ میں گھر جاکر سوچوں گا لیکن اصرار کی وجہ سے بالآخر اقرار کرلیا۔

ابھی نئے سال کے آنے میں کافی وقت تھا۔ کئی مہینے باقی تھے۔ حکیم محمد ایوب صاحب، ڈاکٹر خلیل احمد صاحب وغیرہ نے مولانا سے بلریا گنج کے مکتب (جامعۃ الفلاح) میں پڑھانے کی درخواست کی۔ مولانا نے کہا کہ میں نے مولانا ندویؒ سے وعدہ کرلیا ہے۔ ڈاکٹر خلیل صاحب کہنے لگے کہ اگلے سال سے وعدہ کیا ہے نا اس سال پڑھادیجیے۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور حکیم محمد ایوب صاحب کے اصرار پر مولانا نے جامعہ آنے کی حامی بھرلی اور پھر مولانا نے ہم لوگوں کو عربی کی بنیادی کتابیں پڑھائیں، خصوصاً اسباق النحو اول دوم وغیرہ۔ مولانا اس وقت ہم لوگوں سے دوران درس بار بار یہ کہتے تھے کہ کیا کروں یہیں رک جاتا مگر مولانا ندوی سے وعدہ کرچکا ہوں۔ چنانچہ حسب وعدہ ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الرشاد چلے گئے۔ اس دوران ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور حکیم محمد ایوب صاحب اکثر جمعہ کے دن علاؤ الدین پٹی جاتے اور مولانا کو جامعۃ الفلاح دوبارہ آنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے۔ بالآخر ان لوگوں نے مولانا کے چچا سے بات کرکے ان کو راضی کرلیا، جب چچا نے بھی آپ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحبان کی بات مان لو اور پھر یہ ادارہ نسبتاً زیادہ قریب بھی ہے۔ اس کے بعد مولانا چچا کی بات کا احترام کرتے ہوئے ان کی بات مان کر جامعۃ الفلاح آنے کے لیے رضامند ہوگئے۔ دوسرے دن مولانا نے پوری صورتِ حال مولانا ندویؒ کے سامنے پیش کیں اور استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت مولانا ندویؒ کہنے لگے کہ مجھے معلوم تھا کہ آپ چلے جائیں گے۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں آپ دوبارہ جامعۃ الفلاح واپس آگئے اور اس وقت سے لے کر ریٹائرمنٹ تک جامعۃ الفلاح اور اس کے طلبہ وطالبات کو اپنے علم سے مستفید کرتے رہے۔

۱۹۶۲ء کے آس پاس کی بات ہے جب مولانا عبدالحسیب صاحب آکر جاچکے تھے اور اس کے بعد مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ وہاں اپنے ساتھ بہار سے چند طالب علموں کو بھی لے کر آگئے اور پھر مکتب کا نام مکتب

اسلامیہ سے جامعہ اسلامیہ ہو گیا۔

لیکن بعد میں جب مولانا عبدالحسیب صاحب ۱۹۶۴ء میں آئے تو اس کا نام جامعۃ الفلاح رکھ دیا گیا۔ اور ایک ہی سال میں چار درجوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ عربی اول تا عربی چہارم۔ چونکہ ہم لوگوں کو مولانا نے خود عربی پڑھایا تھا اس لیے ہم لوگوں کو بغیر ٹسٹ کے عربی دوم میں اور جو نئے طلبہ آئے تھے انہیں عربی اول میں داخلہ دیا گیا۔

مولانا رحمت اللہ اثری صاحب مولانا عبدالحسیب صاحب کے ساتھ ہی جامعۃ الرشاد سے چلے آئے تھے کہ مولانا جا رہے ہیں تو ہم لوگ بھی چلیں گے۔ ان لوگوں کو عربی سوم میں داخل کیا گیا۔ ابوالمکارم صاحب، عبدالوحید صاحب، حبیب صاحب کو عربی چہارم میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ایک ایک درجہ بڑھتا گیا۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ میرے لیے باعث فخر معلوم ہوتا ہے کہ جامعۃ الفلاح کے داخلہ رجسٹر کے لحاظ سے میں پہلے نمبر پر ہوں، مگر چونکہ ایک ساتھ کئی درجات کا قیام عمل میں لایا گیا اس طرح فراغت کے لحاظ سے میرا نمبر تیسرے نمبر پر آ گیا۔

اس زمانے میں تعلیم و تدریس مولانا مودودیؒ ہال میں ہوتی تھی۔ اسی ہال کے شمال جنوب اور مغربی و مشرقی حصوں میں چاروں کلاس ہوتی تھی۔ چونکہ ابھی مسجد کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اس لیے نماز بھی اسی ہال میں ہی ہوتی تھی۔ ابھی مطبخ بھی نہیں بنا تھا، لہٰذا مودودی ہاسٹل سے متصل جنوبی کمرے میں کھانا بنتا تھا، اور یہیں برآمدے میں طلبہ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

مولانا کا اپنے طلبہ کے ساتھ بہت ہی شفقت و محبت کا معاملہ تھا۔ مولانا جب تک فلاح میں رہے ان کا قیام مولانا مودودی ہال کے جنوبی سمت والے کمرے میں ہوتا تھا۔ اکثر طلبہ ان کے روم پر چلے جاتے تو مولانا خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاتے تھے۔ کبھی لڑکوں سے پیالی وغیرہ اگر ٹوٹ جاتی تو کبھی یہ نہ کہتے کہ کیوں توڑ دیا، یا کیسے ٹوٹ گئی؟ اس کے برعکس انداز تربیت دیکھیے کہتے کہ اچھا بابو ٹوٹ گئی، ایسا ہے کہ اس میں پہلے سے خراش رہی ہوگی۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ معذرت کے انداز میں سمجھاتے۔ لڑکا سمجھ بھی جاتا کہ پیالی مجھ سے ہی ٹوٹی ہے مگر بہت زیادہ خفت کا شکار بھی نہیں ہوتا۔

اس وقت ہمارے اساتذہ نے تربیت اس طریقہ سے کی تھی کہ اس کا تصور بھی آج محال ہے۔ آج تو طلبہ دیواریں پھلانگ کر باہر چلے جاتے ہیں، اس وقت کوئی باؤنڈری نہ ہونے کے باوجود کوئی لڑکا بلا اجازت

باہر نہیں جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت اگر کوئی مہمان آجاتا یا کسی کے سرپرست آجاتے تو لڑکے دوڑ پڑتے اور سامان ان کے ہاتھوں سے لے لیتے اور ان کو مہمان خانہ تک پہنچا دیتے۔ جب کہ آج اگر کوئی کہے بھی یا مطالبہ بھی کرے کہ بچے ذرا یہ سامان پہنچا دو تو لڑکے سن کر نظر انداز کردیں گے۔ اس وقت کے اساتذہ طلبہ کی ذہنی وفکری رہ نمائی کرتے اور ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھرپور توجہ دیتے اور پھر ان طلبہ کو ہفتہ میں کسی ایک روز استاد کی رہ نمائی میں آس پاس کے کسی علاقہ میں بلغوا عنی ولو آیة کا فریضہ انجام دینے کے لیے بھیجا جاتا۔ یہ سب یقیناً مولانا جیسے مختلف الجہات اہلیت کے مالک اساتذہ کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔

فلاح کے نصاب تعلیم کے تعلق سے مولانا کا یہ رجحان تھا کہ عربی زبان وادب اور قرآن وحدیث، فقہ واصول فقہ، اور دینی علوم کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ نصاب تعلیم میں عصری مضامین کے متعلق مولانا کا یہ خیال تھا کہ بہت ہی مختصر طور پر ان کو رکھا جائے ورنہ طلبہ اسے زینہ بنائیں گے اور کالج کی جانب تیزی سے رخ کریں گے۔ اور پھر جامعہ کے اغراض ومقاصد سے ان کی نگاہ ہٹ جائے گی۔ اس وجہ سے مولانا دیگر مضامین کو بہت مختصر طور پر نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے کیونکہ اگر ان مضامین کو زیادہ اہمیت دے دی گئی تو قرآن وحدیث مرکزی محور کبھی بھی نہیں بن پائے گا۔

مولانا کا نصاب تعلیم کے متعلق ایک خیال یہ بھی تھا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کا نصاب الگ رہے۔ کیونکہ لڑکوں کے مقابلے لڑکیوں کو نسبتاً کم سہولیات اور مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ وہ مشکل اور بہت بھاری بھرکم نصاب کی تیاری کرسکیں۔ نسواں میں نصاب بھی کم ہوتا تھا اور وہاں عالمیت بھی لڑکوں کے مقابلے میں ایک سال پہلے ہوجاتی تھی یعنی عربی چہارم میں۔ مولانا جب تک صدر مدرس رہے تب تک دونوں کا نصاب الگ رہا لیکن بعد میں اس میں ترمیم کردی گئی۔ اور پھر سے طلبہ اور طالبات کے لیے یکساں نصاب طے کیا گیا۔ اور نصاب تعلیم میں متعدد نئے مضامین کا اضافہ عمل میں لایا گیا۔

پہلے کے نصاب میں اور اب کے نصاب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ پہلے کا نصاب بہت ہی جامع اور مختصر تھا اور اس وقت کا نصاب تو وہ بالکل چوں چوں کے مربہ کے مانند ہوکر رہ گیا ہے۔ اور اگر غیر جانب دارانہ طور پر تجزیہ کیا جائے تو جامعہ کے اغراض ومقاصد کے مطابق نہ تو تعلیم ہو پا رہی ہے اور نہ ہی طلبہ وطالبات کی مطلوبہ کھیپ تیار کرنے میں ہم کامیاب ہو پا رہے ہیں۔

مولانا کی شدید خواہش تھی کہ فلاحی حضرات یہاں سے فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جامعہ کی باگ ڈور سنبھالیں۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ جب مولانا رحمت اللہ اثری صاحب مدینہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہاں خبر آئی کہ مولانا کا انتقال ہوگیا۔ یہ سننا تھا کہ مولانا عبدالحسیب صاحب رونے لگے۔ ہم لوگ بھی یہ منظر دیکھ کر رو دیے۔ مولانا اس وقت بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ میری شدید خواہش وتمنا تھی کہ آج نہیں تو کل یہ لوگ تعلیم حاصل کر کے واپس آئیں گے اور جامعۃ الفلاح کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولانا رحمت صاحب کا نہیں بلکہ مولانا کے کسی عزیز کا انتقال ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالحسیب صاحب کی یہ حسرت وتمنا مولانا کی زندگی میں ہی پوری کر دیا۔ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی پہلے فلاحی ہیں جو نظامت کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ضابطۂ ریٹائرمنٹ مدارس کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور پھر اس شخص کے لیے جو مدرسہ کے بانیوں میں رہا ہو، اور جس نے اپنی پوری زندگی یہاں لگا دی، ایسے شخص کو ریٹائر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک خاص پس منظر میں ضابطہ ریٹائرمنٹ کا بہانا بنا کر آپ کو ریٹائر کر دیا گیا۔ حالانکہ ابھی مولانا کے اندر درس و تدریس کی بے پناہ صلاحیت بھی تھی اور طاقت، عزم وحوصلہ بھی اس کی جیتی جاگتی مثال یہ ہے کہ مولانا یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد بندول میں فلاح کی ہی ایک شاخ میں گیارہ سال تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں زیادہ تر مولانا پیدل ہی جایا کرتے تھے۔ اس لیے کمزوری اور بڑھاپے کا بہانا بنا کر مولانا کو ریٹائر کر دینا ایک ایسے استاذ کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی جس نے اس چمن کی آبیاری میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہو۔ اس لیے یہ کہنا کہ مولانا کمزور ہوگئے تھے یا پڑھا نہیں پا رہے تھے۔ یہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔

عربی مدارس میں اساتذہ جتنے قدیم ہوتے ہیں اتنا ہی ان کے پاس علم وتجربہ کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ جن سے نہ صرف طلبہ بلکہ نئے اساتذہ بھی مستفیض ہوتے ہیں۔ آدمی جتنا عمر دراز ہوتا ہے اس کا تجربہ اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے اساتذہ کو مدرسہ میں موجود رہنا چاہیے تاکہ ان سے طلبہ نہیں تو کم از کم اساتذہ استفادہ کریں اور طلبہ میں علم منتقل کریں۔

دوسری اہم بات یہ کہ فارغین مدارس کا اپنے پرانے اساتذہ سے غیر معمولی جذباتی لگاؤ رہتا ہے اور اس کی بنیاد پر نہ صرف وہ ادارے اور اساتذہ سے رابطہ میں رہتے ہیں بلکہ خصوصی تعاون اور سپورٹ بھی پیش

کرتے ہیں۔ ایسے استاذ اگر صرف موجود رہتے ہیں تو وہ لگاؤ مزید بڑھتا ہے۔ مدارس میں ریٹائرمنٹ کا قانون تو بالکل بھی مناسب نہیں، غیر ضروری اور غیر موزوں ضابطہ ہے۔ یہاں صرف رخصت ہونی چاہیے کہ اگر کوئی استاذ خود ضعیف العمری کے سبب لاغر و کمزور ہوگیا ہے یا کسی وجہ سے خود استعفیٰ دینا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے ورنہ بصورت دیگر طلبہ و اساتذہ اور ادارہ ان سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اور پھر جب ہم سرکاری اسکولوں کے ریٹائرڈ اساتذہ کو رکھ لیتے ہیں تو پھر اپنے بزرگوں کی قدر کیوں نہیں کرپاتے، جنھوں نے اپنی پوری زندگیاں لگادیں اس چمن کی آبیاری میں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔

میری یادداشت کے مطابق مولانا عبدالحسیب صاحب نے دو اہم سفر کیے: ایک انڈونیشیا کا سفر، وہاں پر ایک عالمی کانفرنس تھی جس میں مختلف تنظیموں کے نمائندے شریک ہورہے تھے۔ جماعت اسلامی ہند کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ جماعت کی نمائندگی اس کانفرنس میں کون کرے گا، کوئی ایسا شخص ہو جو عربی زبان روانی کے ساتھ بول سکے اور انگلش زبان کو سمجھ سکے۔ اس وقت مولانا عبدالحسیب صاحب کو ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔

دوسرا اہم سفر کویت کا تھا جو کئی بار مولانا نے کیا۔ اکرام پردھان جو ہمارے بڑے ابو تھے، ان کے بعد مولانا عبدالحسیب صاحب باہر گئے۔ اکرام پردھان صاحب جب ملیشیا سے واپس آئے تو انھوں نے مودودی ہاسٹل کی تعمیر کروائی۔ نیچے والا ہال اور اس کے اردگرد دو کمرے تعمیر ہوئے۔ جب مولانا عبدالحسیب صاحب باہر گئے تو پھر تعمیری کام مزید آگے بڑھا۔ مولانا نے عرب ملکوں میں جامعہ کا ایسا تعارف کرایا کہ آج بھی جامعہ کے سفراء کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ مولانا کہتے تھے کہ عبداللہ علی المطوع جو وہاں کے مذہبی پیشوا تھے، مولانا ان کا توصیہ حاصل کرتے۔ ان کے توصیہ پر لوگ خاص توجہ دیتے تھے اور محسنین سے ملاقات کراتے تھے۔

مولانا نے فلاح کی تعمیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، خاص طور سے مسجد کی تعمیر میں۔ مسجد مولانا کی نگرانی میں بنی۔ مولانا اکثر بتایا کرتے تھے کہ مسجد کے اوپر جو چھوٹے چھوٹے محراب بنے ہیں وہ ہم نے جامع مسجد دہلی کو دیکھ کر بنوایا ہے۔ کبھی کبھی تعلیم کے دوران میں بھی مزدوروں کو سمجھانے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ مسجد کی تعمیر مولانا کی ہی مرہون منت ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے مولانا نے بہت محنت کی۔ مالی تعاون کے لیے مختلف لوگوں اور اہل خیر حضرات کو خطوط لکھے۔ مولانا نے شاہ فیصل کے نام بھی خط لکھا تھا۔ اس خط کی وجہ سے اس وقت ۲۰ ہزار روپے سفارت خانے کے ذریعے مسجد کی تعمیر کے لیے آئے تھے۔

مولانا جماعت اسلامی ہند سے بالکل شروع میں ہی جڑ گئے تھے۔ جماعت کے تمام اجتماعات میں برابر شریک رہتے ۔آخری عمر میں جب آپ سفر کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے، بیماری، کمزوری اور موسم کی سختیوں کے باوجود آپ جماعت کی فلاح یونٹ کے ہفتہ واری پروگرام میں بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔ عرصۂ دراز تک آپ امیر مقامی رہے۔اس کے علاوہ جماعت کی بہت سی سرگرمیوں کی سرپرستی آپ نے کی۔

مولانا مودودیؒ کے انتقال پر جو چند حضرات ہندوستان سے پاکستان تشریف لے گئے ان میں بندہ ناچیز اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب بھی تھے۔میں چونکہ دہلی میں پہلے سے موجود تھا لہٰذا خبر ملتے ہی فوراً پاسپورٹ بنوایا اور شام تک پاکستان کے لیے روانہ ہوگیا۔مولانا عبدالحسیب صاحب، مولانا ممتاز احمد اصلاحی صاحب اور نور محمد صاحب یہ لوگ جامعۃ الفلاح میں تھے جب معلوم ہوا کہ ویزا مل جائے گا تو وہ لوگ بھی روانہ ہوگئے۔ غالباً وہ لوگ ایک دن بعد پہنچے اور تدفین میں شریک نہ ہوسکے تھے۔ہم نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو وہیں دیکھا اور پہلی ملاقات وہیں پر ہوئی، جب کہ مولانا عبدالحسیب صاحب ان سے پہلے بھی مل چکے تھے۔اس لیے وہ مولانا امین احسن صاحب کے گھر پے بھی گئے اور وہاں تفصیلی ملاقات کی۔

مختصراً یہ کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔جامعہ کے تعلق سے مولانا کی جو خدمات ہیں اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔فکر فراہی کی ترویج واشاعت میں مولانا کی جو کوششیں ہیں اسے بھی ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور تحریک اسلامی کے لیے جو وقت، صلاحیت اور قربانیاں دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔اللہ تعالی مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمائے۔اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔جامعہ اور دعوت وتبلیغ کی راہ میں پیش کی گئی آپ کی خدمات اور جدوجہد کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور بہترین اجر سے نوازے۔آمین (گفتگو پر مبنی)

فکرِ فراہیؒ وفکرِ مودودیؒ کا ترجمان

(دیدوشنید کا بیانیہ)

ڈاکٹرعبیداللہ فہد فلاحی

اولین دورِ صدارت

یہ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کا زمانہ ہے۔ مدرسہ اسلامیہ اکر ہرا ضلع سدھارتھ نگر اتر پردیش میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا۔ سالانہ امتحان سے قبل مولانا محمد الیاس سلفی کچھمی نگر بلرام پور نے ایک سوال کر کے پوری جماعت کو مخمصے میں ڈال دیا۔ انہوں نے جامعہ سلفیہ بنارس سے حال ہی میں فراغت کی تھی۔ پرجوش، باصلاحیت نوجوان استاد تھے اور خطیب بھی۔ سفید پوشی میں ممتاز اور اردو زبان میں گفتگو کرنے والے۔ سوال اگلے سال طلبہ کے منصوبہ سے متعلق تھا۔ میں نے بغیر کسی رورعایت کے جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں داخلہ کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے جب وجہ پوچھی تو میں نے ایک معصوم سا جواب دیا: وہاں اردو زبان بولی جاتی ہے۔

میں تمہیں اردو زبان میں بات کرنا سکھا دوں گا۔ یہ کون سی مشکل چیز ہے؟ مولانا سلفی نے جواب دیا۔ ابا نے جامعۃ الفلاح سے فارم منگوا رکھا تھا۔ تعطیل ہوئی اور اپنے مختصر سامان کے ساتھ میں گاؤں آ گیا۔ رمضان کے اواخر میں صدر مدرس جامعۃ الفلاح کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا، جس نے میری زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ خط کا مضمون یوں تھا:

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ آپ کے بچے کا داخلہ فارم منظور ہوگیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ۶ رشوال کو جامعہ پہنچ جائیں۔ مارک شیٹ کی نقول، ایک بستر، کم از کم دو جوڑے کپڑے، ایک عدد لوٹا اور ایک لالٹین لانا نہ بھولیں۔ اسی دن داخلہ کا امتحان ہوگا۔

والسلام

عبدالحسیب

میری خوشی دیدنی تھی۔ میں وہ پوسٹ کارڈ لیے پورے گاؤں میں گھومتا پھرا۔ خاندان میں تعلیم کی غرض سے اپنے گاؤں سے دور جانے والا میں پہلا طالب علم تھا۔ بیشتر افراد نے ہماری غربت اور وسائل سے محرومی کا طعنہ دیا۔ بعض بھلے مانس لوگ تھے۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ مبارک باد دی۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ (۱۹۲۸۔۲۰۲۰ء) کا یہ غائبانہ تعارف تھا جو مجھے اس پوسٹ کارڈ سے حاصل ہوا۔

مولوی عبداللہ فلاحی کے ساتھ میں جامعہ پہنچا۔ داخلہ امتحان ہوا۔ مولانا محمد عمران فلاحی نے اردو کا اور ماسٹر سید عبداللہ ایم اے نے انگریزی کا امتحان لیا اور کارروائی مکمل ہوئی۔(۱) یہ مولانا اصلاحی کا اولین دور صدارت تھا، گرچہ ۱۹۶۵ء میں بھی کچھ مدت کے لیے انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ۱۹۷۱۔۱۹۷۳ء کا دور صدارت میرے نزدیک حشمت وشوکت اور دبدبہ وطنطنہ کا دور تھا۔ مولانا کا رکھ رکھاؤ، اردو اور عربی زبان پر ان کی قدرت، شیروانی اور ٹوپی مع عصائے کلیمی کی وجاہت، نظم وضبط میں سختی اور پابندی، تربیت کا ان کا روایتی اسلوب یہ سب عالمیت کے ابتدائی درجات کے طلبہ کو مرعوب اور مسحور کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس وقت نظامت کے منصب پر مولانا ابوبکر اصلاحیؒ (۱۹۶۹۔۱۹۷۲) فائز تھے۔ پھر یہ ذمہ داری مولانا محمد عیسیٰ قاسمیؒ (۱۹۷۲۔۱۹۷۹ء) کے کندھوں پر ڈالی گئی۔

اس دور میں مولانا اصلاحیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ مسجد کی تکمیل ہے۔ تعمیر کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہو گیا تھا۔ میں نے عالمیت اول میں کئی مہینوں تک نماز باجماعت، موجودہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ منزل کے ہال میں پڑھی۔ ہال کے باہر طویل راہداری میں بھی دو صفیں قائم ہوتی تھیں۔ مسجد کے جنوب میں متصل کھپریل کی عمارت منہدم ہوئی اور اس کی مٹی سے مسجد کے صحن کی بھرائی ہوئی۔ اس کارِ خیر میں طلبۂ جامعہ نے حصہ لیا۔ انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہونے کی سعادت میرے حصے میں بھی آئی۔

مسجد کی تعمیر وتزئین ہی نہیں، باجماعت نمازوں کی ادائیگی، اذان کی پابندی، خطبۂ جمعہ کا اہتمام، رمضان میں صلوٰۃ التراویح کا قیام ان سب امور سے مولانا اصلاحی کو جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں رامپور کے قاری محمد عرفان شمسیؒ نے فضیلت کی تکمیل کر لی۔ ذاتی مطالعہ کی خاطر انہوں نے ایک سال مزید قیام کیا۔ مولانا اصلاحیؒ نے انہیں نماز فجر کی اذان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ ان کی آواز میں سوز تھا۔ بڑے جذب وشوق کے عالم میں وہ اذان دیتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جامعہ کے در ودیوار سے اذان کی آواز گونج رہی ہے۔ میں نے انہیں دو سال جامعہ کی چہار دیواری میں انتہائی محترم اور معزز پایا۔ خلیق اور متواضع تو وہ اپنی

فطرت سے تھے۔ تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ بسا اوقات خطبۂ جمعہ بھی وہی دیتے۔

دیوان الحماسہ کی تدریس

عالمیت سوم میں دورِ عباسی کے مشہور شاعر ابوتمام حبیب اوس الطائی (۷۸۸۔۸۴۵ء) کے شعری منتخبات کا مطالعہ شامل نصاب تھا۔ وہ جاسم شام میں پیدا ہوا۔ عالم عرب کے شہروں میں نقل مکانی کرتے کرتے موصل میں جا کے وفات پائی۔ خلیفہ معتصم باللہ کی بطور خاص مدح سرائی کی۔ مختلف امرا کے دربار سے وابستہ رہا۔ شعراء کے قصائد کا حافظ، حکمت یونان کا معلم اور وسعت مطالعہ اور وسعت فکر کی وجہ سے کافی ممتاز تھا۔ اس کا مرتب کردہ مجموعۂ دیوان الحماسہ عرب جاہلیت اور بنوامیہ و بنوعباس کے شعراء کا انتخاب ہے، جو اپنی ادبیت اور معتبریت کی وجہ سے دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

عالمیت سوم میں باب الادب، عالمیت چہارم میں باب المراثی اور عالمیت پنجم میں باب الحماسہ کی تدریس مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے کی۔ ہمارے لیے ناگزیر تھا کہ درس سے پہلے مطالعہ کریں۔ مشکل اور حل طلب الفاظ کے لیے عربی لغت کا سہارا بس۔ مصباح اللغات اور دوسری اردو ڈکشنری سے مدد لینے کا سوال ہی نہ تھا۔ مولانا اصلاحی ان کے سخت مخالف تھے۔ اردو تراجم وشروح پر سخت بندش تھی۔ ہمارے ایک ساتھی عبدالسلام (مدھناپار، اعظم گڑھ) نے تجارتی مقصد سے آگے چل کر عربی دیوان کے بعض شروح وتراجم کا خفیہ انتظام کیا تو وہ مستقل ڈرون کیمروں کی زد میں رہتے تھے۔ ہمیں خود فکر ہوتی تھی کہ عربی لغات ہی کو استعمال کریں۔ مثلاً بورڈنگ میں المنجد فی اللغۃ والاعلام کے ایک دو نسخے ہی مہیا تھے۔ وہی باری باری طلبہ کے استعمال میں آتے۔ جماعت میں اسی طالب علم کو اشعار کی خواندگی کی سعادت ملتی، جس نے پیشگی مطالعہ کر کے مشکل الفاظ کے معنیٰ اپنی محنت وذکاوت کے مطابق معلوم کر لیے ہوں۔

عالمیت سوم میں دیوان الحماسہ کی تدریس کے وقت ہمارے ایک ہم جماعت حافظ احسان الحق پر مولانا اصلاحی کی نظر کرم رہتی۔ ہم یہ سمجھتے کہ جو طلبہ ان کے کمرے میں حاضری دیتے اور ان کی چائے بناتے ہیں وہی ان کے مقرب ہیں اور مجھے اس تقرب سے نفرت تھی۔ یہ تو بعد میں حافظ احسان الحق نے بتایا کہ وہ خود چائے نہیں پیتے تھے، کسی کے کمرے میں جا کے چائے بنانے کا سوال ہی کہاں اٹھتا تھا۔ وہ مقربِ خاص کیسے ہوئے، حافظ احسان الحق کی زبانی سنیے:

عالمیت سوم میں دیوان الحماسہ کا درس شروع ہوا تو میں نے مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے ذاتی

درخواست کی، وہ باب الادب کے علاوہ دوسرے ابواب بھی مجھے پڑھا دیں، انہیں ناگوار خاطر ہوا۔ میں نے کئی بار اپنی درخواست دہرائی تو فرمایا: ٹھیک ہے۔ میں عصر بعد اپنے گھر علاؤالدین پٹی جاتا ہوں۔تم میرے ساتھ ہو جاؤ۔ جہاں تک درس ہو وہاں سے واپس آ جایا کرو۔ اگر گھر پہنچ کے درس مکمل ہو تو میرے ساتھ چائے پیو اور پھر واپس آ جاؤ۔ میں نے تین دنوں تک یہ ریاضت کی۔ چوتھے دن میری محنت اور میرا اخلاص رنگ لایا۔ مولانا بولے: حافظ صاحب! یہیں میرے کمرے میں درس لے لیا کریں۔ میں نے ان سے عربی سوم ہی میں باب المراثی مکمل اور باب النسیب کے کچھ صفحات کا درس لیا۔ پھر ان کی نگاہ میں میری قدر بڑھتی گئی۔ میں نے ان کی عربی دانی سے بہت کچھ استفادہ کیا۔

حافظ احسان الحق کی قدر افزائی مولانا کی طرف سے ایسی ہوئی کہ وہ تاریخ کا حصہ بن گئی۔ مولانا اصلاحی جہاں کوئی شعر بھولتے وہ امدادطلب نگاہوں سے حافظ احسان الحق کی طرف دیکھتے اور حافظ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتے۔غضب کا حافظہ اللہ نے انہیں دیا تھا۔ وہ قرآن مجید ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ بتدریج عرب دواوین کے بھی حافظ بنتے چلے گئے۔

فراہیؒ فکر کے مبلغ

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے فکر فراہیؒ کی تدریس، تبلیغ اور تحقیق کا علم تاحیات بلند کیے رکھا۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع تھا نہ ان میں اجتہادی شان تھی۔ تدبر قرآن اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ (۱۹۰۴۔۱۹۹۷ء) کی تحریروں کے عاشق تھے۔ انہی کا مطالعہ اور حوالہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ خود تدبرِ قرآن پر کسی ادنیٰ تدبر اور تنقید کے روادار نہ تھے اور اس کمزوری سے ذہین اور پابند مطالعہ طلبہ واقف تھے۔

مولانا کی دوسری کمزوری ہندی زبان سے ان کی چڑ تھی۔ انگریزی و ہندی کے الفاظ سے انہیں پرخاش رہتی۔ وہ خالص اردو اور عربی بولنے کے قائل تھے۔ اس میں کسی آمیزش کے وہ قائل نہ تھے۔ ہندی کے بعض الفاظ کی وحشت وغرابت اور کرختگی کی وجہ سے انہیں ناقضِ وضو تصور کرتے تھے۔ ایک بار ہمارے ایک ہم جماعت محمد یعقوب (سیوان، بہار) نے ازراہِ شرارت لیٹر باکس کا ہندی لفظ پتر گھسیڑ استعمال کر دیا۔ بس مولانا اصلاحی چراغ پا ہو گئے۔ جماعت سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

مولانا کی ایک کمزوری خطہّ اعظم گڑھ سے محبت اور اس کے اداروں اور شخصیات سے عقیدت تھی۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے اور حدود کے اندر ہو تو قابل ستائش ہے۔ ضلع بستی، گونڈہ اور سدھارتھ نگر کے طلبہ کو وہ ازراہ

مذاق تکیہ کلام کے طور پر اس طرح مخاطب کرتے:

عش یا ولد (بستی، تو چیست ہستی؟)

اسے طلبہ استخفاف کے معنی میں لیتے اور ان کا لہجہ بدل جاتا۔ ہمارے ایک ہم جماعت افکار احمد (سدھارتھ نگر) سے، جو اپنی محنت، سعادت مندی اور نظم وضبط کی پابندی میں قابلِ تقلید تھے، مولانا اصلاحی مسلسل نالاں رہتے۔ شبیر احمد (چوکونیاں، سدھارتھ نگر) کی روایت ہے کہ اس کی وجہ افکار کے جغرافیائی تعلق کی سوا کچھ اور سمجھ میں نہیں آتی۔ عبدالرحمٰن خالد (بلیا) کہتے ہیں کہ افکار الفاظ وتراکیب پر بڑی بحث کرتے تھے، کیوں کہ ان کا مطالعہ سب سے زیادہ محکم ہوتا تھا۔ (۲)

عالمیت پنجم میں قرآن مجید کے درس کے دوران یہ تجربے ناقابل یقین تھے۔ سورۂ مریم تا سورۂ احزاب کی تفسیر داخل نصاب تھی۔ بڑی مشکل سے غالبًا سورۂ الفرقان تک کی تفسیر مکمل ہوسکی۔ سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کا موقف حروفِ مقطعات کے متعلق بیان کیا۔ طٰہٰ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ عبرانی میں حرف طٰ سانپ کی شکل میں لکھا جاتا تھا اور اس کے معنیٰ بھی سانپ کے ہوتے تھے۔ قرآن میں سورہ طٰہٰ کا مطالعہ کیجیے۔ مختصر تمہیدی جملوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے عصا کے سانپ بن جانے کا بیان ہے۔ اسی طرح دوسری سورتیں جو 'ط' سے شروع ہوتی ہیں، جیسے طٰس، طٰسم، ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ بیان ہوا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے مولانا فراہیؒ کے اس موقف کو ایک نظریہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور اپنی تفسیر میں اس موقف کو اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروفِ مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ (۳) مگر مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ فکر فراہی کی پیروی میں کسی سوال یا تنقید کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے ہم جماعت شبیر احمد (بستی) نے جب حروف مقطعات کی اس فراہی تفہیم پر سوال کھڑا کیا تو استاد گرامی سخت ناراض ہوگئے۔ انہیں ایک بید رسید کر دیا اور کلاس سے چلتے بنے۔

فکر فراہیؒ کی اس تفہیم سے ہم نامانوس تھے۔ ہمارے چند ہم جماعت تعلیم وتربیت میں ممتاز تھے۔ روزانہ زیرِ درس آیات کا پیشگی مطالعہ مختلف تفسیروں کی مدد سے ہمارا مشغلہ تھا۔ محمد طارق فارقلیط، غلام رسول نیپال، مزمل حسین اڑیسہ، محمد احمد بنارس، عبدالباری بستی، احسان الحق مئو آئمہ۔ یہ وہ لوگ تھے جو محنت سے ہوم ورک کے عادی تھے۔ تدبر قرآن ہم سب کے مطالعہ میں یکساں رہتی اس لیے ہمیں درس میں مایوسی ہوتی۔ اس کی

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عالمیت سوم میں ہم نے مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی سے سورہ الحدید تا سورہ الناس کا درس لیا تھا۔ فکر فراہیؒ کے علم بردار وہ بھی تھے مگر وہ مقلد نہ تھے، مجتہد تھے۔ سوال وجواب کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ بڑے ذوق وشوق اور اہتمام واحتشام سے درس دیتے۔ ہمیں ان کے درس میں تدبر کرنے، تفہیم وتنقید کرنے کا حوصلہ ملتا تھا۔

مقدمہ ابن خلدونؒ کا منہج تدریس

علامہ ابن خلدون (۷۳۲۔۸۰۸ھ/۱۳۳۲۔۱۴۰۶ء) بلاشبہ تاریخِ اسلام کی ان عبقری شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں، جنھوں نے علوم شرعیہ میں تبحر حاصل کرنے کے ساتھ عربی زبان وادب میں کمال پیدا کیا اور اپنے افکار وعطیات سے عالم اسلام ہی کو نہیں بلکہ عالم مغرب کو بھی متاثر کیا۔ وہ عربی ادب کے اساطین اور کتابت وانشا پردازی کے اعلام میں سرفہرست تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب المقدمۃ میں ادب ولسانیات پر معرکہ آرا بحثیں موجود ہیں۔ ان کی ارتقائی تاریخ، ان فنون کے ارباب کمال کا ناقدانہ مطالعہ اور ان میدانوں میں علمائے مشرق ومغرب کے درمیان تقابل سے ابن خلدون کی بصیرت اور درّاکی کا اندازہ ہوتا ہے۔(۴)

المقدمہ کا امتیاز، ابن خلدون کی اعلیٰ درجہ کی ادبیت اور لسانیات میں ان کی بصیرت وتبحر نہیں، علم العمران اور تاریخ نگاری کے میدانوں میں ان کے قائم کردہ مجتہدانہ وتخلیقی اصول ومباحث ہیں اور یہی وہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے انہیں علمی سطح پر ایک مفکر، ماہر سماجیات اور مورخ تسلیم کیا گیا ہے اور جن پر مغرب نے اپنی تحقیق، منہج اور جدید عمرانی فکر کی عمارت استوار کی ہے۔ خاص طور سے فرانسیسی مفکر وماہر عمرانیات مانٹیسکو (MonTesquieu 1668-1744) نے اپنے افکار کی تشکیل میں ابن خلدون کے نظریات کو بنیاد بنایا ہے۔(۵)

مقدمہ ابن خلدون کے اسی تخلیقی اور تاریخ ساز امتیاز کی وجہ سے مدارس دینیہ نے اور خاص طور سے جامعۃ الفلاح نے اسے اپنے نصاب میں جگہ دی۔ اس کے منتخب ابواب کا مطالعہ ناگزیر تصور کیا۔ فضیلت اول میں اس تاریخ ساز کتاب کا درس مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے ذمہ آیا۔ انہوں نے المقدمہ کی تدریس شروع کر دی۔ یہ زمانہ مولانا محمد عیسیٰ قاسمیؒ کی نظامت اور مولانا شبیر احمد اصلاحی کی صدارت (۱۹۷۳۔۱۹۷۷ء) کا تھا۔ مولانا اصلاحیؒ رمضان المبارک خلیج کے ممالک بطور خاص کویت میں گزار کے آئے تھے۔ جامعہ کے مالی

مسائل حل کرنے کے لیے عالم عرب میں ان کی آمد ورفت اور اصحاب خیر سے پیہم رابطہ ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔اس میدان میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔وہ پابندی سے ہر سال خلیج کی زیارت کرتے اور جامعہ کو مالی بحران سے نکالنے میں مدد کرتے اور اسی وجہ سے عربی زبان میں ان کی طلاقت بھی ضرب المثل بن گئی تھی۔حافظ شیرازی کا ایک شعر علامہ محمد اقبال نے اپنے ایک نظم میں مستعار لیا ہے۔جی چاہتا ہے کہ مولانا اصلاحیؒ کی خدمت میں بطور خراج اسے یہاں نقل کردوں۔

گرت ہو است کہ باخضر ہم نشیں باشی
نہاں زچشم سکندر چوآب حیواں باش

المقدمہ کی تدریس کیا شروع ہوئی، ہم نے مولانا اصلاحی کی طلاقتِ لسانی کے مظاہر دیکھنے کا آغاز کردیا۔خلیجی مما لک کی سیاحت میں ہمارے رفقائے جماعت بھی شامل ہوگئے۔فندق الکویت الکبیر میں مولانا اصلاحی کا قیام،عربوں سے فصیح عربی زبان میں گفتگو کرنے کی بنا پر ان کی طرف سے مولانا اصلاحی کو نحوی کا خطاب ملنا،عرب شیوخ کی مہمان نوازی،عرب و ہند ثقافت اور تاریخ پر استاذ گرامی کے فاضلانہ بیانات۔طلبہ خوش ہوئے کہ کتاب کی خواندگی،حلِ لغات کی ریاضت،مباحث اور افکار کی گراں گوشی سے نجات ملی۔مگر ہفتہ دس دنوں کے بعد احساس ہوا کہ نصاب تو آگے سرک ہی نہیں رہا ہے۔ایک دو سطروں میں پورا گھنٹہ گزر جاتا ہے۔ادب کی چاشنی اپنی جگہ،المقدمہ کو داخل نصاب کرنے کا مقصد ہی فوت ہو رہا ہے۔اب اجتماعی پریشانی کا احساس ہونے لگا۔

طلبہ نے اپنے احساسات صدر مدرس مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ تک پہنچائے اور کوئی حل نکالنے کی درخواست کی۔وہ سراسیمہ ہوگئے۔مولانا عبدالحسیب اصلاحی علاقہ کے زمین دار اور بارسوخ آدمی ہیں۔مجلس انتظامیہ کے مستقل رکن ہیں۔ان کی ذات سے جامعہ کو بڑا فیض پہنچ رہا ہے۔اردو اور عربی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ان سے المقدمہ کا درس واپس لینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

طلبہ نے ناچار فیصلہ کیا۔تنگ آمد بجنگ آمد۔مقدمہ ابن خلدون کا گھنٹہ شروع ہونے سے پہلے طلبہ جماعت سے نکل جاتے اور وقت ختم ہونے کے بعد ہی کلاس میں واپس آتے۔ہفتہ دس دن تک یہ خاموش احتجاج جاری رہا۔بالآخر انتظامیہ نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا اور المقدمہ کی تدریس مولانا نظام الدین اصلاحی کے سپرد کردی گئی۔معمولِ زندگی بحال ہوگیا۔

حافظ احسان الحق فلاحی کی روایت ہے کہ مولانا نظام الدین اصلاحی نے مقدمہ ابن خلدون پڑھانا شروع کردیا۔ ایک دن میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے کمرہ کے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا اور فرمایا:

’آؤ غم غلط کریں۔ مجھ سے المقدمہ کی تدریس چھین لی گئی۔ مولانا نظام الدین اصلاحی کے سپرد کردی گئی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ المقدمہ کے کتنے ہی مقامات ہیں جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتے وہ کیا خاک پڑھائیں گے۔‘

المقدمہ کا نظام اس سال مکمل ہوا۔ نئے استاد اسلام کی سیاسی وسماجی تعلیمات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ المقدمہ کی تدریس میں انہوں نے کمال درجہ کی محنت وریاضت اور فراست کا مظاہرہ کیا۔

صدارت کا دوسرا دور

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا دوسرا دورِ صدارت ایک سال کی مدت ۱۹۷۷تا۱۹۷۸ء پر مشتمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا جلیل احسن ندویؒ (۱۹۱۳۔۱۹۸۱ء)، مولانا ابوبکر اصلاحیؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، ماسٹر اکرام الدین احمدؒ، ماسٹر عبدالحکیمؒ جیسے جید اساتذہ کی خدمات جامعہ کو حاصل تھیں۔ اسی دور میں ملک وبیرون ملک مختلف جامعات اور عصری یونیورسٹیوں سے الحاق کا آغاز ہوا۔

مولانا اصلاحیؒ ۲۹؍جون ۱۹۶۴ء کو مجلس انتظامیہ ؍مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور تاحیات رکنیت پر فائز رہے۔ پابندی سے اس کے تمام اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۹۶ء کو دستور جامعۃ الفلاح میں بنیادی تبدیلیاں نافذ ہوئیں۔ نئے دستور کے مطابق جملہ تعلیمی وتربیتی امور کے ذمہ دار اعلیٰ کی حیثیت سے مہتمم تعلیم وتربیت کا ایک نیا منصب قائم ہوا تو اس منصب کے لیے سب سے موزوں شخص مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا انتخاب ہوا۔ انہوں نے ۱۹۹۸ء تک یہ ذمہ داری نبھائی۔

عصری جامعات سے الحاق کے سلسلے میں مولانا اصلاحی کا نقطۂ نظر ہمیشہ مخالفانہ رہا۔ وہ دینی درس گاہوں کو عصری جامعات کی آلودگیوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جدید تعلیم کے مخالف نہ تھے، مگر دینی تعلیم کے ذریعے دنیوی ترقی اور سرفرازی ان کے حلق سے نیچے نہ اتر سکی۔ اس کے مقابلے میں ڈاکٹر خلیل احمد علیگ اس تجویز کے حامی، وکیل اور ترجمان تھے۔ کثرت رائے سے الحاق کے فیصلے مجلس انتظامیہ ؍مجلس شوریٰ میں ہوتے

گئے۔مولانا اصلاحی شائستہ اور متین لہجے میں اپنا موقف دہراتے رہے۔آفریں ہے کہ کثرتِ رائے سے لیے گئے فیصلوں کا مولانا اصلاحی نے ہمیشہ احترام کیا اوران کے خلاف عوامی سطح پر کبھی آواز بلند نہ کی۔

۱۹۷۸ء میں شعبہ نسواں جامعۃ الفلاح میں عربی درجات کے قیام کا فیصلہ مجلس انتظامیہ نے کیا۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں چھ طالبات نے فضیلت کی تکمیل کی اور تعلیم نسواں کے میدان میں جامعہ کی تیز رفتار ترقی نے بیشتر مدارس عربیہ کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس دور میں مولانا اصلاحیؒ کا منہج تعلیم وتربیت مزید نکھر کے سامنے آیا۔ان کی فکر میں روایت پسندی کی جڑیں مزید گہری ہوئیں۔وہ طلبہ کو اخبار بینی سے گریز کرنے کا مشورہ دینے لگے کہ اس سے وقت برباد ہوتا ہے اور ذہن کی یکسوئی متاثر ہوتی ہے۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے حوالے سے وہ کہنے لگے کہ اخبارات میں شائع تصاویر سے فکری آوارگی کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔سودا سلف لینے کے بہانے بازار کا طواف، چائے نوشی اور ہوٹل بازی کی لت، مشاعروں میں شرکت، سیاسی جلسوں کے چٹخارے یہ سب طالب علم کے ذہن کو ماؤف کردیتے ہیں۔اس کی فکری فراغت کے لیے اختلال کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس کے اخلاق وکردار پر شب خون مارتے ہیں، اور بتدریج اس کی دل چسپیوں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

صدارت کا تیسرا دور

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی صدر مدرسی کا تیسرا دور طویل تر ہے۔۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۹ء تک کی اس مدت صدارت میں انہوں نے مولانا عیسیٰ قاسمیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ (۱۹۱۶۔۱۹۹۸ء) کی نظامت کا تجربہ کیا۔ اول الذکر نے ایک سال تک یعنی ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۲ء تک نظامت کی اور آخرالذکر نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء تک یہ ذمہ داری نبھائی۔انتظامیہ اور اساتذہ کے درمیان تعامل بھی قدرے خوش گوار رہا۔

۱۹۷۸ء میں جامعۃ الفلاح سے فضیلت کی تکمیل کے بعد میرا اور حافظ احسان الحق کا داخلہ تخصص فی التفسیر میں ہوا۔ دوسال کے اس نصاب کی تکمیل مولانا نظام الدین اصلاحی نے کرائی۔ہم نے آخری سال میں اسالیب القرآن کے موضوع پر اپنا مقالہ جمع کیا۔ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔حافظ صاحب نے عربی زبان میں اور راقم نے اردو میں مقالہ ترتیب دیا۔بدانتظامی کا ایک مشاہدہ حافظ صاحب نے اس طرح کیا کہ ان کا جمع کردہ مقالہ مدتوں دفتر سے غائب رہا اور وہ بعد میں دفتر مطبخ کے کاغذات میں دستیاب ہوا۔ میں نے ۱۲؍مئی ۲۰۲۰ء کو موبائل پر ان سے درخواست کی۔وہ مقالہ از سر نو اردو میں مرتب کریں۔حذف واضافہ

کے بعد اسے عوام کے لیے قابل فہم بنائیں اور مختلف مقالات کی صورت میں حیات نو میں شائع کریں۔ طلبۂ قرآن کے لیے یہ اشاعت مفید ثابت ہوگی۔ میرا مقالہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔(۶)

۱۹۸۶ء میں ایم اے سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ فارم بھرتے وقت فضیلت کے بعد دو سالہ تخصص کی سند کی ضرورت پڑی تو میں نے صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ سے رجوع کیا اور اس مشکل کا حل نکالنے کی درخواست کی۔ جامعہ کے ریکارڈ میں ساری تفصیلات موجود تھیں۔ انہوں نے ہزار سلسلۂ جنبانی کے بعد جو دستاویز مجھے عنایت کی اس کی عبارت جامعہ کے لیٹر ہیڈ پر ۷/اکتوبر ۱۹۸۵ء کی تاریخ کے ساتھ درج ذیل ہے:

لمن يهمه الأمر

تشهد ادارة جامعة الفلاح بأن الاخ عبيد الله فهد بن عبارت حسين قد قضىٰ نحو سنتين في قسم التخصص في التفسير في الجامعة بعد اكمال دراسة الفضيلة من جامعة الفلاح.

ولطلبه اعطيت له هذه الوثيقة

عبدالحسيب الاصلاحي

(عميد جامعة الفلاح)

اس دستاویز نے میری فوری ضرورت پوری کر دی اور میں مولانا اصلاحیؒ کا ممنون کرم ہوا، مگر تحریر کا غموض وابہام آج تک منہ چڑا رہا ہے۔ عمید جامعہ کا یہ وثیقہ تمام سرکاری دستاویزات کی موجودگی میں ایک سوالیہ نشان ہے۔ کیا اعلیٰ دینی تعلیمی ادارے اس رویہ کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

تحریک اسلامی سے وفاداری

جماعت اسلامی کی رکنیت انہیں اوائل عمری میں حاصل ہوگئی تھی۔ ان کا خاندان مسلکِ سلف سے وابستہ اہل حدیث علماء کا تھا۔ ان کے چچا مولانا عبدالسلام ندویؒ (۱۸۸۳ـ۱۹۵۶ء)، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق تھے۔ ان کی تحریروں میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳ـ۱۳۲۸ء) حافظ ابن قیمؒ (م ۱۳۵۰ء) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ـ۱۷۶۲ء) کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں (۷)۔ اہل حدیث ہونے کے

ساتھ فکری متانت، اعتدال وتوازن اور خشیت وانابت اس خاندان کا امتیاز ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی جماعت اسلامی سے ۱۹۵٦ء میں علیحدگی پر افسوس تھا(۸) اور وہ جب مولانا مودودیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے درمیان فکری اختلاف کے واقعہ پر گفتگو کرتے تو حد درجہ تاسف کا اظہار کرتے، مگر اس شر میں انہیں خیر کا یہ پہلو نظر آتا تھا کہ تدبر قرآن تفسیر کی تکمیل ہوگئی۔ جماعت اسلامی سے تعلق اور منصبی ذمہ داریوں کی ایمان دارانہ ادائیگی کی صورت میں جو کام ناممکن نظر آتا تھا غیب سے اس کے وقوع کے روشن امکانات پیدا ہوگئے۔ مدرستہ الاصلاح کے وہ فضلاء جو جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، بالعموم جماعت اسلامی کے وفادار اور جاں باز سپاہی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے تحریک اسلامی کی ادبیات میں گراں قدر اضافہ کیا ور انتظامی و منصبی ذمہ داریاں ادا کر کے جماعت اسلامی کی تقویت واستحکام کا سبب بنے۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنا ذاتی رسالہ 'میثاق' شائع کیا، مگر ۱۹٦۵ء میں مولانا کے صاحب زادے ابوصالح اصلاحی ایڈیٹر روزنامہ مشرق کی حادثاتی موت کے بعد رسالہ کی ادارت ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے کردی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی جماعت اسلامی سے علیحدگی، تنظیم اسلامی کا ان کے ذریعہ قیام اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے ان کے اختلافات تاریخ کا حصہ ہیں۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی رائے تھی کہ جماعت اسلامی سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو دور کرنے میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ہاتھ تھا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے نئی تنظیم کے قیام میں مولانا اصلاحیؒ کو شریک کرنا چاہا مگر مولانا اصلاحیؒ اس پر تیار نہ ہوئے۔ اس دوران 'میثاق' میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بعض ایسی تحریریں شائع کیں جن سے مولانا اصلاحی کو سخت اختلاف ہوا۔ آخر کار ۱۹۷۴ء میں مولانا نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے اپنی قطع تعلقی کا اعلان کردیا۔(۹)

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے زندگی بھر جماعت اسلامی سے عہد وفا استوار رکھا۔ اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی میں اپنی بساط بھر اخلاص کے ساتھ لگے رہے۔ عہد پیری میں بھی ہفتہ وار اجتماع، ضلعی اجتماع میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔ حافظ احسان الحق فلاحی کی روایت ہے کہ ایک بار ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں نقاہت اور بیماری کے باعث بے ہوش ہوکے گر پڑے، تب انہوں نے ضلعی سطح کے اجتماعات میں شرکت سے معذوری ظاہر کی ہفت روزہ اجتماع میں تب بھی باقاعدگی سے ان کی شرکت ہوتی رہی۔ وہ تحریک

اسلامی ہند کے السابقون الاولون کی عملی مثال تھے۔ اتفاق واختلاف دونوں میں منفرد اور شائستہ۔ اس دور صارفیت میں ایثار وتواضع کا نمونہ۔ اب اتنے متواضع، شستہ وشائستہ، اورمتین وحلیم علماء کہاں دست یاب ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اوراگر صائب تبریزی سے مستعارلوں تو کہنا پڑتا ہے:

ہماں بہتر کہ لیلیٰ دربیاباں جلوہ گرباشد
ندارد تنلنائے شہر تابِ حسنِ صحرائی

ملازمت سے سبک دوشی

۲۰۰۴ء میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ جامعۃ الفلاح کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔قواعدوضوابط جامعہ کی رو سے ان کی اور مولانا نظام الدین اصلاحی کی ملازمت اسی سال مکمل ہوئی۔مجلس عاملہ نے دونوں اکابر کی توسیع حسب قواعد مجلس شوریٰ کی منظوری کے لیے تفصیلات پر بحث ومباحثہ کے بعد مجلس شوریٰ نے مجلس عاملہ کے فیصلہ کی توثیق کی۔ ملازمت سے سبک دوشی اور اس کے بعد حسب قواعد توسیع کے لیے مولانا نظام الدین اصلاحی نے نظم وضبط کی پابندی اور معاملہ فہمی وذکاوت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔انہوں نے ناظم جامعہ کے نام اپنے مکتوب گرامی میں جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا، جس نے ان کی علمی وفکری خدمات سے ایک مدت تک استفادہ کیا اور اب تبدیل شدہ ضوابط کے مطابق نئی شرائط پر توسیع ملازمت کی پیش کش اور درخواست ان کے سامنے رکھی۔ استادگرامی قدر نے حسب معمول مدرسۃ البنات جامعۃ الفلاح میں اپنی تدریس جاری رکھی اور طالبات ومعلمات کی تدریسی، علمی اورفکری رہ نمائی کی۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو شکایت ہوئی۔انہوں نے خون جگر سے ادارہ کی ترقی وکامرانی کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔تقریباً پانچ عشروں تک تدریس سے وابستگی اور مجلس انتظامیہ/مجلس شوریٰ کی رکنیت نے انہیں احساس دلایا کہ وہ قواعدِ جامعہ سے بلند ہوکے مستقل تاحیات ملازمت کے مستحق ہیں۔ دیگر دینی اداروں میں موجود اس بے ضابطگی اور قواعد وضوابط کی من مانی تشریح کی بعض مثالوں سے ان کے احساس کو تقویت مل رہی تھی۔انہوں نے ناظم جامعہ کے نام اپنے مکتوب میں اس کرب کا شدت سے اظہار بھی کیا اور اپنی نجی محفلوں میں، شاگردوں اور احباب کے حلقوں میں برابر اپنی رنجش اور دلی کسک ظاہر کرتے رہے۔

اپنے اوپر ہونے والے بزعم خویش ظلم اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے۔ اس اظہار کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ ان کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد بھی ان کے ہم دردان کی تحریر کو گردش دیتے رہے۔

مجلس شوریٰ جامعۃ الفلاح میں شیخ الجامعہ مولانا سید جلال الدین عمری کی صدارت میں اس مسئلہ پر زور دار بحث ہوئی۔ ارکان شوریٰ کی ایک اقل قلیل تعداد مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے موقف کی حامی تھی۔ اکثریت ان کے موقف سے متفق نہ تھی، مگر ان کی خدمات کی تحسین کر رہی تھی اور ان کی قربانیوں کی معترف تھی۔

شعبۂ ثانوی وشعبہ ابتدائی کے بعض ذمہ دارارا کین شوریٰ کی رائے تھی کہ مولانا اصلاحیؒ کی خدمات کی تحسین میں قواعدِ جامعہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو بعض دوسرے قابل قدر اور انتہائی محترم اساتذہ ایسے موجود ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعۃ الفلاح کی خدمت میں وقف کر دیں اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی طرح انھوں نے بھی اس ادارہ کو خونِ جگر سے سینچا ہے۔ ایسے اساتذہ کی قدر شناسی بھی ضروری ہے ورنہ امتیاز اور تفریق کی پالیسی قابل اعتراض ہوگی۔

میری ذاتی رائے تھی کہ قواعد وضوابط میں گنجائش ان اساتذہ کی توسیع ملازمت اور تحسین وتشجیع کی خاطر نکالی جاسکتی ہے، جن کا علمی وفکری سرمایہ قابل لحاظ ہو اور جو اپنی تخلیقی واجتہادی کاوشوں سے ادارہ کی رہ نمائی کرتے ہوں اور جن کے وجود سے ادارہ قابل افتخار بنے۔ استادِ گرامی قدر مولانا عنایت اللہ سبحانی سے لاکھ اختلاف کیا جائے، مگر ان کا علمی قد بہت بلند اور تحقیقی ذوق قابل تقلید ہے۔ ایسے افراد کسی بھی ادارہ کی ناموری اور نیک نامی کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان کے وجود سے علم وتحقیق کو جلا ملتی ہے۔ ایسے کمیاب اساتذہ کی خدمات سے مستقل استفادہ کے لیے دستوری دفعات میں گنجائش رہے تو ضوابط کی خلاف ورزی کی نوبت نہ آئے۔

یہ خوش بختی ہے جامعۃ الفلاح کی اور سعادت بھی کہ تحریک اسلامی کی فکری وعلمی رہ نمائی اسے حاصل ہے اور اسی لیے نظم وضبط اور اصول وقواعد کی پابندی تمام محترم اور قابل فکر شخصیات کی پسند وناپسند سے بلند ہو کر اس ادارہ کا امتیاز ہے اور اس امتیاز کو ہم قابل افتخار سمجھتے ہیں اور ہر کارکن اور خادمِ جامعۃ الفلاح سر اٹھا کے کہتا ہے:

ہے ہمالہ سے بھی اونچا میرا مینار فلاح

حواشی ومراجع

۱۔ جامعۃ الفلاح میں ورود کے وقت مولانا شہباز اصلاحیؒ سے میرا اولین تعامل بڑا دل چسپ تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون 'جامعۃ الفلاح کا نظام تربیت' (آپ بیتی)، ماہنامہ جریدہ حیات نو دہلی (انجمن طلبۂ قدیم

جامعۃ الفلاح کا ترجمان)، جلد۴، شمارہ ۸۔۹، اگست۔ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۳۱۔۴۱۔ مکمل مضمون کے لیے دیکھیے: فلاحی، مسعود عالم'جامع البحرین۔ پروفیسر عبیداللہ فہد فلاحی' مشکوٰۃ پرنٹرس اینڈ پبلشرز علی گڑھ، ۲۰۱۹ء، آپ بیتی (جامعۃ الفلاح کے حوالے سے)، ص ۶۔۱۵۔

۲۔ حافظ احسان الحق فلاحی، مولانا شبیر احمد فلاحی اور مولانا عبدالرحمٰن خالد فلاحی سے طویل ٹیلی فونک مصاحبہ، ۱۰؍مئی ۲۰۲۰ء۔

۳۔ دیکھیے: مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد اول، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، اگست ۱۹۷۶ء، ص ۳۹۔۴۱۔

۴۔ دیکھیے راقم کی کتاب: ابن رشدؒ اور ابن خلدونؒ۔ مذہب، فلسفہ اور سماجیات، مشکوٰۃ پرنٹرز اینڈ پبلشرز علی گڑھ، ۲۰۱۶ء، باب ششم: ابن خلدون کا ادبی اسلوب، ص ۱۹۲۔۲۱۲

۵۔ ابن خلدون اور مانٹیسکو کے افکار کے تقابلی مطالعہ کے لیے دیکھیے: الحضرمی، ساطع۔ دراسات عن مقدمۃ ابن خلدون، مطبعۃ المعارف مصر، ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۔۴۳۔ اس تقابل کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ کیجیے: ابن رشدؒ اور ابن خلدونؒ۔ مذہب، فلسفہ، سماجیات، حوالہ بالا، باب ہفتم: ابن خلدون کا فلسفۂ تاریخ، ص ۲۱۳۔۲۳۹

۶۔ فلاحی، عبیداللہ، قرآن مبین کے ادبی اسالیب، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، اگست ۲۰۰۸ء، صفحات ۲۰۸، اس کتاب کا مسودہ بغرض اشاعت، مکتبہ کو جمع کیا گیا تھا تو اس میں کتاب کے نام کے ساتھ 'افادات مولانا حمیدالدین فراہیؒ' کا لاحقہ بھی موجود تھا۔ اشاعت سے پہلے کتاب کی قدر و قیمت کی تعیین کے لیے پروفیسر ابوالکلام قاسمی شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رائے بھی طلب کی گئی تھی، مگر کتاب شائع ہوئی تو علی گڑھ میں فکر فراہیؒ کے علم برداروں نے بڑا غوغا کیا، جس کا تذکرہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اپنے ایک تبصرہ میں کیا ہے۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جلد ۱۸، عدد ۱۲پریل۔ جون ۱۹۹۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، نائب مہتمم تعلیم و تربیت جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کا مضمون 'قرآنیاتِ حمیدالدین فراہیؒ۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد کی تحریروں کا مطالعہ (' تین قسطیں) انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان ماہنامہ جریدہ حیات نو دہلی، جلد ۵، عدد ۱، جنوری ۲۰۲۰ء، جلد ۵، عدد ۲، فروری ۲۰۲۰ء، جلد ۵، عدد ۳، مارچ ۲۰۲۰ء، یہ بحث دوسری قسط، ص ۲۹ پر موجود ہے۔

۷۔ مثال کے طور پر مولانا عبدالسلام ندویؒ کا مضمون 'معجزات اور اسباب خفیہ' کا مطالعہ کیجیے۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جلد ۱۱، عدد ۵، ماہ شوال ۱۳۴۱ھ؍مئی ۱۹۳۲ء۔ اعجاز القرآن کے نظریہ اور تاریخ پر مولانا ندویؒ کے افکار کے تنقیدی مطالعہ کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب: 'لمعاتِ قرآنی۔ تفہیم و تحقیق قرآن پر مضامین کا مجموعہ، ادارہ علمیہ

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء، دوسرا باب: فلسفۂ اعجاز القرآن۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ کی تحریروں کا مطالعہ، ص۴۳۔۶۸۔ مولانا ندویؒ کی قرآنی خدمات کے لیے دیکھیے: اصلاحی، ابوسفیان۔ ''مولانا عبدالسلام ندوی۔ ماہر قرآنیات وادبیات''، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی، ۲۰۰۸ء، صفحات ۱۶۸۔

۸۔ پرفیسر خورشید احمد کا بیان ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے درمیان اصولی اختلاف امیر اور شوریٰ کے درمیان فکری تناقض رونماہونے کی صورت میں امیر کو حاصل حقِ استرداد (Veto-Power) کے بارے میں تھا۔ مولانا اصلاحی امیر کو شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند بنانے کے حق میں تھے جب کہ مولانا مودودی کا موقف اس کے برعکس تھا۔ پروفیسر خورشید احمد نے دونوں اکابر جماعت کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کے لیے سلسلۂ جنبانی قائم کیا۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کئی دستوری تدبیریں اتفاق رائے سے اپنائی گئیں لیکن' باہمی اعتماد کو جو ٹھیس لگ گئی تھی بالآخر جدائی کا سبب بنی۔' ۱۸؍جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا اصلاحیؒ نے ایک خط کے ذریعہ مولانا مودودیؒ کو جماعت اسلامی سے اپنی علاحدگی کے فیصلے سے آگاہ کردیا۔'مولانا اصلاحیؒ کی یاد میں'، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، جلد۱۲۵، عدد۴، اپریل ۱۹۹۸ء، ص۴۸۔۴۹

۹۔ خالد مسعود، تذکرہ وتبصرہ، سہ ماہی تدبر لاہور، مکاتیب اصلاحی نمبر، شمارہ: ۶۱، جولائی ۱۹۹۸ء، ص۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عزمی، اختر حسین۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ۔ حیات وافکار، نشریات لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۶۰۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

عبدالبر اثری فلاحی

استاد گرامی مولانا عبدالحسیبؒ کے داعیِ اجل کو لبیک کہنے کی جب خبر ملی تو یادوں کے دریچے کھل گئے۔ ان کی صحبت اور شفقت میں بیتے لمحات ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ ایسی عجیب وغریب کیفیت میں مبتلا ہو گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا میرے بھی استاد تھے اور میرے والد محترم مولانا محمد الاثریؒ کے بھی استاد تھے۔ اس لحاظ سے یک گونہ تعلق خاطر تھا۔ میں نے ان سے جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں فیض اٹھایا تھا اور والد محترم نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں فیض پایا تھا۔ برادرم عبداللہ ترابی فلاحی جو میرے ہم سبق اور ہم دم بھی ہیں اور مولانا کے بھتیجے لگتے ہیں کو تعزیت کے لیے فون کیا، تو پتہ چلا کہ وہ سفر پر ہیں۔ چنانچہ چند رسمی کلمات پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

چند دنوں بعد ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی جو میرے ہم سبق بھی ہیں اور انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے ماہ نامہ جریدہ حیات نو کے اعزازی مدیر بھی ہیں، نے فرمائش کی کہ مولانا پر خصوصی شمارے کے لیے کچھ تحریر کروں۔ تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ پھر بے ساختہ مرد مومن کی تعریف میں کہے ہوئے علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار ذہنوں میں گونجنے لگے:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادادل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل وپاک باز

چنانچہ دل نے گواہی دی کہ آج کے دور میں مولانا مرحوم صدفی صد اس کے مصداق تھے۔ لیکن اپنی بے بضاعتی کے سبب میں اس کی مکمل تصویر کشی نہیں کر سکتا لہٰذا صرف ان بعض نمایاں پہلوؤں کے بیان پر

اکتفا کروں گا، جن کا براہ راست میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ شاید ان میں آنے والی نسلوں کے لیے کچھ سامان نصیحت ہو۔

مولانا حلم و بردباری کا مجسم پیکر تھے۔ جامعہ کے اتار چڑھاؤ میں انہوں نے کتنے کڑوے کسیلے گھونٹ پیے، اسے وہی بہتر جانتے تھے یا پھر ان کا خدا جانتا ہے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں جو کچھ ان پر بیتی، اس سے ہر ایک آگاہ ہے لیکن وہ کبھی کسی کے سامنے حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔

۱۹۸۷ء کی بات ہے جب کہ میں جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کا سکریٹری تھا۔ ہم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ طے کیا کہ طلبہ کا سالانہ میگزین 'الفلاح' شائع ہونا چاہیے۔ یہ سلسلہ ٹوٹا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم نے تیاری شروع کی اور اخراجات کے سلسلے میں مولانا کے پاس درخواست پیش کی۔ کیوں کہ بحیثیت صدر مدرس وسرپرست جمعیۃ الطلبہ ان کی سفارش سے ہی وہ ناظم جامعہ کے پاس جاسکتی تھی اور اس پر عمل درآمد ہوسکتا تھا۔ لیکن مولانا نے ان دنوں جامعہ کے مالی بحران کا شکار ہونے کی وجہ سے مجھے واپس کر دیا۔ تیاریاں تقریباً مکمل ہوچکی تھیں اس لیے ہم ہر قیمت پر اسے نکالنا چاہتے تھے۔ مشورے سے طے پایا کہ ناظم جامعہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سے ملاقات کر کے اپنا مسئلہ پیش کیا جائے لیکن میں نے اس کی ایک اور خوبصورت شکل سوچی اور پھر اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جٹ گیا۔ بغیر اس بات کا چرچا کیے کہ مولانا نے مالی تعاون فراہم کرانے کے سلسلے میں معذرت کی ہے میں نے بعض بزرگ اساتذہ سے ناظم جامعہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ سے انٹرویو حاصل کرنے کے لیے اور ان سے دریافت طلب سوالات کے سلسلے میں رہ نمائی چاہی۔ ان کی رہ نمائی کی روشنی میں میں نے سوالات مرتب کیے اور انٹرویو کے لیے ناظم جامعہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سالانہ میگزین کی اشاعت کا منصوبہ ان کے سامنے پیش کیا اور انٹرویو کی خواہش ظاہر کی۔ تواضع وخاکساری میں ناظم جامعہ نے ٹالنا چاہا لیکن میرے اس جملہ پر کہ 'آپ ہمیں نہیں سکھائیں گے تو کون سکھائے گا' مولانا آمادہ ہوگئے اور کہا کہ میں زبانی انٹرویو تو نہیں دیتا تم سوالات لکھ کر دے دو۔ میں بعد میں جوابات تحریر کر کے بھجوا دوں گا۔ میں نے پہلے سے مرتب کردہ سوال نامہ حوالے کر دیا۔ سوال نامے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ناظم جامعہ نے فرمایا کہ میں ہر ایک سوال کا جواب تو نہیں دے سکتا، ہاں جن کا جواب مناسب ہوگا وہ تحریر کر دوں گا۔ میں نے عرض کیا: آپ کو پورا اختیار ہے۔ پھر میں نے صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب سے کی گئی درخواست اور ان کی معذرت کا حوالہ دیے بغیر عرض کیا: ہم طلبہ نے اپنی کوشش سے سالانہ میگزین کی اشاعت

کے لیے کچھ رقم جمع کی ہے لیکن اخراجات کے لحاظ سے کم پڑ رہی ہے۔ کیا جامعہ کے فنڈ سے ہمارا تعاون ممکن ہے؟ اگر نہیں تو کسی مخیرّ رہ نمائی کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔ مولانا نے بلا تردد فرمایا: تمہیں کسی مخیرّ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں جناب منشی انور صاحب (نائب ناظم جامعہ) سے کہہ دوں گا۔ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ گرین سگنل (مثبت اشارہ) ملنے کے بعد ہم نے جوش خروش سے اگلی تیاری شروع کر دی۔ چند دنوں بعد ناظم جامعہ نے نائب ناظم جامعہ جناب منشی انور صاحب کے ذریعہ اپنا تحریری انٹرویو بھجوا دیا۔ مالی تعاون کی بات بھی انہوں نے ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا اخراجات آئیں گے اور مزید کتنی ضرورت پڑے گی۔ میں نے اپنی جمع پونجی انہیں بتادی اور درخواست کی کہ بقیہ آپ انتظام فرمادیں۔ بل موصول ہونے پر تفصیلات آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ چنانچہ سالانہ میگزین تیار ہو کر چھپ گیا۔ اتفاق سے مجلس انتظامیہ کی میٹنگ انہیں دنوں منعقد ہوئی تو اس میں، میں نے تمام ارکان انتظامیہ میں میگزین تقسیم بھی کرا دیا۔ ارکان انتظامیہ عموماً خوش تھے کہ ایک اچھی پیش رفت کا دوبارہ آغاز ہو گیا ہے۔ مجھے بھی یک گونہ خوشی تھی کہ ایک خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ لیکن دل ہی دل میں ایک کھٹک تھی کہ مولانا کی فنڈ فراہمی کے سلسلے میں معذرت کے باوجود میں نے یہ قدم اٹھایا ہے پتہ نہیں مولانا اس پر کس ردعمل کا اظہار کریں گے۔ اس لیے میں جلدی ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے انتظامیہ کی میٹنگ کے بعد ناظم جامعہ نے مجھے بلا بھیجا۔ میں حاضر ہوا تو وہاں صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب بھی موجود تھے۔ پہلے تو میں پریشان ہوا کہ پتہ نہیں کیا معاملہ ہے لیکن حکم سر آنکھوں پر اس لیے حاضر ہوا تھا۔ ناظم جامعہ نے دیکھتے ہی سالانہ میگزین کی اشاعت پر مبارک باد دی اور پھر اخراجات کے سلسلے میں دریافت فرمایا کہ وہ پورا ہو گیا یا نہیں۔ میں نے جناب منشی انور صاحب سے ہوئی گفتگو کی روداد انہیں سنادی اور توقع ظاہر کی کہ حسب وعدہ وہ جلد ہی پورا کر دیں گے۔ ناظم جامعہ نے ٹائیٹل کی سادگی اور عنوانات کے انتخاب کو بھی خوب سراہا اور کہا کہ یہ سلسلہ ہر سال جاری رہنا چاہیے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ میں تو اگلے سال چلا جاؤں گا۔ آنے والے اب سنبھالیں گے۔ سرپرست جمعیۃ الطلبہ کی توجہ رہے تو بلاشبہ یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ شاید صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب صاحب نے بھانپ لیا اور فوراً گویا ہوئے: یہ جنونی ہے جو سوچتا ہے کر گزرتا ہے، بلکہ زیادہ ہی کرتا ہے۔ ہفتہ صفائی مہم چلائی ہفتہ نماز مہم چلائی، میں تو ڈرا ہوا تھا کہ کہیں مولانا اپنی معذرت اور ممانعت کے باوجود سالانہ میگزین کی اشاعت پر ناراضگی کا اظہار نہ شروع کر دیں۔ لیکن قربان جایئے مولانا کی

قوت برداشت اور تحمل پر کہ انہوں نے اس مسئلہ پر نہ اس وقت کچھ کہا اور نہ ہی اس کے بعد کبھی کچھ کہا۔ جب کہ عموماً ذمہ دارانہ منصب پر فائز افراد اس طرح کی چیزوں کو اپنی 'انا' کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ یا تو عین وقت پر رکاوٹ ڈالتے ہیں یا پھر موقع پا کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں لیکن مولانا کا جو معمول کا رویہ تھا وہ ہمیشہ برقرار رہا۔ میں جب جب اپنے اس اقدام کے بارے میں سوچتا ہوں مولانا کی قدر و قیمت اپنے دل میں دو چند ہوتی محسوس کرتا ہوں۔

اسی طرح یہ ۱۹۸۸ء کی بات ہے، جب میں نے جامعہ سے سند فضیلت حاصل کی اور فارغ ہوا تو میرے بعض اساتذہ اور ارکان انتظامیہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں جامعہ ہی میں تدریسی خدمات انجام دوں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جامعہ کو ضرورت بھی ہے اور یہ خود میری بھی ضرورت ہے۔ تدریس سے علم وسیع اور پختہ ہوتا ہے اس کے بعد جہاں کہیں جائیں کامیابی قدم چومے گی۔ حالانکہ میرا ذاتی اور فطری رجحان تحقیق وتصنیف کے میدان میں آگے بڑھنے کا تھا اور اس کے لیے میں نے کچھ رابطے بھی کیے تھے۔ بہر حال میں نے بہی خواہان اور والدین سے مشورے کے بعد درخواست دے دی۔ درخواست اتنی عجلت میں دی کہ 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ' لکھنا رہ گیا اور اسناد کی زیراکس منسلک نہیں کر سکا۔ خیال یہ تھا کہ جامعہ کے ذمہ داران تو مجھے پہلے ہی سے جانتے ہیں اس لیے اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انٹرویو کی تاریخ پر جب مجھے بلایا گیا اور انٹرویو پینل کے سامنے حاضر ہوا تو دیکھا کہ پینل میں ڈاکٹر خلیل احمد صاحب سابق ناظم جامعہ، ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی صاحب لکچرر شبلی کالج اعظم گڑھ اور خود مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب صدر جامعہ وغیرہ موجود ہیں اور میری ایک ورقہ درخواست پر تبادلہ خیال جاری ہے۔ پہنچتے ہی ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی صاحب نے سوال کیا: آپ کی کیا لیاقت ہے ہمیں نہیں معلوم، پھر کیسے آپ کو خدمت کا موقع دیا جائے؟ نہ آپ نے اپنی لیاقت کا درخواست میں تذکرہ کیا ہے اور نہ ہی اپنی اسناد کی زیراکس منسلک کی ہے۔ یہ سن کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا لیکن میں نے جواب دیا: ''آپ مجھے جانچ لیں۔'' چنانچہ انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کی کچھ آیات کے تراجم اور احکام پوچھے گئے۔ مقدمہ ابن خلدون پڑھوا کر ترجمہ کرایا گیا۔ سبع معلقات کے اشعار سنا کر صاحب معلقہ کے نام پوچھے گئے اور ان اشعار کی صرفی ونحوی تحلیل کرنے کو کہا گیا وغیرہ وغیرہ۔ بیشتر سوالات ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی صاحب نے کیے۔ اخیر میں مولانا سے درخواست کی گئی کہ اصلاً کام آپ کو لینا ہے اس لیے اب آپ پوچھ کر جانچ لیں۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: ''یہ بچہ میرا شاگرد ہے۔ میں اسے اچھی

طرح جانتا ہوں اس لیے مجھے جانچنے کی ضرورت نہیں۔''البتہ یہ بتائیں کہ یکسو ہو کر یہاں رہیں گے یا مجھے چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔'' یہ جواب سن کر میں حیران تھا۔ کیوں کہ یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مولانا مجھے اس قدر چاہتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ میں اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے دوران تدریس زیادہ سوالات کرتا تھا اور مولانا دوران تدریس زیادہ سوالات کرنے سے اکتا جاتے تھے۔ چنانچہ میں یہ احساس رکھتا تھا کہ شاید مولانا مجھے میرے اس رویے کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں۔ میری ساری حیرانی دراصل اسی احساس کی وجہ سے تھی۔ لیکن انٹرویو کے دوران جب مولانا نے اپنے والہانہ لگاؤ کا اظہار کیا تو خوش گوار حیرت کے ساتھ میری غلط فہمی بھی دور ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا مخدومی ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے کہا:''درخواست دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتے۔'' چنانچہ مجھے تقرری کا مژدہ سنا دیا گیا اور میں شاداں و فرحاں رخصت ہوا۔ لیکن مولانا کے یہ چند بول ہمیشہ ذہن میں رس گھولتے رہتے ہیں اور عجیب سرور کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ آج یہ احساس کچھ اور ہی دوبالا ہے۔

وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُواْ وَتَذْهَبَ رِيحُكُم. (الانفال:۴۶)

'اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو، آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو، کم زور پڑ جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'

وہ سایۂ شفقت نہ رہا

مولانا انعام اللہ فلاحی

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ جو مشرقی اتر پردیش میں تعلیم وتربیت کا ایک بلند مینارہ ہے، جس کی ضیا بار کرنیں ملک کے گوشے گوشے بلکہ بیرون ملک تک پہنچ رہی ہیں۔ اس عظیم تعلیمی قلعہ کی تعمیر وترقی میں جن بزرگوں اور اساطین کا ہاتھ رہا ہے ان کی اگر فہرست تیار کی جائے تو ابتدائی چند لوگوں میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا نام بھی سرفہرست ہوگا، انہوں نے نہایت یکسوئی کے ساتھ پوری زندگی جامعہ کی خدمت میں لگا دی۔ آج انہیں مرحوم کہتے ہوئے دل دکھ رہا ہے لیکن موت سے کسے فرار ہے۔ اس دنیا فانی سے سب کو رخصت ہونا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش اگست ۱۹۲۸ء ہے۔ ۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء کو تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں مولانا اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے، ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو درگزر فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

جامعہ کے ابتدائی زمانے کے اساتذہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا شبیر احمد اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی اور مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب ہیں۔ مولانا صغیر احسن صاحب تو درویش صفت انسان تھے۔ ظہر اور عصر کی امامت کرتے تھے باقی ذمہ داریوں کے لیے کنارہ کش رہتے تھے۔ مولانا جلیل احسن ندوی تو بڑی مولانا تھے، باقی افراد پر صدر مدرس کی ذمہ داری بار بار آتی تھی۔

۱۹۷۹ء میں میرا داخلہ جامعۃ الفلاح میں ہوا۔ اس وقت جامعہ کیمپس میں سب سے خوب صورت عمارت مسجد تھی۔ اس میں جہاں نماز ادا کی جاتی تھی، وہیں تعلیمی اوقات مین بعض کلاسز بھی لگتی تھیں اور رات میں طلبہ مسجد میں مطالعہ اور مراجعہ بھی کرتے تھے۔ دس بجے رات تک مسجد آباد رہتی تھی۔ امتحان کے زمانے میں پوری مسجد رات کے وقت بھری رہتی تھی۔ کئی طلبہ تو مسجد ہی میں پڑھتے پڑھتے سو جایا کرتے تھے۔

مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے طلبہ اس کے لیے کویت کا

سفر کیا تھا اور مقامی چندہ کے لیے محترم مولانا شبیر احمد اصلاحی مرحوم کو لے کر گاؤں گاؤں جا کر غلہ، رق اور زیور اکٹھا کرتے تھے۔

مسجد کے منارے کی بلندی اور چھت کی اونچائی دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ ان بزرگوں کی فکر اور سوچ کی بلندی کا غماز ہے۔ اس کی وسعت اور صحن کی کشادگی ان کے دل و دماغ کی کشادگی کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی سادگی مولانا کی سادگی اور خاک ساری کی پہچان ہے۔

جامعہ کے ابتدائی دور میں جامعہ کی تعمیر و ترقی میں کلیدی رول مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا رہا ہے۔ خواہ عمارتوں کی تعمیر کا معاملہ ہو یا نصاب تعلیم اور نظام کی تشکیل و تدوین کا معاملہ۔ ہر معاملے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے۔

ایک زمانے میں جامعہ میں یہ بات بہت زور وشور سے چل رہی تھی کہ سائنس اور ریاضی کے مضامین کو عالمیت کے درجات تک شامل نصاب کر دیا جائے۔ مولانا اس معاملے پر اپنی دلی تکلیف کا اظہار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اس تبدیلی سے مقاصد جامعہ کا خون ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ نصاب میں جو بھی تبدیلی کی جائے اس میں مقاصد جامعہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے بھی جامعہ کو کالج بنانے کی کوشش ہو چکی ہے، لیکن اسے کام یاب نہیں ہونے دیا گیا۔ اور آئندہ بھی اسے قرآن وحدیث اور عربی زبان وادب کا مرکز ہی رہنا چاہیے۔ ملک میں کالجز کی کمی نہیں ہے۔ اگر کالج بنانے کا شوق لوگوں کو ہے تو الگ سے بنالیں۔ جامعہ کے ڈھانچے اور اس کے نصاب میں اس طرح کی تبدیلی اس کے روح کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

جامعہ سے مولانا کی علاحدگی کا حادثہ بھی ایک تکلیف دہ امر تھا۔ مولانا کو اس سے تکلیف تھی۔ یوں تو ضابطے کے مطابق انتظامیہ اور عاملہ نے اپنا کام کیا تھا لیکن ضابطوں کے نفاذ میں جن حکمت عملی کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا شاید اس کی پاس داری نہ کرنے کی وجہ سے مسائل پیچیدہ ہو گئے۔ علاحدگی کے بعد جب مولانا سے ملاقات ہوئی اور مسئلہ زیر گفتگو آیا تو مولانا نے کہا کہ اس بابت میں اب زبان بندی پر عامل ہوں اور یہی کہتا ہوں کہ افوض امری الی اللہ۔ اتنا کہہ کر دیر تک خاموش رہے لیکن ان کی نم آنکھوں نے سب کچھ بیان کر دیا۔

مولانا کی زبان عربی ہو کہ اردو دونوں معیاری تھی، لیکن طبیعت میں تکلف تھا۔ اس وجہ سے تقریر وتحریر سے عام طور پر بچتے تھے۔ لیکن جب تقریر کرتے تو زبان وبیان کی چاشنی سے سننے والا خوب محظوظ ہوتے تھے۔ حالاں کہ عربی زبان میں مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار کا عربی میں ترجمہ

آپ نے کیا تھا جس کی اشاعت کویت سے ہوئی تھی۔انشااورادب سے آپ کی خاص دل چسپی تھی۔تفسیر سے بھی گہرا لگاؤ تھا لیکن زیادہ تر اپنے استاذ اختر احسن اصلاحی کی رایوں پر ہی ارتکاز رہتا تھا۔حساس طبیعت کے مالک تھے اس لیے طلبہ کے سوالات کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ انہیں دوران درس سوالات سے تکدر ہوتا تھا۔تفسیری رائیں تدبر قرآن کے اردگرد ہی رہتی تھیں۔

مودودی ہاسٹل کے ہال میں دائیں اور بائیں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جنوب میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ رہتے تھے اور شمال میں مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب۔

میرے ایک ساتھی الجامعۃ السّلفیہ بنارس سے آئے ہوئے تھے۔ میں نے مولانا سے ملاقات کرانے کی غرض سے ان کے کمرے میں لے گیا۔مولانا تھوڑی دیر گفتگو کی اس کے بعد چائے بنانے کے لیے اسٹوپ جلانے لگے۔ میں نے ان سے بہت گزارش کی کہ مجھے بنانے دیں لیکن مولانا نے کہا کہ مہمان معزز ہوتا ہے مہمان کے ساتھ آنے والا بھی اکرام کا مستحق ہوتا ہے، بالآخر باصرار انہوں نے چائے تیار کی اور آخر میں پیالی بھی ہمیں نہیں دھلنے دیا۔ ہمارے ساتھی پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا۔ باہر نکل کر میرے ساتھی نے کہا کہ اتنے کریم النفس اساتذہ آج کے زمانے میں یہاں ہیں۔ یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی جگہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

مولانا انتہائی شفیق تھے۔ میں نے سات سال کا وقت جامعہ میں گزارا۔ کسی بچے کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا، کسی بات پر ناگواری ہوتی تو یہ کہتے تھے کاش ایسا نہ ہوتا، کاش کہ انہوں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

مزاج میں غایت درجہ انکساری تھی۔ششماہی امتحان ہوا۔تعطیل ہوگئی تھی۔ مولانا دفتر تعلیمات میں زمین پر بیٹھ کر کچھ کام کر رہے تھے۔قریب کے کسی گاؤں کا ایک شخص دفتر میں داخل ہوا۔اس نے معلوم کیا کہ صدر مدرس صاحب کہاں ملیں گے؟ ان دنوں صدر مدرس ہی طلبہ کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔مہتمم کا شعبہ الگ سے نہیں تھا۔مولانا نے کہا کیا کام ہے۔خاک سار کو ہی صدر مدرس سمجھ لیجئے۔اس نے کہا کہ معاف کیجیے میں تو آپ کو دیکھ کر سمجھا کہ کوئی کلرک یا چپراسی ہے۔مولانا نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔خاک سار سارے کام انجام دیتا ہے۔آپ نے ٹھیک ہی سمجھا۔آپ کام بتائیں۔

طلبہ کے لیے ہمدردی تھی، ایک دن مولانا اپنا گھڑا لے کر باہر نکلے، پانی لینا چاہتے تھے ان دنوں واٹر سپلائی کا سسٹم جامعہ میں نہیں تھا اور نہ ہی بجلی برابر رہتی تھی۔ ہر طالب علم کے پاس لالٹین ہوتی تھی، جب لائٹ

نہیں ہوتی تو اسے سے پڑھتے تھے۔ مولانا پانی لینے کے لیے کھڑے تھے باہر ہینڈ پمپ پر طلبہ کی بھیڑ تھی، وہ اس انتظار میں تھے کہ بھیڑ کم ہو تو جا کر پانی لے آئیں۔ میں نے بڑھ کر مولانا کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا، ہینڈ پمپ پر اس کو دھل رہا تھا کہ ایک بچہ کا ہاتھ لگا اور گھڑا ہینڈ پمپ سے ٹکرا گیا جب اس میں پانی بھرا تو اس سے پانی گرنے لگا۔ پانی گر کر افسردہ حالت میں ٹوٹا گھڑا لے کر ان کے پاس پہنچا اور بتایا کہ گھڑا ٹوٹ گیا ہے، کہنے لگے بہت اچھا ہوا میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ یہ بہت پرانا ہو گیا ہے نیا گھڑا خریدنا تھا۔ اچھا ہو گیا اس میں پانی ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ لوٹا دے کر کہا اس میں پانی لے آیئے، کام چل جائے گا۔

مولانا کی اس تسلی کا میرے اوپر بہت گہرا اثر ہوا، گھر پر اپنے بچوں کو بڑا سے بڑا نقصان پر میں نے کبھی بھی سرزنش نہیں کی۔ اس طرح دس سال تک درس وتدریس کے میدان میں رہا، بچوں کے ساتھ شفقت وہمدردی کا رویہ اپنا تا رہا۔

مولانا علاء الدین پٹی کے رہنے والے تھے۔ علمی خانوادے سے تعلق تھا، مولانا عبدالسلام ندوی صاحب دارالمصنفین کے خاندان سے تھے۔ مولانا کے دادا صاحب بڑے عالم تھے، والد بھی بہت ہی علم دوست تھے۔ ان کی ذاتی زندگی میں اخلاق ومعاملات میں بڑی بلندی تھی۔ کئی بیٹیوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کو بہنوں کی محبت اور مولانا کی شفقت ملی اور وہ زیادہ تعلیم نہیں حاصل کر سکے، گھر پر کاروبار دیکھتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور اہل وعیال وجملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

امانت ودیانت کے پیکر مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ

مولانا محمد اسماعیل فلاحی

اس کے عینی شاہدین اب بھی موجود ہیں، اب سے کم وبیش پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ استاد محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی اپنے گھر علاءالدین پٹی میں ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ مولانا کو سانپ ڈس لیتا ہے۔ زہر سرایت کرتا جارہا ہے، چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ اعزہ واقارب اردگرد اکٹھا اور پریشان ہیں کہ کیا جائے۔ دیکھتے دیکھتے احباب چارپائی کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں، جان بچانا ہے تو اسپتال جلد از جلد پہنچنا ہوگا۔ مولانا کی زبان کھلتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے پہلے فلاح لے چلو۔ کچھ ضروری حساب کرنا ہے کرلوں، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، بعد میں کہیں اور لے جانا۔ مولانا کے اصرار پر احباب پہلے انہیں جامعۃ الفلاح لاتے ہیں۔ یہاں دارالاقامہ میں دیکھتے دیکھتے بات پھیل جاتی ہے، طلبہ کا یہ حال جیسے کہ ان کے کسی بہت ہی قریبی عزیز کو سانپ نے ڈس لیا ہو، سب بے چین ہوجاتے ہیں، بعض تو رونے لگتے ہیں۔ بہرکیف مولانا فلاح پہنچ کر متعلق افراد سے پیسوں کا کچھ حساب کتاب اور زیر تعمیر اس مسجد کی بابت کچھ باتیں کرتے ہیں جو انھیں کی نگرانی میں تعمیر ہورہی تھی اور جس کے بارے میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اس مسجد کو ندوہ میں ہونا چاہیے۔ اس سے فراغت کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ اطمینان ہوگیا۔ اب جہاں لے چلنا ہے لے چلیے۔ حکیم محمد ایوبؒ بھی آپہنچے ہیں اور ان کی گاڑی سے انھیں بلریاگنج سے صدر اسپتال اعظم گڑھ لے جایا جاتا ہے۔ حکیم صاحب ساتھ ہیں اور رات کا وقت ہے، دکانیں بند ہیں۔ حکیم صاحب کے توسط سے رات میں میڈیکل شاپ کھلوا کر دوالی جاتی ہے اور علاج شروع ہوجاتا ہے۔

اس موقع پر بہت سے طلبہ کا پیدل ہی راتوں رات بلریاگنج سے اعظم گڑھ پہنچ جانا، طلبہ کے اندر مولانا کی ہر دل عزیزی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ جب انسان کی موت سامنے ہو تو اس کے جذبات واحساسات کیا ہوتے

ہیں۔ وہ بال بچوں کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے، گھر بار، کاروبار اور جائداد کی فکر ہوتی ہے، لیکن اس موقع پر مولانا پر جو فکر چھائی تھی وہ یہ تھی کہ اپنے رب سے معاملہ کیسے صاف کریں۔ امانت و دیانت اور ذمہ داری کا یہ احساس مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی زندگی کا بڑا پیارا اور ابھرا ہوا پہلو ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی جامعۃ الفلاح کے بالکل ابتدائی معماروں میں ہیں۔ ان سے قبل مولانا شبیر انور اصلاحی جامعہ آچکے تھے۔ ان حضرات نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی ٹیم تیار کر لی، جس میں مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا شہباز اصلاحی اور مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی جیسی نابغۂ روزگار شخصیات تھیں۔ بعد میں اس ٹیم میں مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری، مولانا ظفر اثری، مولانا محمد عمران خان فلاحی، حافظ احسان الحق فلاحی، مولانا نعیم الدین اصلاحی، ماسٹر مناظر احسن صاحب، ماسٹر افضال مشہدی اور ماسٹر عبداللہ جیسے باصلاحیت، محنتی، حوصلہ مند افراد شامل ہوگئے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی کوشش ہوتی تھی کہ جس حد تک ممکن ہو تجربہ کار، باصلاحیت اور ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے والے افراد شامل ہوتے جائیں، تاکہ ادارہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر سکے۔ ایک بار میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد اخلاق فلاحی کے سامنے مولانا نے ذکر کیا: کیا اچھا ہوگا اگر مولانا شہباز (۱) اصلاحی، (میرے والد) مولانا محمد عالم صاحب اور اسماعیل فلاحی یہاں آجاتے۔

مولانا محمد عالم صاحب (۲) شعبہ ابتدائی کو سنبھال لیتے اور اسماعیل فلاحی قرآن پڑھاتے لیکن مولانا شہباز صاحب کو ندوہ چھوڑے گا نہیں اور ندوہ کے ان کے اوپر احسانات بھی ہیں۔ ایک سے زیادہ بار مولانا نے مجھ سے کہا: اپنے ابو اور چھوٹے چچا مولانا محمود عالم اصلاحی کو یہاں بلالو، ان کی یہاں ضرورت ہے۔ غرض ہمیشہ وہ اس فکر میں رہتے کہ کام کے افراد کہاں سے اور کیسے مل سکتے ہیں، جس کا نتیجہ تھا کہ جامعۃ الفلاح کو اساتذہ کی ایک اچھی ٹیم میسر آگئی۔

مولانا اچھے باصلاحیت استاد تھے۔ عربی زبان و ادب اور قرآن پر گہری نگاہ تھی۔ دورِ حاضر میں اساتذہ بالعموم مدرس کے لیے منتخب جواب پر قانع اور مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن مولانا کا مطالعہ وسیع تھا۔ دیوان الحماسہ، معلقات، جمہرۃ خطب العرب اور دوسری امہات الکتب پر ان کی اچھی پکڑ تھی۔ برادر مکرم حافظ احسان الحق

۱۔ یہ اس وقت کی بات ہے مولانا شہباز اصلاحی ندوۃ العلماء سے وابستہ ہو چکے تھے۔

۲۔ مولانا محمد عالم صاحب مدرسۃ الاصلاح میں رہ چکے تھے، مولانا عبدالحسیب اصلاحی ان کے علم، محنت اور کسی ادارے کو چلانے کی صلاحیت سے واقف تھے۔

فلاحی نے جب کہ وہ عربی پنجم کے طالب علم تھے،مولانا سے درخواست کی کہ نصاب سے ہٹ کر بقیہ دیوان الحماسہ انھیں پڑھا دیں۔مولانا نے فرمایا: میرے پاس وقت نہیں ہے۔چھٹی بعد گھر جاتے ہوئے راستے میں اگر آپ پڑھنا چاہیں تو ممکن ہے۔حافظ صاحب علم دوست آدمی تھے تیار ہوگئے۔کچھ دنوں تک راستہ میں درس کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔پھر مولانا نے جامعہ ہی میں اپنے کمرہ میں پڑھانا شروع کردیا۔باب المراثی کی تکمیل کے بعد باب النسیب کا بھی کچھ حصہ پڑھایا۔

مولانا ایک اچھے اصلاحی تھے،فکر فراہی کو اچھی طرح جذب کرلیا تھا۔مولانا امین احسن اصلاحی جب پاکستان منتقل ہوگئے تو مولانا فراہی کے مسودات کو نقل کرکے ان کے پاس بھیجنا ایک اہم کام تھا۔مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے میرے سامنے ذکر کیا کہ ان کو بھیجنے کے لیے وہ مسودات انھوں نے ہی نقل کیے تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی خواہش اور کوشش تھی کہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں جس طرز سے نحو صرف،عربی ادب اور قرآن کی تعلیم ہوتی ہے،وہی طرز فلاح میں اختیار کیا جائے اور قرآن کو محور اور مرکز بنا کر سارے علوم کی تدریس ہو۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی مولانا اختر احسن اصلاحی کے شاگرد رشید تھے،ان سے خصوصی استفادہ کیا تھا۔ان سے استفادہ کے نوٹس مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے پاس موجود تھے،جس زمانہ میں مولانا جلیل احسن ندوی کا تدبر قرآن پر جائزہ شائع ہورہا تھا۔مولانا عبدالحسیب صاحب میرے سامنے فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی جائزہ شائع ہوتا ہے،میں مولانا اختر احسن اصلاحی سے استفادہ کیے ہوئے نوٹ سے ملاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ مولانا اختر احسن اصلاحی کی وہی رائے ہے جو مولانا ندوی نے اختیار کی ہے۔یہ واضح رہے کہ مولانا جلیل احسن ندوی نے بھی مولانا اختر احسن اصلاحی سے بہت استفادہ کیا تھا اور وہ ان کے بڑے قدردان تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی ایک بڑے زمین دار تھے،لیکن کھیتی باڑی سے عملاً کوئی تعلق نہیں رکھا۔جس زمانہ میں چک بندی ہورہی تھی،لوگ چک بندی کرنے والوں سے جا جا کر ملتے تھے تاکہ ان کے چک کو مناسب جگہ ملے۔مولانا کی خوداعتمادی اور غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ان کے در پر حاضری دیں۔چک بندی آفیسر کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا آدمی ہے،اتنا بڑا کاشت کار ہے،لیکن سب آئے اور یہ نہیں آیا۔وہ خود مولانا کے یہاں حاضر ہوا،ان سے بات کی،متاثر ہوا اور مولانا کے چک اچھی اچھی جگہوں پر کردیے۔

مولانا نہایت خوش خط تھے۔ساتھ ہی اردو،عربی دونوں میں تحریر وتقریر پر اچھی قدرت رکھتے تھے،جب بولتے تھے تو لگتا تھا کہ ٹکسال گھر سے تازہ تازہ ڈھلے ڈھلائے الفاظ نکلے چلے آرہے ہیں اور لعل و گہر بکھرتے

جارہے ہیں۔ مولانا ان دونوں میدانوں کے شہسوار تھے، وہ چاہتے تو اپنی صلاحیت کا لوہا منوا سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہمیشہ اپنے کو پیچھے رکھا اور دوسروں کو آگے بڑھایا۔ ایک دفعہ انھوں نے ذکر کیا تھا کہ طالب علمی کے زمانہ میں وہ جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور ایک مسابقہ میں شرکت کے لیے گئے تھے اور پہلی پوزیشن لے کر لوٹے تھے۔

مولانا طالب علمی کے زمانے ہی میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہوگئے تھے، اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے اور اس کے نظم کی پوری پابندی کرتے۔ وہ فکرِ فراہی اور فکرِ مودودی کو ایک دوسرے سے متضاد نہیں سمجھتے تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہی سلف کی فکر ہے۔

مولانا سب سے زیادہ لمبے عرصے تک جامعہ کے مہتمم رہے اور جامعہ کو تعلیم و تربیت کے پہلے سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ وقت اور نظام کے پابند تھے۔ جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ان کا نمایاں حصہ ہے اور جامعہ کی مسجد کی تعمیر کے حقیقی روح رواں وہی تھے۔

کچھ دنوں قبل ایک تعزیتی نشست میں، میں نے ان کے سلسلے میں سنا کہ وہ تدبر قرآن سے پڑھایا کرتے ہیں اور کلاس میں تدبر لے کر جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تدبر تو بعد میں آئی، اس کے پہلے وہ کس سے پڑھاتے تھے؟ ہم نے اپنے پورے دورِ طالب علمی میں، پھر تدریس کے تقریباً تیس سالہ دور میں کبھی تدبر لے جاتے نہیں دیکھا، ہاں کبھی کبھی شوکانی کی فتح القدیر ہاتھ میں ہوتی تھی۔ تدبر کی قدر و قیمت کے یقیناً وہ قائل تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تدبر سے پڑھاتے ہوں۔ کچھ رایوں کا تدبر سے مل جانا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی منبع اور سرچشمہ سے سیراب مختلف اساتذہ کی رایوں میں توافق ایک عام سی بات ہے۔ جامعۃ الفلاح کے سینئر اساتذہ کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ایک تفسیر سے نہیں پڑھاتے۔ وہ براہِ راست قرآن پڑھاتے ہیں۔ ان کے سامنے تمام مستند تفسیریں ہوتی ہیں اور وہ ان کا عطر اور خلاصہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جامعۃ الفلاح میں کسی ایک متعین تفسیر کے بجائے تمام اہم تفسیریں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی اور حافظ احسان الحق فلاحی کا یہی اندازِ تدریس ہے۔ خدا کرے کہ ان کے بعد کے اساتذہ اس راہ پر گام زن ہوں۔

درسگاہ اسلامی لہریا سرائے دربھنگہ بہار کا جائزہ لینے اور مشورے کے لیے مولانا عبدالحسیب صاحب کو اس درس گاہ کے بانی حسنین سید صاحب بلاتے رہے۔ بالآخر مولانا نے سفر کا ارادہ کیا تو حسنین سید صاحب

نے لکھا کہ اسماعیل کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔ چنانچہ میں بھی ساتھ ہولیا۔

اس سفر میں وہ درس گاہ بھی دیکھی، ان کی کثیر المقاصد مسجد بھی دیکھی جس کے مختلف حصے مختلف کاموں کے لیے مختص تھے۔ ہندو پاک بٹوارے میں بعض حادثات کے گواہ چند مقامات بھی نظروں سے گزرے۔ اس سفر میں مولانا نے اپنے اس رفیق سفر کا از حد خیال رکھا۔ حسنین صاحب نے بعد میں متعدد خطوط میرے والد محترم مولانا محمد عالم صاحب، مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور ناظم جامعہ مولانا صدرالدین اصلاحی کے نام لکھے کہ اسماعیل کو درس گاہ اسلامی لہریا سرائے بھیج دیا جائے۔ انھیں کفاف دیا جائے گا۔ میں اپنی صلاحیتیں جامعۃ الفلاح میں لگانا طے کر چکا تھا۔ اس لیے محترم حسنین سید صاحب سے معذرت کر دی۔

اور آخر میں ایک دل خراش بات! مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے ساتھ ایک بڑا حادثہ یہ ہوا بلکہ یوں کہا جائے کہ جامعۃ الفلاح کو بہت بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب ارباب جامعہ نے انھیں ۲۰۰۴ء میں جامعہ سے رخصت کر دیا جب کہ ابھی ان کے قویٰ مضبوط تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ وہ اس کے بعد پچھلے ساتھ تک بندول کی ایک درس گاہ میں علاء الدین پٹی سے پیدل چل کر آتے اور پڑھاتے رہے، جب کہ ان دنوں بھی جب انھیں ریٹائر کیا گیا تھا وہ علاء الدین پٹی سے پیدل چل کر بلریا گنج اکثر آجاتے تھے اور جہاں تک پڑھانے کی صلاحیت کی بات ہے تو جو شخص چالیس سال سے باصلاحیت ہے، اس کی صلاحیت کہاں چلی گئی؟

مقامِ حیرت ہے کہ ایک شخص جس نے اپنی جوانی لگائی ہو، اپنے بال سفید کیے ہوں، ہڈیاں گھلائی ہوں، جو اس کے بنیادی معماروں میں رہا ہو، اسے بہ یک جنبشِ قلم یوں چلتا کر دیا جائے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی بلاشبہ ادارے کا وقار تھے، ادارے کی ناک تھے، ادارے کی پہچان اور اس کی آن و شان تھے۔ وہ مبتدی اساتذہ کو تیار کر سکتے تھے، ایسی شخصیتیں اگر صرف بیٹھ کر رہیں تو بھی ادارے کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔

شخصیتیں دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک کھری، دوسری ملمع۔ کھری شخصیتیں جیسی اندر ہوتی ہیں ویسی ہی باہر نظر آتی ہیں۔ اندر اور باہر میں فرق نہیں ہوتا۔ صاف، ستھری اور پاکیزہ۔ ملمع شخصیتیں دو رنگی ہوتی ہیں، اندر کچھ باہر کچھ، اوپر سے چوغہ پہنے ہوئے جو ان کے اندر کی اصلیت اور شخصیت کو چھپائے رہتا ہے۔ مولانا بلاشبہ پہلی شخصیت کے مالک تھے۔ خود نمائی اور خود ستائی سے بہت دور، ہر موقع پر اپنے کو پیچھے رکھنا، کیمروں سے دور، خاکساری اور تواضع کے ساتھ سادگی کا پیکر لیکن غیرت و خودداری کو ہاتھ سے جانے دیے بغیر۔

وہ چاند اب بھی میرے دل میں نور افشاں ہے

مولانا افتخار الحسن ندوی

مولانا عبدالحسیب اصلاحی کا نام کہیں سن لیتا ہوں تو میرے کاشانہ تصور میں شرافت وتمکنت کے اجالے چمک اٹھتے ہیں۔ ان کے اوصاف حمیدہ، سادگی، پاکیزہ طبعی، تہذیب نفسی، پختہ کاری، تمکین وخودداری، حزم گفتاری، سلامت روی، رواداری، بردباری، تربیت یافتگی، شایستگی واستواری، نرم خوئی اور شریفانہ آہنگ ومزاج اور خوش وضعی کی بہشت بریں اپنی پرفریب کشش کے ساتھ روبرو آجاتی ہے۔ یادوں کی اس حسین جنت میں تھوڑی دیر کے لیے کھوسا جاتا ہوں۔

میرا خیال ہے، خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جس کسی کو بھی ان کی معیت وہم نشینی کے شرف وسعادت کی سرفرازی حاصل ہوئی ہے، ان کی پری جمال یادوں کے جھونکے جب اس کے دل کو چھو کے گزرتے ہوں گے تو ان کی پروقار شخصیت کی جمال آفرینی سے وہ کچھ دیر تک محفوظ ومسرور ضرور ہوتا ہوگا اور ان کی روح پرفتوح پر عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کیے بغیر نہ رہتا ہوگا۔

وقار وتمکنت، شایستگی ومتانت اور شرافت وکرامت ان کی شخصیت کا جوہر فرد تھا۔ وہ گھر پر ہوں، جامعہ میں ہوں، کلاس روم میں ہوں، اپنے حجرہ خاص میں ہوں یا سرراہ کوچہ بازار میں کہیں ان سے ملاقات ہوجائے ہر جگہ ان کی سج دھج کی کڑی دھوپ میں وقار وشرافت کی پرچھائیاں لہراتی بل کھاتی رقصاں نظر آتیں اور ہر دیکھنے والے کے دل ونگاہ کو جذب وکشش سے مسحور ومخمور بنا جاتیں۔

مولانا جس معزز خانوادے کی علمی وادبی وراثت کے امین اور اس کی تہذیبی روایات کے نمایندہ تھے، یہ شرافت وکرامت اسی کا جزو جمال تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا اضافہ کیا؟ اس کا فیصلہ ان کا سوانح نگار کرے گا۔ میں پچیس سال سے زیادہ مدت تک ان کی رفاقت وموانست کے حوالے سے پورے اعتماد ووثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ان خاندانی روایاتِ شرف وفضیلت کے احیا میں انھوں نے کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہیں

برتی۔ان کی زندگی کی داستان فضل وکمال، ان ہی روایات، میراث کی حصول یابیوں کی روداد ہے۔ان خاندانی یا ذاتی امتیازات وخصوصیات کے ساتھ وقت کے نامور ادیب، حدیث وقرآن کے شارح وترجمان، مولانا امین حسن اصلاحی کا شرف تلمذ انھیں حاصل ہوا تو ان کی کیمیا اثر صحبت نے ان پر وہی کام کیا جو کام سونے پر سہاگہ کرتا ہے۔ان ذاتی وجاہت کے ساتھ ان کی شخصیت عالمانہ شان وشکوہ کا بھی مظہر کمال ہوگئی، کم گوئی اور کم آمیزی کو میں ان کی خوئے دل ربائی کہا کرتا تھا۔یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے کسی سے بے تکلفانہ رسم وراہ کی طرح کبھی نہیں ڈالی کہ بسا اوقات اسی کا سرا بے ادبی سے جاملتا ہے۔طلبہ اور اساتذہ میں بے تکلفی انھیں قطعاً پسند نہ تھی، ان کے دور صدارت میں، میں نے بعض مواقع پر دیکھا کہ باہمی قربت کی شدید ضرورت کے وقت بھی طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ادب واحترام کے فاصلے کبھی ٹوٹنے نہیں پاتے اور بے تکلفی کے نتیجہ میں ادب واحترام کے تقاضوں سے بے اعتنائی کا کوئی مظہر سامنے نہیں آیا۔اس معاملے میں وہ کچھ زیادہ حساس بھی تھے۔کسی استاد کے ساتھ معمولی گستاخی پر بھی وہ رنجیدہ خاطر ہوجاتے تھے ایک پرائمری کے استاد مولوی ادریس کے ساتھ کوئی ایسا ہی معاملہ پیش آیا تو طالب علم کی طرف سے عفو درگزر کی سفارش کرنے لگے اور اس وقت تک کرتے رہے جب تک کہ ان کے چہرے سے گرد ملال زائل نہ ہوگئی۔کسی استاد سے طلبہ کو بے تکلف دیکھتے تو اس کی تنبیہ ضرور کرتے۔اس معاملے میں ان کی شدت پسندی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے ادبی کو روح تعلیم کے منافی سمجھتے تھے۔اگر تعلیم روح انسانیت کی غذا ہے تو ادب واخلاق انسانی فطرت وجبلت۔وہ ادب کے استاد تھے، کہا کرتے تھے کہ کسی زبان کا ادب پڑھ لینے سے اس زبان کی لسانی غلطیوں سے انسان محفوظ ہوجاتا ہے۔اس کی زبان سے جو جملہ ادا ہوگا، قواعد واصول کے مطابق ہوگا۔لیکن ادب کا رمز وہ آشنا اس وقت ہوگا جب زبان کی غلطیوں سے اجتناب کے ساتھ ساتھ اعضا اور جوارح کی غلطیوں اور بے ادبیوں سے محفوظ رہے۔اس کے بغیر کوئی کسی زبان کے ادب کا رمز آشنا یا ادا شناس نہیں ہوسکتا۔

ان کی شخصیت کا ایک دل پذیر پہلو خودی ہے جس کو یاران نیک نام نے مورد عتاب وطعن ٹھہرادیا۔ان کا شکوہ یہ ہے کہ ان کی خودی نے انانیت کی قبا پہن لی تھی۔جس کے نتیجہ میں خشونت، کرختگی، سخت گیری اور جارحیت ان کے برتاؤ کی لازمی صفت بن گئی تھی اور دنیا طلبی کا رجحان ان پر غالب آگیا تھا اسی وجہ سے ریٹائر منٹ کے بعد بالمقطع مشاہرہ کے عوض جامعہ کی خدمت پر آمادہ نہ ہوئے اور گھر پر بیٹھ رہے۔اس سلسلے میں کسی طرح کی صفائی پیش کرنے سے پہلے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خودی کو خود غرضی کا ہم معنی سمجھ لینے کی وجہ

سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی، ورنہ مولانا کی خودی کو عرفان ذات کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ صاف طور پر خدا آشنا دکھائی دیتی ہے اور خودی جب خدا آشنا ہوتی ہے تو خود انحصاری انسان کی سرشت بن جاتی ہے جو خدا پہ توکل کا ثمرہ ہے۔ بالمقطع مشاہرہ میں چونکہ اس کو قبول کرنے والے کے کم عیار ہونے کا بھی ایک پہلو ہے، اس لیے کوئی خدا مست متوکل اسے قبول کرنا کیوں کر گوارا کر سکتا ہے۔

مولانا کی بے نفسی، زاہدانہ استغنا اور درویشانہ قلندرانہ بے نیازی ان کے توکل کے آثار ومظاہر تھیں یا دنیا طلبی کی حرص سے ہم رشتہ؟ فیصلہ خود کریں۔ آج کل مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران میں مال ومتاع دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی طلب کے جو افسانے یا واقعات عام سے عام تر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے دلوں سے ان کی ہمدردی کے احساس کو ناپید کرنے کا سبب بن رہے ہیں؟ بحمد اللہ جامعۃ الفلاح ان سے اس لیے محفوظ و مامون اور نیک نام ہے کہ مولانا جیسی مہتاب صفت شخصیت کے اجلے اجلے کارنامے اس کی پیشانی کا نور بن کر ضوفشاں ہیں۔ یاد کیجیے کہ ایک مشہور ومعروف عالم دین مولانا کے پاس تشریف لائے، خوبی قسمت سے سعودی عرب کے اغنیا اثریا میں ان کی دین داری کو اعتبار و اعتماد کی سند حاصل تھی اور بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس قدر ومنزلت اور توقیر کے توسط سے وہ ان کے صدقات وخیرات کی خطیر رقم ہندوستان کے مدارس میں تقسیم کرنے کی غرض سے حاصل کر لیا کرتے تھے۔ انھوں نے جامعہ کی دینی وملی خدمات کو سراہتے ہوئے تعاون کی پیش کش کی، مولانا نے جامعہ سے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا، پھر انھوں نے اپنے کمیشن کا فیصد طے کرنے کی بابت جیسے ہی کچھ کہا، مولانا نے فوراً صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے تعاون کی گرانقدری اور رقم کی کثرت و بہتات کے حوالے سے ان کو رام کرنے کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ مولانا نے فرمایا:

''ہم مدرسہ اللہ کی مدد اور سہارے پر چلاتے ہیں۔ و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔''

فیصلہ کیجیے، کیا خودغرضی کا پروردہ یہ کردار پیش کر سکتا ہے۔ یقین کیجیے کہ کردار کی ایسی پختگی اور بلندی بڑے بڑے مشاہیر کے یہاں بھی شاذ ونادر ہی مل سکے گی۔ ایسا پاک باطن، پاک دل اور پاک نگاہ سپہ سالار یا میر کارواں جامعہ کو اب مشکل سے مل سکے گا جس گرمی نفس سے ایک ایک طالب علم کی رگ میں اخلاص حرکت و عمل کی بجلیاں دوڑ جائیں۔ ان کی ایک لائق ستائش خوبی یہ بھی تھی کہ وہ طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ میں بھی اخلاص کی اسپرٹ پیدا کرنے کے بڑے جتن کرتے تھے۔ دینی ماحول کی آبیاری کے لیے اساتذہ کی باہمی

وہ چاند اب بھی میرے دل میں نورافشاں ہے

رقابت کو بڑا سنگین خطرہ سمجھتے تھے، اس کی کبھی کوئی آہٹ محسوس کرتے تو مولانا عمران مدظلہ کی شاہ کرمی کی مدد سے اس کو فرو کرنے کی دل آویز تدبیر کرتے۔ وہ رسیاول، گوجیا اور کبھی بریانی کی ضیافت کا سب کے لیے اہتمام کرتے اور ناؤنوش کے دل کشا ماحول میں باہمی گفت وشنید کے ذریعہ ہی اس کا سدباب ہوجاتا۔

اسی مقصد کے تحت وہ طلبہ کی نگرانی کے لیے کسی استاد کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیتے اور بڑی احتیاط برتتے تھے۔ کسی نو وارد غیر فلاحی استاد کو اس ذمہ داری کے لیے قطعاً موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس راز سے واقف تھے کہ نگرانی اختیار واقتدار کی وہ قوت ہے جس سے طلبہ کو دباؤ میں لیا جا سکتا ہے اور باہمی رقابت کے موقع پر ان سے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے۔

●●

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

(الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبائل بنا دیے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی یاد میں

پروفیسر محمد اسحاق فلاحی

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ کے معروف اور بزرگ استاذ مولانا عبدالحسیب اصلاحی بلریا گنج سے تھوڑے فاصلہ پر واقع موضع علاءالدین پٹی میں ۱۳/اگست ۱۹۲۸ء کو ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے بعد امام حمید الدین فراہیؒ سے منسوب مشہور و معروف دینی ادارہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ میں داخل ہوئے، جہاں سے دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسہ میں تعلیم کے دوران ہی وہ جماعت اسلامی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اپنی تعلیم کے حصول کے بعد وہ مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت مدرس بھی وابستہ ہوئے، لیکن ایک عرصہ کے بعد وہ اس سے الگ ہوگئے۔ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج کے قیام اور ترقی میں آپ کے ساتھیوں کے ساتھ آپ کا کلیدی کردار رہا ہے۔ جامعۃ الفلاح کے قیام و انصرام سے وابستہ ہونے کے بعد یہ ادارہ ان کے دل و دماغ میں ایسا آباد ہوا کہ وہ کسی حال میں خود کو اس سے جدا نہ کر سکتے تھے۔ انتظامیہ نے بعد میں انہیں سبک دوش کر دیا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کبھی بھی وہ اس سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ اس ادارہ کے کارکنان، اساتذہ اور طلبہ کا حوصلہ بڑھاتے اور ان کی تعلیمی رہنمائی فرماتے تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے عالم و فاضل اور اس کے لیے لائقِ افتخار فرزند تھے۔ قرآن اور عربی زبان و ادب پر ان کی دل چسپی کے موضوع تھے۔ وہ فکرِ فراہی کے ترجمان تھے اور قرآن فہمی میں نظم قرآن کی اہمیت کو اساسی اہمیت دیتے تھے۔ مجھے ان کے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میں اس لحاظ سے اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جامعۃ الفلاح میں طالب علمی کے دوران (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء) ان سے علمی استفادہ کا موقع ملتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس ادارہ کی ترقی کے لیے بڑے کوشاں رہتے تھے اور اپنے طلبہ کی علمی ترقی میں بڑی دل چسپی لیتے اور ان سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔

اس جدید تہذیب کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ استاذ اور شاگرد کا قدیم رشتہ دھیرے دھیرے کم زور ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری روایت میں استاذ روحانی باپ کا درجہ رکھتا ہے۔ کاش آج ہم اس تصور کو سمجھتے اور اسے دوبارہ زندہ

کرنے کی عملی کوشش کرتے۔

ماں باپ اور استاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک ان کی حق میں تمہارے نعمت
(مولانا الطاف حسین حالی)

استاذ گرامی بڑے خوددار، منکسر المزاج، بااصول، ایمان دار اور مخلص استاد تھے۔ ہماری قدیم تہذیب و روایت کے وہ امین تھے۔ وہ عربی زبان وادب اور قرآن کے خاص طور پر بڑے عالم تھے۔ انہیں قرآن مولانا فراہی کے شاگرد خاص مولانا اختر احسن اصلاحی سے پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے ساتھیوں میں قرآنیات کے حوالے سے علم دوست ساتھیوں کی ایک ٹیم تھی۔ عربی زبان وادب سے ان کی خاص دلچسپی کے ساتھ اردو زبان وادب کے بھی مزاج شناس تھے۔ تدریس کے دوران ان کی زبان سے معیاری، علمی وادبی شان اور خوش طبعی اور ظرافت کا بھی اظہار ہوتا۔ وہ اپنے طلبہ کی علمی، اخلاقی اور جسمانی صحت کے لیے ہمہ وقت فکرمند رہتے تھے۔ وہ اپنا کام خود کرتے تھے۔ مہمانوں کی ضیافت اور ان کے ساتھ حسن سلوک ان کی عادت تھی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح۔ بعض معاصر تحریکوں اور تحریروں کے آئینہ میں ایک جائزہ اور تبصرہ ۱۹۷۸ء میں لکھی تھی۔ اس کا عربی میں ترجمہ **التفسیر السیاسی للاسلام** کے نام سے شائع ہوا۔ مصنف نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا تھا:

پیش نظر کتاب ایک علمی واصولی تبصرہ و جائزہ ہے، وہ نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ وفتاویٰ کی زبان میں۔ وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور 'الدین النصیحة' (دین خیرخواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش، اس کی کوئی سیاسی غرض ہے نہ کوئی جماعتی مقصد۔ اس ناخوشگوار کام کو محض عنداللہ مسئولیت وشہادت حق کے خیال سے انجام دیا گیا ہے۔ جو لوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، ان میں طلب حق کی سچی جستجو اور اپنی دینی ترقی وتکمیل کا جذبۂ صادق پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ صحت مند اور تعمیری تنقید اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے اور فکر وسعی اسلامی کی طویل تاریخ میں دین کے صحیح فہم وتفہیم اور اسلام کی صیانت وحفاظت میں اس سے ہمیشہ مدد لی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کا ایک نسخہ مصنف نے اپنے ذاتی خط کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ خط کی وصول یابی پر مولانا نے ۲۳؍جنوری ۱۹۷۹ء کو جو حسب ذیل خط لکھا تھا وہ مولانا کے علمی تواضع کے شایان شان تھا:

اے، ذیل دار پارک اچھرہ، لاہور پاکستان

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۵رصفر ۹۹ھ ملا اوراس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب 'عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح' کا ایک نسخہ بھی موصول ہوا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میری جس چیز کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی، مزید میری جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لیے مضرت رساں یا موجب خطر سمجھتے ہوں ان پر بھی آپ بلا تکلف تنقید فرمائیں۔ میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا، نہ میں اس پر برا مانتا ہوں۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کرلوں۔'

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(سید ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ، حصہ دوم، صفحہ ۲۸۰)

اس کتاب پر سید احمد عروج قادری نے تبصرہ لکھا جو مارچ اور اپریل ۱۹۷۹ء کے زندگی کے شماروں میں شائع ہوا۔ مولانا سید احمد عروج قادری کے اس اردو تبصرہ کا عربی میں ترجمہ **التفسير الحقيقي للاسلام في الرد على كتاب التفسير السياسي للاسلام للشيخ ابي الحسن علي الندوي** کے عنوان سے مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے کیا تھا۔

مولانا فراہی کی قرآنی خدمات اور ان کے بعد ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کی علمی و تحقیقی خدمات سے مولانا عبدالحسیب اصلاحی بے حد متأثر تھے۔ جولائی ۱۹۹۸ء کا رسالہ تدبر، (لاہور) مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں خاص شمارہ مکاتیب اصلاحی نمبر ہے۔ اس کی اشاعت کے موقع پر مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے اپنے نام اور ڈاکٹر عبداللطیف خاں کے نام مولانا امین احسن اصلاحی کے موصول شدہ خطوط ادارہ کو بھیجے تھے، جو اس شمارہ میں شائع ہوئے۔ اسی سے استفادہ کرتے ہوئے ذیل کی سطروں میں چند خطوط درج کیے جارہے ہیں:

مولانا عبدالحسیب اصلاحی جب مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر تھے، ۱۹۶۰ء میں انہیں خبر ملی کہ مولانا طویل عرصہ سے بیمار ہیں اور بیماری نے انہیں نڈھال کردیا ہے تو انہیں خط لکھ کر ان کی خیریت دریافت کی۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ۲راگست ۱۹۶۰ء کو مولانا عبدالحسیب صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:

’’آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔الحمدللہ اب میں بالکل اچھا ہوں۔آپ کی اس دریافت خیریت سے بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔میں اس بیماری کا یہ مبارک پہلو سمجھتا ہوں کہ اس کے سبب سے عزیزوں اور دوستوں نے مجھے اپنی دعاؤں میں یاد کیا۔میں آپ کے لیے علم اور عمل صالح کی کی دعا کرتا ہوں۔میں ایک ہفتہ کے لیے باہر چلا گیا تھا اس وجہ سے جواب میں تاخیر ہوگئی۔‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی،ڈاکٹر عبداللطیف خاں کو رحمان آباد، لاہور سے ۱۷؍جنوری ۱۹۷۷ء کو لکھتے ہیں:

مولوی عبدالحسیب صاحب کو میرا بہت بہت سلام لکھ دیجیے۔وہ میری کتابوں میں سے جس کتاب کو بھی ترجمہ کے لائق خیال کریں شوق سے اس کا ترجمہ کریں۔میں ان کی اس عزت افزائی کا شکرگزار ہوں۔اگر یہ چیزیں عرب ممالک میں روشناس ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوسکتی ہے۔میں خود ان کو اعظم گڑھ کے پتہ پر براہ راست خط لکھ دیتا،لیکن یہاں دیہات سے ان کو خط لکھنے میں مجھے زحمت ہوگی۔۔۔‘‘

ڈاکٹر عبداللطیف خاں کے نام ایک دوسرے خط مؤرخہ ۲۶؍جنوری ۱۹۷۷ء کو لکھتے ہیں:

المجتمع میں مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی، پرچہ معیاری اور اسلامی ہے۔مولانا عبدالحسیب صاحب ماشاءاللہ اچھی عربی لکھ لیتے ہیں، میں تو اب لکھنے اور بولنے میں تکلف محسوس کرتا ہوں۔ان کو میری طرف سے سلام اور شکریہ لکھ دیجیے اور اطمینان دلایئے کہ اس خدمت کو جاری رکھیں اور اس قسم کی مسامحات کی زیادہ پروا نہ کریں جن کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔(المجتمع کویت سے شائع ہوتا تھا۔اس میں قرآن مجید میں پردہ کے احکام کا ترجمہ شائع ہوا۔مدیر)

اگر ہجرت والا مضمون بھی آئے تو وہ بھی ضرور بھیجئے اور مولانا سلمہ کو میری کتاب ’اسلامی قانون کی تدوین‘ کا ایک نسخہ بھی بھیج دیجیے۔اس کے بعض مباحث بھی ترجمہ کے لائق ہیں۔اسی طرح ’اسلامی ریاست‘ بھی چھپ جائے تو وہ بھی ان کی خدمت میں بھیج دی جائے اور ’پاکستانی عورت‘ بھی۔ان کتابوں کے مباحث عام دلچسپی کے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی ۸؍اپریل ۱۹۷۹ء کو ڈاکٹر صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

آپ مولانا عبدالحسیب صاحب کو لکھ دیں کہ مولانا فراہی کی عربی تصنیفات کا تعلق تمام تر دائرۂ حمیدیہ سے ہے۔ان کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز مولانا بدرالدین صاحب ہیں، رہیں میری تالیفات تو دعوت دین کے عربی ترجمہ کی اجازت میں نے کرامت صاحب کو نہیں دی ہے، اگر وہ ترجمہ کرار ہے ہیں تو وہ بطور خود کرار ہے ہیں۔

میں اپنی کتابوں کے معاملے میں شروع سے ہی ایک مظلوم مصنف ہوں اور اپنی اس مظلومیت پر راضی ہوں۔ مولانا عبدالحسیب صاحب کو سلام لکھ دیجیے۔

۱۷؍اپریل ۱۹۷۹ء کو وہ لکھتے ہیں:

اس سے پہلے عبدالحسیب صاحب کے خط پر مشتمل ملفوف کا جواب لکھ چکا ہوں۔ امید ہے موصول ہوا ہوگا۔ ان کو لکھ دیجیے کہ میں ایک مظلوم مصنف ہوں۔ لوگ اسی طرح میری کتابیں اور ان کے ترجمے چھاپ رہے ہیں اور میں بے بس ہوں۔ اگر ان کا ترجمہ تیار ہو تو وہ چھاپ دیں، کرامت صاحب کی پروا نہ کریں۔ انہوں نے عربی ترجمہ کی اجازت مجھ سے نہیں لی ہے۔''

مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے تعلیم یافتہ اور اس کی قدروں کے محافظ بھی تھے اور جہاں بھی وہ رہے اپنی علمی، فکری اور عملی جدو جہد سے ان قدروں کو فروغ دینے میں حصہ لیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لاہور سے اساتذہ وطلبہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر کے نام ۱۹۹۰ میں ان ہی قدروں پر مبنی ایک پیغام بھیجا تھا۔ میری نظر میں ان کا یہ پیغام اصلاح اور فلاح دونوں کے لیے خاص طور سے معنویت کا حامل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''مدرسۃ الاصلاح کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبہ کے لیے ان کے ایک دور افتادہ دعا گو کی طرف سے، دعا اور سلام کے بعد، یہ پیغام ہے کہ وہ اپنے مدرسہ کے عظیم نصب العین کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد جن لوگوں نے بھی رکھا ہو لیکن اس کا تسویہ اور اس کے اندر نفخ روح کا کام استاذ امام فراہی نے انجام دیا ہے۔ یہی روح اس مدرسہ کا اصل امتیازی وصف ہے۔ جب تک یہ روح باقی ہے یہ مدرسہ باقی رہے گا، اس کے دشمن اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں گے۔ اگر خدانخواستہ یہ روح ختم ہوگئی تو پھر اس کا وجود اور عدم وجود دونوں یکساں ہے۔''

یہ سوال کہ یہ روح کیا ہے؟ اس کا جواب مدرسہ کے فاضل اساتذہ اور عزیز طلبہ سے پوشیدہ نہیں ہوسکتا۔ یہ جواب اس مدرسہ کی ایک ایک اینٹ پر کندہ ہے۔ یہ مدرسہ ایک عظیم فکری انقلاب کا تعلیمی اور دعوتی مرکز ہے۔ اس فکری انقلاب کی روح یہ ہے کہ قرآن کی حکمت اس کے طلبہ کے اندر اس طرح رچ بس جائے کہ وہ جو کچھ سوچیں اور جس چیز کو بھی رد یا قبول کریں قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر رد یا قبول کریں۔ یہی چیز ان کو اس قابل بنائے گی کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ پراگندہ بھیڑ کو ایک بنیان مرصوص بنا کر امت مسلمہ کی صورت میں کھڑا کر سکیں۔

یہ مقصد اگر آپ کو عزیز ہے تو ضروری ہے کہ آپ اپنے اندر ٹھوس قابلیت، اعلیٰ کردار اور اپنے بلند نصب العین کے لحاظ سے بلند نگاہی پیدا کیجیے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکیں گے جو اپنے نصب العین کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں، جو سستی شہرت کے طالب اور محض دنیوی مفادات کے پیچھے بھاگنے والے ہوں، وہ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو زندگی کی صراط مستقیم پر استوار رکھے۔ میں اگر چہ آپ لوگوں سے دور ہوں لیکن میرا دل ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان پر جینے اور ایمان پر مرنے کی توفیق بخشے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین"

مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے حسب ذیل عربی تراجم بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

(ا) التفسير الحقيقى للاسلام فى الرد على كتاب التفسير السياسى للاسلام للشيخ ابى الحسن على الندوى

تالیف: سید احمد عروج القادری، تعریب: عبدالحسیب الاصلاحی، صفحات: ۱۲۴، ناشر: مکتبۃ المنہل، جدہ، سعودی عرب، سن اشاعت: ۱۹۸۲ء

(۲) احکام الحجاب فی القرآن

تالیف: امین احسن اصلاحی، تعریب: عبدالحسیب الاصلاحی، صفحات: ۴۸، ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی

(۳) الدعوۃ الاسلامیۃ ومنہاجہا

تالیف: امین احسن اصلاحی، تعریب: عبدالحسیب الاصلاحی، صفحات: ۱۶۰، ناشر: ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۱۸ء

(۴) حقیقۃ الشرک

تالیف: امین احسن اصلاحی، تعریب: عبدالحسیب الاصلاحی

مولانا ایک بڑے عالم اور باعمل شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے جانے سے ایک بڑا خلا تادیر علمی و دینی حلقوں بالخصوص جامعۃ الفلاح میں محسوس کیا جائے گا۔

آہ! مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ

تحریر: ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی
ترجمانی: محمد انس فلاحی مدنی

اس سال سہ ماہی '**مجلة الهند**' کا پہلا شمارہ طباعت کے لیے تیار ہی تھا کہ اچانک مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی وفات کی خبر ملی۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ فارغینِ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) کے ان بڑے علماء میں سے تھے، جنہیں قرآنیات کے میدان میں نمایاں مقام حاصل تھا اور امام حمیدالدین فراہیؒ صاحب تفسیر '**نظام القرآن و تأویل الفرقان بالفرقان**' کے جید شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے شاگردوں کی آخری کڑی میں سے تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ سے میرے علمی تعلقات رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے علمی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ مولانا نے مجھے اپنا ایک عربی ترجمہ اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے ان کے کچھ خطوط محفوظ کر رکھے تھے، لیکن افسوس! دہلی سے شانتی نیکیتن اور وہاں سے دہلی واپسی میں وہ سب ضائع ہو گئے۔ مولانا اپنے دادا کی طرح خوش خط بھی تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے والد کا نام محمد عثمان اور دادا کا نام ابوعیسیٰ نور محمد ترابی تھا۔ آپ کی ولادت ۲۰/اگست ۱۹۲۸ء کو اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں علاؤالدین پٹی میں ہوئی۔ آپ کے دادا ابوعیسیٰ نور محمد ترابی اہلِ حدیث مکتبۂ فکر کے جید علماء میں سے تھے۔ ان کا ایک ذاتی مکتبہ تھا۔ بیش تر اوقات وہ اسی میں کتابوں کے مطالعے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی بعض تحریریں مطبوعہ شکل میں اور بعض مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں، جیسے '**السراج الوهاج للحجاج**'، '**تحفة الولدان**' اور '**تحفة الخليل**' وغیرہ۔ شیخ ابوعیسیٰ نے مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ کی ان کی تصنیف '**عون المعبود**' شرح 'سنن ابی داؤد' میں علمی معاونت بھی کی تھی۔ وہ خوش خط بھی تھے اور ہمیشہ اپنے گھر کی بالائی منزل کے کمرے میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ اس خطے کے دیگر زمین داروں کے برعکس ان کا گھرانہ تعلیم یافتہ تھا۔ سب کے سب خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے اور اللہ والے تھے۔ ان کے دادا کے علاوہ ان کے والد بھی ایک مدرسے میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے، جسے انہوں نے ہی اپنے گھر کے قریب ہی قائم کیا تھا۔ بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ وہ تعلیمِ بالغان پر بھی توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے ہی ۱۹۳۷ء میں بلریا گنج کے مکتب کو جامعۃ الفلاح میں تبدیل کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا اور بعد میں ان کے اس خواب کو ان کے لائق فرزند مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الفلاح کی تاسیسی بنیاد رکھتے ہوئے پورا کیا اور پھر شب وروز اس کی تعمیر وترقی میں جی جان سے لگ گئے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے تعلیمی سفر کا آغاز اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے سے ہی ہوا۔ وہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر بلریا گنج کے مکتب میں داخلہ لیا اور وہاں سے تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸/نومبر ۱۹۳۹ء کو ان کے والد نے ان کا داخلہ مدرسۃ الاصلاح کے مکتب کی تیسری جماعت میں ہی کرایا، ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اس طرح وہ دیگر طلبہ میں لائق وفائق بن جائیں گے۔ مدرسۃ الاصلاح سے مئی ۱۹۵۰ء میں آپ نے اپنی تعلیم مکمل کی۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے ساتھیوں میں مولانا شرف الدین اصلاحی (سنجر پور، اعظم گڑھ)، مولانا اکرام (سہریا، اعظم گڑھ) اور مولانا نصیر الدین (ارریہ، بہار) ہیں۔ موخر الذکر عربی ہشتم کے سالانہ امتحان میں ناکام ہوگئے تھے، اس لیے انہوں نے مدرسہ چھوڑ دیا تھا اور اپنے علاقہ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ایک مدرسے میں تدریس سے وابستہ ہوگئے تھے۔

جن اساطین علم وفن سے مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے کسبِ فیض کیا تھا ان میں منشی محمد کاملؒ، مولانا قمر الزماںؒ، مولانا شمیم احمدؒ، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ، مولانا مشتاق احمدؒ اور مولانا صدر الدینؒ شامل تھے اور ان کے نمایاں ترین استاد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے باضابطہ تو نہیں پڑھا تھا، البتہ مدرسۃ الاصلاح میں قیام کے دوران ان سے علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ اس کا تذکرہ انہوں نے ایک انٹرویو میں کیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے علمی تبحر اور عربی زبان وادب میں مہارت کے وہ بڑے مداح تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد انہوں نے محمد حسنین سیدؒ (قیم جماعت اسلامی ہند، حلقۂ بہار) کی

دعوت پر دربھنگہ (بہار) کا قصد کیا۔ حسنین سیدؒ نے انہیں ایک مدرسے میں تدریس کے لیے مدعو کیا تھا۔ لیکن اس علاقہ کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی اور وہ بیمار پڑ گئے۔ اس لیے چند ہفتوں کے بعد ہی لوٹ آئے۔ اس دوران ان کے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے انہیں اپنی مادرِ علمی میں ۲۵ روپے ماہانہ مشاہرے پر عارضی طور پر تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے بلایا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ عیدالاضحیٰ تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، لیکن جب چھٹیوں میں گھر جانا ہوا تو ان کی مشفق و مہربان والدہ نے ان سے کہا کہ اس عارضی ملازمت کو ترک کر دیں۔ مزید براں یہ کہ اسی دوران ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا اور ساری ذمہ داریاں ان کے سر آ گئیں۔ اس دشوار مرحلے نے انہیں تدریس ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر اپنے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی اجازت سے مدرسے کو الوداع کہہ دیا۔

اس کے بعد ان کا ارادہ گھر پر ہی رہنے کا تھا۔ لیکن سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ نے انہیں رام پور میں جماعت اسلامی کی 'درسگاہ اسلامی' میں تدریس کے لیے بھیج دیا۔ لیکن وہاں قیام کچھ زیادہ نہ ہو سکا۔ ایک ماہ ہی میں علی گڑھ چلے آئے، یہاں دعوتِ دین کا کام اور نمازِ جمعہ کی امامت کے ساتھ نوجوان طلبہ کی تربیت مقصود تھا۔ یہاں تین سال تک مقیم رہے، اس دوران ان کے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے دو مرتبہ خط لکھا کہ مدرسۃ الاصلاح میں تدریس کے لیے واپس آ جائیں۔ پہلے انہوں نے انکار کیا، لیکن دوسری مرتبہ راضی ہو گئے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح میں ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء (چھ سال) تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ رمضان ۱۹۵۹ء میں ان سے جماعت اسلامی کی فکر اور نظم سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مدرسے سے الگ ہو جانے کے لیے کہا گیا۔ خیر آپ نے نہ چاہتے ہوئے بھی مدرسۃ الاصلاح کو خیرآباد کہہ دیا۔

اسی دوران حج کے لیے درخواست دی تھی، وہ قبول ہوئی تو حج کے لیے جانے سے قبل مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے ان سے ملاقات کی اور ان سے جامعۃ الرشاد (اعظم گڑھ) کی تاسیس کی خواہش کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مدرسے کے پہلے مدرس اور صدر مدرس بنیں۔ آپ نے مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی اس دعوت کو صمیم قلب سے قبول کیا۔ حج کی ادائیگی کے بعد جامعۃ الرشاد آ گئے اور یہاں دو سال تک رہے۔ جامعۃ الرشاد میں قیام کے دوران ہی حکیم محمد ایوبؒ (بلریا گنج) نے اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور جامعۃ الفلاح سے منسلک ہونے کے لیے کہا، تا کہ وہ اس کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اس شرط پر راضی ہوئے کہ بانی جامعۃ الرشاد مولانا مجیب اللہ ندویؒ اجازت دیں۔ا مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے اجازت دے دی اور آپ جامعۃ الفلاح سے وابستہ ہوگئے اور چالیس سال کا طویل عرصہ اس کی خدمت کرتے گزرا۔ اس عرصے میں متعدد مرتبہ صدر مدرس بنائے گئے۔

آپ نے جامعۃ الفلاح کو بلندی کے مقام پر لے جانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جامعۃ الفلاح کی وسیع وعریض مسجد ان کی مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ ۲۰۰۴ء میں آپ کو جامعہ سے سبک دوش کر دیا گیا۔ یہ لمحہ آپ کے لیے بہت غم ناک اور دردناک تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ 'کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، جس دن میں یہ سوچ کر نہ روتا ہوں کہ مجھے قرآن کریم کی تدریس سے محروم کر دیا گیا'۔

جامعۃ الفلاح سے رخصت ہونے کے بعد بندول (اعظم گڑھ) کے ایک مدرسے میں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے اور بارہ سال تک اس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریس ترک کر دی اور بغرضِ آرام گھر پہ رہنے لگے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا انتقال ۲۵/فروری ۲۰۲۰ء کو بیانوے (۹۲) سال کی عمر میں ہوا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ وہ دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے، دوشنبہ کے دن مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہوئے اور دوشنبہ کے دن ہی انتقال ہوا۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ماہر قرآنیات تھے۔ جماعت اسلامی، جس کی تاسیس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رکھی تھی، اس کی فکر سے متفق اور اس کی جانب مائل تھے، چنانچہ ۱۹۴۹ء میں انہیں جماعت اسلامی کا رکن بنایا گیا اور تاعمر جماعت سے وابستہ رہے۔ قرآن کریم ان کی شب وروز کا مرکز ومحور تھا اور وہ فکرِ فراہی کے نامور امین تھے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور جامعۃ الفلاح کی مجلسِ شوریٰ کے سرگرم رکن تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ جاہلی عربی شاعری کے بھی ماہر تھے۔ انہیں 'دیوان الحماسۃ' کے قصائد کا اکثر حصہ یاد تھا۔ اس سے انہیں قرآن کے اسرار ورموز اور لغوی ومعنوی مفاہیم کی تعیین میں بہت مدد ملتی تھی۔ قرآن کو جاہلی ادب سے سمجھا جائے، یہ فکر امام فراہیؒ نے عام کی تھی۔ اس کا ذکر ان کے مختلف رسالوں میں ملتا ہے۔

عربی زبان وادب پر عبور کی وجہ سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے آپ کو اپنی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ آپ کے سفرحج کے موقع پر آپ کا 'رمی الجمار' سے متعلق ایک عربی مقالہ 'مجلۃ

الحج، میں شائع ہوا تھا۔

آپ کے شاگردوں میں متعدد مشہور علماء و مصنفین شامل ہیں، جنہوں نے آپ سے دوارنِ درس استفادہ کیا تھا۔ آپ کے مشہور تلامذہ کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔ڈاکٹر عنایت اللہ اسد سبحانی

۲۔پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

۳۔مولانا تقی الدین ندوی

۴۔مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی

۵۔مولانا محمد اسماعیل فلاحی

۶۔ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

۷۔صباح الدین اعظمی

۸۔ڈاکٹر محی الدین غازی

آپ کے مشہور عربی تراجم حسب ذیل ہیں:

۱۔**التفسیر الحقیقی للاسلام** (مؤلف۔مولانا سید عروج احمد قادری) یہ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب '**التفسیر السیاسی للاسلام**' کا رد ہے۔ یہ مکتبۃ المنھل، جدہ، سعودی عرب سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔

۲۔**احکام الحجاب فی القرآن** (تصنیف۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ) یہ پہلے مطبعۃ الکوثر سے، پھر ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

۳۔ **الدعوۃ الاسلامیہ و منھاجھا**، یہ مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب 'دعوت دین اور اس کا طریقہ کار' کا عربی ترجمہ ہے۔ ۲۰۱۸ء میں ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔

۴۔ **حقیقۃ الشرک**، زیر طبع ہے۔ یہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی کتاب 'حقیقت شرک' کا ترجمہ ہے۔

۵۔تعلقات قرآنیہ، اردو زبان میں سہ ماہی مجلّہ 'دعوت القرآن' (لکھنؤ) میں شائع ہوئیں۔

اسی طرح ان کے متعدد مقالات و مضامین جماعت اسلامی کے سہ روزہ اخبار 'دعوت' میں شائع ہوئے۔

اجلا اجلا پیراہن

ڈاکٹر صباح الدین اعظمی

۲۵ر فروری ۲۰۲۰ء بروز منگل کو دن ڈھلے خبر آئی کہ آج سہ پہر وہ سورج غروب ہو گیا، جس کی کرنوں نے نو دہائیوں تک علم وادب کی دنیا کو ضیا بخشی تھی۔ ہمارے بے حد محترم اور عزیز استاد جناب عبدالحسیب اصلاحی نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں ان کے مقامات بلند کرے۔ آمین

ان کی رحلت کے بعد جامعۃ الفلاح کے قیام کی مہم کا ایک بے لوث سپاہی جہاں فانی سے رخصت ہو گیا۔ جس نے اس ادارے کی تعمیر اور بقا کے لیے اپنا تن من دھن سب نچھاور کر دیا تھا۔ مولانا نے جامعہ کی تاریخ کے مختلف نازک لمحوں میں نہایت جانفشانی سے، آگے بڑھ کر لشکر کی کمان سنبھالی اور نہایت بے جگری سے تن دئی باد مخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے جامعہ کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحل سے ہم کنار کیا۔ جامعہ کی تعمیر وترقی میں ان کا لازوال کردار آنے والی ان نسلوں کے لیے مشعل راہ رہے گا جو کہ قدر شناسی کی خو سے آشنا ہیں۔

میری زندگی میں سیکھنے کے سفر میں جو چند روشن مینار یادداشت میں نقش ہیں، ان میں مولانا کی شخصیت کا مینار بہت بلند اور روشن نظر آتا ہے۔ ان سے سیکھی باتیں لاشعور میں رہ کر آج بھی کردار کی پرورش کرتی رہتی ہیں۔ خود اعتمادی، قناعت، شائستگی، شیریں بیانی، اپنے کام خود کرنے کی عادت، سادگی کے ساتھ سلیقہ مندی، نرمی کے ساتھ اصول پسندی، نرم خوئی اور عاجزی کے ساتھ انتظامی امور کی مضبوط ادائیگی۔ ان سے سیکھے ہوئے زندگی گزارنے کے کتنے ہی گر آج بھی کردار کو جلا بخشتے ہیں۔

مولانا سے ہمیشہ عقیدت اور احترام کا تعلق رہا۔ عربی درجات میں وہ میرے استاد بھی رہے۔ جامعہ سے تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد ہمیشہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا، اب جب ان کی رحلت کی خبر سنی تو یادوں کے کتنے ہی دریچے وا ہو گئے۔

رمضان کے روزے ختم ہوتے، عید آتی، نیا تعلیمی سال شروع ہوتا اور جامعہ میں رونق لوٹ آتی۔ نئے سال میں نئی کتابیں، نئے مضامین، نیا ولولہ، جب سے ہوش سنبھالا یہی معمول تھا۔ اب جب عربی درجات میں پہنچے تو حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ غالباً ۱۹۸۲ء کا سال تھا، رمضان کے ابتدائی دنوں میں مولانا جلیل احسن ندویؒ اچانک جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ رمضان کے بعد جب جامعہ کھلا تو ایک اندوہ ناک سانحہ ہو گیا۔ پورے جامعہ میں ایک غم کا ماحول تھا۔ ہر کوئی اداس تھا۔ جیسے تیسے تدریسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ مولانا کو نامساعد حالات میں صدارت کی ذمے داریاں سنبھالنی پڑیں۔ صدارت کے ساتھ ساتھ مولانا تفسیر اور ادب کی کلاسز بھی لیتے تھے۔ ہماری دیوان الحماسہ کی کلاس تھی اور قدیم عربی اشعار زیر درس تھے۔ ایک شعر زیر مطالعہ آیا:

يا أيها العام الذى قد رابنى   أنت الفداء لذكر عام أولا

أنت الفداء لذكر عام لم يكن   نحسا ولا بين الأحبة زيلا

شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے مولانا جذباتی ہو گئے، کچھ ایسا سماں باندھا کہ آج بھی یہ شعر یاد داشت میں محفوظ ہے۔ کہنے لگے کتنا افسوس ناک یہ سال ہے جس میں حضرت مولانا ہم سے جدا ہو گئے۔ مدرسہ میں کتنا بڑا حادثہ پیش آیا۔ مولانا رقیق القلب تھے۔ سنا تھا لیکن دیکھا پہلی مرتبہ۔ کیسے ایک قدیم عربی شعر کو موجودہ حالت سے جوڑا، یہ ان کی بحیثیت استاد مہارت تھی۔ ایسی مہارت کہ طالب علم کو چار دہائیاں گزرنے کے بعد بھی یاد ہے۔

ستر کی دہائی کے ابتدائی سال یاد آتے ہیں۔ جامعہ میں مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ چند ہی سالوں میں شان دار مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد کی سادہ طرز تعمیر، وسعت اور خوب صورتی آج بھی آنکھوں کو سرور دیتی ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو ہر زبان پر یہی تذکرہ سنا کہ اتنی شاندار مسجد کی تعمیر مولانا کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا نے کویت اور دیگر عرب ممالک کا سفر بھی کیا۔ یہ جامعہ کا عرب ممالک سے غالباً پہلا رابطہ تھا، جو مولانا کی بدولت ممکن ہوا۔ مسجد کی طرزِ تعمیر میں مولانا کا ذوق جھلکتا ہے۔ بلا شبہ آج اس میں مانگی گئی دعائیں مولانا کے لیے توشۂ آخرت ہوں گی۔

ہم نے جب سے آنکھ کھولی مولانا کو جامعہ میں دیکھا۔ مولانا کی جو شبیہ ذہن میں سب سے پہلے ابھرتی ہے وہ ان کا سفید براق لباس ہے۔ بغیر کالر والی سفید قمیص اور پاجامہ، ہاتھ میں چھڑی جو وقار میں اضافہ کرتی، موسم کے لحاظ سے شیروانی بھی زیب تن کرتے۔ یاد نہیں آتا کہ کبھی ٹوپی کے بغیر دیکھا ہو۔ اعظم گڑھ کے زمین

دار گھرانے کے افراد عموماً فصیح اردو نہیں بولتے۔لیکن مولانا کی گفتگو میں غضب کی فصاحت اور حلاوت تھی، اردو زبان وادب پر قدرت تھی، محاورے اور اشعار کا برمحل استعمال ان کی گفتگو کا خاصہ تھا،عربی زبان وادب پر کمال کا عبور حاصل تھا۔ جامعہ میں اس وقت وہ تنہا تھے جو فی البدیہہ عربی زبان میں خطاب کر سکتے تھے۔ان دنوں عرب مہمان کئی مرتبہ آئے۔ان کے سامنے مولانا کی فصیح عربی بولنے کی مہارت دیکھ کر ہمارے سر فخر سے بلند ہو جاتے۔اور کافی عرصے تک جامعہ میں اس کا ذکر رہتا۔ مولانا کو عربی تحریر پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کے ترجمہ کیے ہوئے مضامین جماعت کے عربی جریدے الدعوہ میں سلسلہ وار شائع ہوئے تھے۔

مولانا اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاوالدین پٹی میں پیدا ہوئے، وہیں بڑے ہوئے۔ کھاتے پیتے زمین دار گھر کے چشم و چراغ، پڑھا لکھا گھرانہ، مولانا عبدالسلام ندویؒ سے قریبی تعلق تھا۔ بلریا گنج کے مکتب سے جو بعد میں جامعۃ الفلاح بنا ابتدائی درجات کی تعلیم حاصل کی، پھر مدرسۃ الاصلاح میں عربی درجات کی تعلیم مکمل کی۔ دوران تعلیم مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے قریب ہوئے اور پھر ساری عمر ان کے سحر میں مبتلا رہے۔ الاصلاح کی ان کی کوئی بھی گفتگو مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے ذکر خیر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے رامپور اور پھر علی گڑھ میں تحریک اسلامی کے زیر سایہ کچھ عرصہ گزرا۔ لیکن دل تو مدرسۃ الاصلاح میں لگا تھا وہیں واپس آ گئے۔ تفسیر قرآن اور عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے۔ تعلیم قران اور فکر فراہی سے جو مولانا کی عقیدت تھی اس کو دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ وہ مدرسہ الاصلاح کے لیے ہی بنے تھے۔ لیکن جامعۃ الفلاح کی خوش قسمتی کہ تحریک اسلامی سے تعلق کی بنا پر مولانا دیگر اہل صفا کے ہمراہ زیر عتاب ٹھہرے اور نامساعد حالات میں اصلاح چھوڑنا پڑا۔ اہالیان بلریا گنج کے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ تھی۔ گاؤں کے قدیم مکتب کے عربی درسگاہ کے لیے ترقی کے سفر میں مولانا کی صلاحیت کی ضرورت تھی۔ لیکن درمیان میں کچھ عرصے کے لیے جامعۃ الرشاد کا جملہ معترضہ آ گیا، بالآخر اہالیان بلریا گنج کی کوششیں رنگ لائیں اور معززین بلریا گنج کے پرزور اصرار پر مولانا قافلہ سخت جان میں شامل ہو گئے۔ مولانا نے مادر علمی مدرسۃ الاصلاح کو چھوڑ کر جامعۃ الفلاح کی دنیا آباد کی۔ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جامعہ آئے اور چار عشرے سے زائد یہیں گزار دیے۔ ان کی آنکھوں نے اجاڑ بنجر زمین پر ابھرتے در و دیوار دیکھے۔ مدرسہ اسلامیہ کے چھپر سے جامعہ کے کھپریل اور پھر پختہ عمارت میں تبدیل ہوتے مناظر دیکھے۔ جامعہ کو ایک چھوٹے سے مکتب سے اٹھ کر ایک معیاری اور معتبر درس گاہ میں بدلتے دیکھا۔ وہ جامعہ کے ترقی کے سفر کے صرف گواہ ہی نہیں بلکہ اس کا

ایک اہم حصہ بھی رہے۔ جامعہ کے علمی وتدریسی ارتقا کے معمار رہے۔ جامعہ کے درودیوار کی ایک ایک اینٹ ان کی کاوشوں اوران کی کوششوں کی گواہ رہے گی۔ جامعہ سے فارغ ہر طالب علم جس نے ان سے تعلیم حاصل کی ہے ان کا مقروض رہے گا۔

کیا جامعہ نے مولانا کی قدر کی؟ اس کا جواب خوش کن نہیں ہے۔ آج کے مادی دور میں جو جنس سب سے ارزاں ہے وہ قدر شناسی ہے اور ہمارے ادارے بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ لیکن اعلیٰ ظرف کے حامل اشخاص اداروں کو شخصیات سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اشخاص کی ان کے نزدیک اہمیت نہیں ہوتی، اشخاص سے اختلافات کو وہ اداروں سے عقیدت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ مولانا بھی اعلیٰ ظرفی کے بلند مقام پر فائز تھے۔ مدرسۃ الاصلاح نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جامعۃ الفلاح میں آخری دنوں میں ان پر کیا بیتی؟ اس کی شکایت کبھی لب پر نہیں لائے۔ ان دواداروں سے ان کی عقیدت اور بے لوث لگاؤ آخری دم تک قائم رہا۔

مولانا شعوری زندگی کی ابتدا ہی میں فکر مودودی سے متاثر ہوئے اور تا عمر تحریک اسلامی کا حصہ رہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد ان کو جب پتہ چلا کہ مرکز جماعت سے ایک وفد مولانا کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور جارہا ہے تو بلا تاخیر بلریا گنج سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے اور مرکز کے وفد کے ہم راہ مولانا مودودی کے جنازے میں شرکت کی۔ مولانا فراہیؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے عقیدت کو ایک ساتھ نبھانے کے ہنر میں مولانا اپنے ہم عصروں سے منفرد تھے۔

مولانا نے طویل عمر پائی۔ اصلاح کی تعلیم اور تدریس اور رامپور اور علی گڑھ کے قیام کے چند سال نکال دیں تو عمر عزیز کا باقی طویل حصہ جامعہ میں گزرا۔ رہائش ہمیشہ گاؤں میں ہی رہی۔ جدی پشتینی زمینیں ضرورت کے لیے کافی تھیں۔ ذہنی اور فکری آسودگی کے لیے جامعہ کا علمی ماحول مل گیا، زیادہ کی کبھی خواہش نہیں کی، زندگی خوشی خوشی گزار دی۔ چار عشرے تک زندگی کا روٹین طے تھا۔ روز صبح سویرے ایک ہاتھ میں ناشتہ دان اور دوسرے ہاتھ میں چھتری لیے جامعہ میں مسجد سے متصل مغرب کی سمت کے دروازے سے داخل ہوتے اور شام ڈھلے جامعہ بند ہونے کے بعد اسی راستے سے واپس گاؤں چلے جاتے۔ اس معاملے میں وہ ٹھیٹ گھریلو تھے۔ ایک ایسا شخص جو دن ڈھلتے ہی گھر لوٹنے کے لیے بےچین رہے تاکہ اپنے اہل وعیال کے درمیان وقت گزار سکے۔ مولانا صرف بڑے عالم دین، ماہر استاد، بہترین منتظم ہی نہیں تھے، بلکہ وہ ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والے شوہر بھی تھے۔ اقربا اور اعزا کا خیال رکھنا ان کا وطیرہ تھا، رشتہ داریاں نبھانا، دور قریب کے رشتہ

داروں کے یہاں ہر موقعہ پر حاضر ہونا اور نہ جانے کتنی عام سی نظر آنے والی خوبیاں ان کی زندگی کا حصہ تھیں۔اوراس معاملے میں وہ خالص خاندانی تھے۔

میری ان کے ساتھ بے حد قیمتی یادیں جڑیں ہیں۔ان سے سیکھے بہت سے جملے ابھی بھی یاد ہیں اور لاشعوری طور پر کبھی کبھی آج بھی بے ساختہ زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔ جامعہ کی پرانی بلڈنگ کے مرکزی ہال کے ایک کونے میں ان کے چھ بائی آٹھ کے اس کمرے میں جہاں انھوں نے چالیس سال گزار دیے پیتل کے اسٹو پر ان کے ہاتھ کی بنی چائے پینے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔وہ کسی اور کو چائے بنانے کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔ چائے بنانا تو دور کی بات ہے کسی کو نل سے پانی لانے کا بھی موقع نہیں دیتے تھے۔ان کی خودداری کسی سے خدمت لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی۔نرمی دلی کسی کو زحمت دینا گوارہ نہ کرتی۔طلبہ ہاتھ سے لوٹا چھیننے کی کوشش کرتے رہ جاتے اور مولانا نانہ نہ بچہ کہتے نل تک پہنچ جاتے۔ایسے مناظر میرے جیسے ان گنت طلبہ نے بار ہا دیکھے ہوں گے۔

مولانا نے بھرپور زندگی گزاری۔ ایک ایسی زندگی جو ہر طرح سے کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ بے شمار سوگوار چاہنے والے اور بیش قیمت یادیں چھوڑیں۔ چلتے پھرتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کے چاہنے والے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔آنے والے دنوں میں ان کے عقیدت منداپنی یادوں اور جذبات کا اظہار کرتے رہیں گے۔تعزیتی نشستیں ہوتی رہیں گی۔اور یہ سب ہونا بھی چاہیے،احسان شناسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

میری یادوں کے البم میں مولانا کی بہت سی تصویریں ہیں جو آج یکے بعد دیگرے فلیش بیک میں نظروں کے سامنے آرہی ہیں۔ جامعہ میں ملک اور بیرون ممالک سے آئے معزز مہمانوں کے ہم راہ پروقار انداز میں اسٹیج پر متمکن تصویر، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر کی آمد کے موقع کی تصویر، علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے آمد کی تصویر، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی آمد کی تصویر، دفتر صدارت میں صدر جامعہ کی کرسی پر بیٹھے مولانا کی تصویر، کلاس میں درس دیتے ہوئے تصویر، طلبہ سے مسجع اردو میں خطاب کرتے ہوئے تصویر، ہر تصویر اجلی اجلی نظر آتی ہے۔اور میں انھیں صاف محفوظ رکھنا بھی چاہتا ہوں، لیکن ایک تصویر ایسی ہے جو چاہتا ہوں کہ دھندلی ہو جائے، میموری سے ڈلیٹ ہو جائے لیکن یہ اور انلارج ہو کر ذہن کے پردے پر آجاتی ہے۔

چند سال پہلے جامعہ میں کوئی جبلی منائی گئی یا کوئی بڑا فنکشن تھا۔ دور دور سے فارغین جامعہ تشریف لائے تھے۔مولانا جامعہ سے سبک دوش کیے جا چکے تھے۔ وجہ عمر کے اس حصے پر پہنچنا تھا جس کے بعد انسان کسی ادارے کے کام کا نہیں رہتا۔مولانا جامعہ کے لیے کارآمد نہیں رہے تو قریب کے گاؤں بندول کے مدرسے

نے ان کی خدمات مستعار لے لیں۔اس فنکشن کے موقع پر وہ بندول کے گاؤں میں اپنی خدمات دے رہے تھے۔ظاہر سی بات ہے وہاں سے چھٹی لے کر ہی آئے ہوں گے۔ سینے پر بڑا سا بیج لگائے مولانا کا ویڈیو دیکھا۔ایک صاحب ہاتھ میں مائک لیے مصنوعی لہجے میں روایتی سوال پوچھ رہے ہیں: آج آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ مولانا شائستگی سے جواب دے رہے ہیں۔ جواب ریکارڈ ہو گئے۔مولانا نے کچھ کہا تو نہیں لیکن دل میں ایک کسک تو ضرور ہوئی ہوگی۔میرے عزیزو! اتنا تو پوچھ لو کہ مولانا جب آپ اتنے صحت مند ہیں کہ علاء الدین پٹی سے بندول پیدل چل کر جاتے ہیں تو کیوں نہیں جامعہ آ کر طلبہ کو اپنی صلاحیت سے استفادہ کا موقع دیتے؟

لیکن یہ انیس سو ساٹھ نہیں تھا اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ تھا۔ وہ لوگ راہی ملک عدم ہو چکے تھے، جنھوں نے مولانا کے گھر جا کر ان سے جامعہ آنے کے لیے اصرار کیا تھا۔ جامعہ کے نئے ہاسٹل کی بنیاد ڈالی جانے والی تھی جس کا کروڑوں کا بجٹ تھا۔ بیش قیمت پوشاکوں میں ملبوس لاکھوں کمانے والے نوجوان فلاحی حضرات نے اس کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ نئے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے اب مولانا جیسی بوڑھی ہڈیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ نیا دور تھا، نئے چہرے، نئے ریت و رواج کا چلن، حالات بدل چکے تھے۔ بدلتے رت میں مولانا کی اہمیت اب اتنی ہی تھی کہ کسی فنکشن کے موقع پر آ کر آگے کی کرسی پر بیٹھ کر چپ چاپ سب دیکھتے رہیں۔فوٹوسیشن میں شامل ہوں، ویڈیو پیغام ریکارڈ کرائیں اور خاموشی سے واپس چلے جائیں۔عہد رفتہ کی یادگار بن کر۔کسی رئیس کے گھر میں لگی اینٹیک پیس کی طرح۔

فنکشن ختم ہوا۔ چمک دار ریشمی خیمے لپیٹ دیے گئے۔ باہر سے آنے والے زائرین واپس لوٹ گئے۔ سفید بے داغ لباس میں ملبوس مولانا نے چاروں طرف دیکھا۔ جامعہ کی مسجد نئی توسیع کے بعد مزید دل فریب لگ رہی تھی۔ جہاں کبھی کھپریل کا کمرہ ہوا کرتا تھا وہاں اب نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ اجاڑ بیابان اور بنجر زمین پر اگا سبزہ اور ہرے بھرے درخت آنکھوں کو تازگی بخش رہے تھے۔ نئے ہاسٹل کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے کھودی گئی تازہ بھربھری مٹی دور سے دکھائی دے رہی تھی۔مولانا نے نظریں جھکائیں اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اسی دروازے سے جو چالیس سال تک ان کی رہ گزر تھا واپس گاؤں چلے گئے، اگلے روز صبح پھر گاؤں سے بندول کا سفر۔

کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

ایک کامیاب معلم، ایک دوراندیش منتظم

مولانا محمد حسن حبیب فلاحی

مارچ ۲۰۱۹ء کو انجمن طلبۂ قدیم کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے بہانے مادر علمی کی زیارت ہوئی اور مولانا سے آخری ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ علاء الدین پٹی کے اپنے ایک دیرینہ ہم سبق اور دوست ڈاکٹر مظفر عالم فلاحی کی دعوت پر مولانا کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ یوں تو مادر علمی کے ہر سفر کے موقع سے مولانا سے ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ حالیہ سفر میں تفصیلی ملاقات کا ارادہ تھا لیکن اجلاس کے اوقات کی تنگی کے سبب تفصیلی ملاقات نہ ہوسکی۔ چنانچہ مختصر ملاقات پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس ملاقات میں بھی آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سلام اور خبر خیریت کے فوراً بعد دریافت فرمایا: نیپال میں کتنی تعداد ہے فلاحیوں کی۔ جواب میں تقریباً سو کی تعداد سن کر مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور دعائیں دیں۔ گفتگو کا وہی نرالہ انداز اور لہجہ میں وہی سکوت وٹھیراؤ تھا جو تقریباً ۳۲ سال پہلے تھا اور جس کو دیکھ کر میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مولانا سے میری یہ آخری ملاقات ہوسکتی ہے۔ ورنہ نیپال کے اہل فلاح کے نام ایک پیغام ریکارڈ کروانے کی گزارش کر لیتا۔ نیپال میں فارغین الفلاح کی تعداد سن کر اظہار مسرت مولانا کی وسعت نظری اور مادر علمی کی وسعت خدمات پر اللہ کی حمد اور تشکر نیز فکر مندی کی بین دلیل ہے۔

مولانا نے انتہائی سنگین اور تعلیم وتربیت کے لحاظ سے سخت حالات میں جامعہ کے صدر مدرس کی ذمہ داری سنبھالی اور جامعہ کے تعلیمی اور تربیتی نظام کے پتوار کو سہارا دیا۔ میں اس وقت عربی سوم کا طالب علم تھا۔ ایک صدر مدرس کی حیثیت سے تعلیمی اور تربیتی نظام میں بہتری لانے کے لیے عمومی حاضری سے لے کر درس کے معمول بہ اوقات اور دارالاقامہ کے اوقات کی تنظیم نو میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ خصوصاً دارالاقامہ کے تربیتی نظام میں طلبہ میں پائی جانے والی کمزوریوں کا دقت نظری کے ساتھ جائزہ لیا۔ مولانا نظام الدین اصلاحی حفظہ اللہ جیسی مدبر اور باوقار شخصیت کو نگرانِ اعلیٰ اور بزرگ ترین مربی شخصیات جناب مولانا ابوبکر

اصلاحی اور مولانا صغیر احسن اصلاحی رحمہما اللہ کو نگرانی کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ اس دور میں بعض ناخوشگوار حالات بھی پیش آئے اور بعض دفعہ عوامی مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کے تجزیہ میں اختلاف کی گنجائش ہے۔لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا کے یہ سارے اقدامات اخلاص پر مبنی تھے اور انہوں نے جس چیز کو جامعہ کے حق میں بہتر سمجھا اس کو اختیار کیا۔ جامعہ کے تربیتی نظام میں بہتری کی خاطر مولانا نے جو اقدامات کیے تھے وہ آج بھی مربیان گرامی اور اصحاب مدارس کے لیے اپنی افادیت اور ضرررسانی کے لحاظ سے تحقیق کا موضوع ہے کہ اس کا کوئی متبادل تھا یا نہیں اور آج کے حالات میں اس کے کیا امکانات ہیں۔لیکن ان سب کے باوجود اس میں شک نہیں ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ جامعہ کے مفاد کی خاطر کیا اور اس کا محرک جامعہ کا تحفظ و ترقی تھا۔اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ مولانا مرحوم نظام تربیت کے ایک تجربہ کار تشخیص کار ہی نہیں ایک ماہر جراح بھی تھے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

استاد محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ پر وقار اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک باصلاحیت منتظم، ایک کامیاب نگراں، ایک روحانی مربی، ایک جلیل القدر مفسر، ایک پروقار صدر مدرس اور تجربہ کار و کامیاب معلم تھے۔ آپ کو اردو اور عربی زبان میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ گفتگو اور تذکیر کے دوران مسجع اور مقفع جملے انتہائی خوش اسلوبی اور سلاست کے ساتھ ادا کرتے اور طلبہ کے کانوں میں رس گھولتے ۔اسمبلی میں کبھی اردو اور کبھی عربی زبان میں تذکیر فرماتے اور ہم رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے۔ یہ مدرسۃ الاصلاح کے قدیم نظام تعلیم کا اثر تھا یا مولانا کے بزرگ اساتذہ مولانا اختر احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے فقید المثال بزرگوں کی صحبت تھی کہ مولانا عربی زبان میں خطبات وانشا پردازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ عربی سے اردو زبان کے ترجمہ کے مقابلے میں اردو سے عربی میں منتقل کرنا عموماً دشوار سمجھا جاتا ہے لیکن مولانا نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ فارغین فلاح اور فضلا مدارس کے لیے ایک نمونہ ہے۔

مولانا کی طبیعت میں خودداری، تواضع اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے طلبہ اور عزیزوں سے اپنا کوئی کام لینا کسی حال میں بھی گوارہ نہ تھا۔ مجھے یاد ہے جب سید مودودی ہال کے جنوبی حجرہ میں مولانا قیام پذیر تھے ان دنوں میں سید مودودی ہال سے متصل ہی جنوبی کمرہ میں ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، مولانا انعام اللہ فلاحی اور دیگر ہم نشینوں کے ساتھ رہتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب مولانا پانی لینے کے لیے باہر نکلتے تو جو طالب

علم بھی دیکھتا وہ مولانا کے ہاتھ سے لوٹا لینے کی کوشش کرتا اور کامیابی کی امید میں کچھ دور ساتھ چلتا رہتا۔ میں نے بھی کئی بار کوشش کی اور اسی امید میں کچھ دور تک ساتھ چلتا رہا لیکن بالآخر مولانا خود ہی نل تک پہنچ کر پانی لینے میں کامیاب ہوجاتے۔ مولانا کسی قدر چائے کے عادی تھے۔ لیکن مال وثروت کے اعتبار سے قدرت کے باوجود کفایت شعاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ کبھی خوش قسمتی سے مولانا کے لیے چائے بنانے کی موقع مل جاتا تو بڑے ظریفانہ لہجہ میں بولتے: بچہ دودھ بقدر اشک بلبل ہی ڈالنا۔

مولانا کے عہد صدارت میں جب میرے کندھوں پر جمعیۃ الطلبہ کے سکریٹری کی ذمہ داری آئی تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا کی سخت اصول پسندی کے سبب کام میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں اور جمعیۃ الطلبہ کی بہت ساری سرگرمیوں کی تنفیذ میں تاخیر ہورہی ہے۔ سکریٹریٹ کے مشورہ سے خاکہ عمل ترتیب پایا اور دفتر تعلیمات میں درخواست پیش کی گئی۔ انجمن طلبۂ قدیم کی جانب سے اس وقت کے انجمن کے صدر اور مخلص داعی جناب نسیم احمد غازی فلاحی کی رہ نمائی اور مدد بھی ہمیں حاصل تھی۔ لائبریری کی توسیع اور ترتیب نو، اور استفادہ کی آسانی کے پیش نظر مکتبہ میں موجود کتابوں کی فہرست کی اشاعت اور دارالمطالعہ کی تزئین کے ساتھ سالانہ مجلّہ کی اشاعت یہ بہت سارے امور تھے جو طے شدہ منصوبہ کے تحت انجام پانے تھے۔ مولانا کی اصول پسندی کی وجہ سے ابتدا میں کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، جس سے طلبہ کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان سارے کاموں کی انجام دہی میں تاخیر کی اصل وجہ مولانا کی سخت گیری نہیں تھی، جیسا کہ ہم سمجھ رہے تھے بلکہ ان میں سے بہت سارے امور جو کافی دنوں سے التوا کے شکار تھے ان کو روبعمل میں لانے کے لیے مولانا کو اپنی ٹیم کے مشورہ کا انتظار تھا۔

جامعہ میں عربی زبان کے فروغ کے لیے مولانا کی کوششیں سنہرے لفظوں سے لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ عربی درجات کے طلبہ میں عموماً اور عالمیت اور فضیلت کے منتہی درجات کے طلبہ کو بالخصوص عربی زبان میں گفتگو اور کتابت پر بھر پور توجہ دلاتے۔ دارالمطالعہ میں اردو اخبارات کے علاوہ عربی یومیہ اخبارات اور جرائد ورسائل کے اجرا کی تاکید فرماتے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا کے مشورہ سے بہت سارے طلبہ عصر کی نماز کے بعد عربی اخبارات کا مطالعہ کرتے اور میسر اساتذہ سے مدد لیتے۔ جن میں شیخ علیم الحق عمری ومدنی حفظہ اللہ کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ امتحانات میں تفسیر قرآن کریم، حدیث، فقہ اور عربی زبان وادب اور قواعد وغیرہ مضامین کے جوابات عربی ہی میں حل کرنے کی ترغیب دیتے۔ اس تعلق سے مولانا کے دور صدارت کا ایک

قابل ذکر واقعہ ہے کہ ۱۹۸۴ء کے آغاز میں یہ اعلان کیا گیا کہ عربی زبان میں سوالات کے جوابات حل کرنے پر پانچ نمبرات اضافی دیے جائیں گے۔ طلبہ میں ایک شوق اور ولولہ پیدا ہوا اور مسابقت کے جذبہ کے ساتھ تیاری شروع ہوگئی۔ مذکورہ مضامین میں سے بیش تر کی تدریس عربی زبان میں ہونے لگی اگر چہ تفسیر اور فقہ کی تعلیم زبان کے اعتبار سے کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ اس میں فضیلتین کے فقہ کے نظام تدریس کی یہ کمی بھی فقیہ ابن فقیہ مولانا محمد طاہر مدنی کی آمد سے پوری ہوگئی اور فقہ کا مادہ بدایۃ المجتہد کلی طور پر عربی زبان میں پڑھایا جانے لگا۔ ان مضامین کے سوالات عربی ہی میں تیار ہوئے اور طلبہ کی بڑی اکثریت نے عربی ہی میں جوابات دیے۔ میری یادداشت کے مطابق تشجیعی نمبرات کی روایت گرچہ صرف ایک یا دو سال قائم رہی لیکن اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبہ میں عربی لکھنے کا ایک اچھا ماحول پیدا ہوا۔ ایک بہت بڑی غلط فہمی دور ہوئی جو سالوں سے چلی آرہی تھی کہ فلاح کی عربی ندوۃ العلماء لکھنو سے کم زور ہوتی ہے۔ اور عربیت کے ذوق اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوا اور بعد میں اس کے اچھے اثرات سامنے آئے۔ جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے منعقد ہونے والے اجتماعات میں خاص طور پر عربی کی خطابت اور تحریر کی طرف بھر پور توجہ دی گئی جس سے ماحول میں مثبت تبدیلی آئی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ذمہ داران جامعہ کی کوششوں سے طلبہ جامعہ کو سعودیہ عربیہ کے جامعات کے مشائخ سے براہ راست استفادہ کا ذریں موقع ملا، جس سے اس مشن کو تقویت ملی۔

جامعہ کی ان گوناں گوں مصروفیتوں کے باوجود مولانا کی سماجی زندگی میں بھی ہمارے لیے نمونہ ہے۔ جامعہ کے تعلیمی اور انتظامی امور کی انجام دہی کے بعد مولانا کے پاس جو کچھ وقت میسر رہتا ان کو اپنے گاؤں والوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ایام طالب علمی کی میری معلومات کسی تحریر کے لیے ناکافی تھیں اس لیے میں نے مولانا کے ایک قریبی شاگرد، ہم قریہ اور اپنے ہم سبق ڈاکٹر مظفر عالم فلاحی سے براہ راست رابطہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے جو معلومات ملیں ان سے مولانا کی ذاتی زندگی میں مشن شناسی اور لگن کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ مولانا روزانہ کم از کم تین اوقات (مغرب، عشاء اور فجر) کی نمازیں پابندی کے ساتھ گاؤں کی مسجد میں ادا فرماتے، بلکہ آپ نے پابندی سے امامت کی ذمہ داری بھی انجام دی۔ اس دوران مصلیوں اور عام مسلمانوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ عشاء کی نماز کے بعد بلا ناغہ درس حدیث پیش فرماتے اور فجر کی نماز کے بعد ترتیب کے ساتھ درس قرآن کا اہتمام فرماتے۔ ڈاکٹر مظفر فلاحی نے بڑے

تاکید اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ میں مولانا کی اقتدا میں نماز ادا کرتا اور پابندی کے ساتھ مولانا کے دروس میں شریک رہتا۔ اس طرح بتدریج کئی سال میں پورے قرآن مجید کا درس مکمل ہوتا اور پھر تکمیل کے بعد از سرنو سلسلہ شروع ہوجاتا۔ یہ سلسلہ رحلت سے کچھ دنوں قبل تک جاری تھا۔ ایسے عظیم المرتبت اصحاب علم وفضل سے خوشہ چینی کو ہم اپنی سعادت اور اپنے اوپر مادر علمی کا احسان سمجھتے ہیں۔

●⧉●

أَوَ لَمْ يَسِيرُوا فِيْ الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَاراً فِيْ الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ .ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.

(مومن:۲۱۔۲۲)

''کیا یہ کبھی زمین پر چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین پر چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا یقیناً وہ بہت قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

زبیر احمد ملک فلاحی

''لب سوز، لب دوز، لب ریز'' چائے کی خصوصیات کے بارے میں یہ الفاظ تو مولانا سے بعد میں سنے، لیکن واقعہ پہلے پیش آیا اور اسی وجہ سے یاد بھی رہ گیا۔

ہوا یوں کہ مجھے کم سنی ہی میں جامعۃ الفلاح کی زیارت کرائی گئی۔ دارالتعلیم والی قدیم عمارت کے بیچوں بیچ ایک ہال ہے۔ اس میں داخل ہوں تو آخری سرے پر دائیں اور بائیں دو حجرے بنے ہیں۔ بائیں والے کے باہر، دیوار سے لگے ایک استاد کچھ طلباء کو پڑھا رہے تھے۔ ماموں جان کے ساتھ میں جا کر ان کے بائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آئی اور میرے لیے بھی آئی۔ بالکل بھری ہوئی اور جلتی ہوئی۔ مولانا کا انداز تواضع کچھ یوں تھا: ''بچہ! پیو پیو''۔ بار بار کہنے پر جو پی تو ہونٹ جل ہی تو گئے اور اس قدر جلے کہ یہ واقعہ یاد رہ گیا ورنہ اس سفر کی کوئی چیز یاد نہیں۔ یہ مولانا عبدالحسیب صاحبؒ سے پہلی ملاقات تھی۔

اوسط قد، سانولا بلکہ گہرا سانولا رنگ، اکہرا بدن، موٹا کالے فریم کا چشمہ، بغیر کالر کی لمبی قمیص اور علی گڑھ کٹ پائجامہ، ہاتھ میں چھڑی یا موسم کے لحاظ سے چھتری اور تھیلا جس میں اسٹیل کا ناشتہ دان ہوتا۔ اپنے گاؤں علاء الدین پٹی سے مولانا روزانہ پیدل جامعہ تشریف لاتے۔ جامعہ کے تعلیمی معمولات شروع ہونے سے ذرا پہلے۔ گرمیوں میں اک دم پسینہ پسینہ ہوتے۔ کچھ عرصہ تک مجھے بھی مولانا کی خدمت کا شرف حاصل رہا ہے۔ لپک کر چابی لیتے، کمرہ کھولتے، جھٹ لوٹے میں نل سے پانی لاتے۔ اگر موقع ہوتا تو چائے بناتے۔ وہ ضد کر کے طالب علم کو بھی چائے پینے پر مجبور کرتے بلکہ کہتے کہ ناشتہ دان کھولو اور لاکھ کہنے کے باوجود کہ ناشتہ کر چکے ہیں ایک روٹی کھانے پر مجبور کرتے۔ یہی کل خدمت ہوتی۔ ویسے بھی جامعۃ الفلاح میں طلبہ سے خدمت لینے کا رواج نہیں تھا۔

مولانا اصلاحی ان کا اصلاح بھی شیدائے قرآن، تلمیذ امام فراہی مولانا اختر احسن رحمۃ اللہ کے گرد گھومتا

تھا۔اصلاح کا ذکر کرتے تو کھو جاتے اور اپنے استادگرامی کا ذکر کرتے تو بس کیا کہنے!وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ بلبل ہزار داستان کی طرح بات سے بات نکلتی جاتی اور زلف یار کی طرح دراز ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچتی:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ایسے مواقع پر مولانا اکثر آب دیدہ ہو جاتے اور خاص کیفیت میں کہتے اچھا بچہ چلو چلو۔ میرا رشتہ کا بھائی ڈاکٹر وسیم ملک بتانے لگا کہ کسی سمینار میں فلاح سے اصلاح جانا ہوا۔ مولانا بھی وہاں تشریف رکھتے تھے۔ یوں ہی پوچھ بیٹھے کہ اچھا بتاؤ فلاح اچھا لگتا ہے کہ اصلاح۔ وسیم کو اصلاح سے مولانا کی جذباتی وابستگی خوب معلوم تھی۔ پھر استاذ تھے۔ بڑی مشکل تھی بالآخر اس نے کہا مولانا آپ جہاں ہوتے ہیں وہی جگہ ہمیں اچھی لگتی ہے۔ مولانا اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے اور پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مدرستہ الاصلاح کے ساتھ مولانا کا معاملہ 'اقبل ذاالجدار و ذا الجدار' کا تھا۔اور یہ سب کچھ مولانا اختر احسن اصلاحی سے غایت درجہ محبت، الفت اور والہانہ شیفتگی کی وجہ سے تھا۔ اسی شدید تعلق خاطر کی وجہ سے مولانا اختر صاحب کا اسلوب مولانا کے گھٹ میں اتر گیا۔ وہی نرمی، وہی مروت، طلبا کی دل دہی کا وہی انداز حتی کہ پوری زندگی میں وہی لطافت اور نزاکت درآئی تھی۔ مولانا کو کبھی میں نے غصہ میں آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا۔ تیز آواز میں بولتے نہیں سنا۔ مولانا پرشور آبشار نہ تھے نرم روشفاف بہتا ہوا چشمہ تھے، جس کے شیریں اور ٹھنڈے پانی کو پینے کے بعد ہر پیاسے کو آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ مولانا میں سورج کی حدت نہ تھی بلکہ چاند کی خنکی تھی۔ مولانا کا انداز تربیت کسی مجسمہ ساز کی طرح نہ تھا کہ وہ ایک بے ہنگم چٹان کو چھینی اور ہتھوڑی سے تراشتا ہے، بلکہ آپ کا انداز اس تیز رو مگر پانی کے دھارے کی سی تھی جو نہایت خاموشی سے چٹان کو کاٹ کر اپنا راستہ بناتا رہتا ہے۔ مولانا دراصل پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کا فن جانتے تھے۔

بہت سالوں تک جامعۃ الفلاح میں ششماہی کے نمبرات سالانہ میں نہیں جوڑے جاتے تھے۔ یعنی اگر کوئی طالب علم ششماہی میں فیل ہو جائے اور سالانہ امتحان میں پاس ہو تو اگلے درجے میں بیٹھنے کا اہل مانا جاتا تھا۔ ششماہی امتحان سے پہلے والدہ کا خط آیا جس میں صحت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ اس بار اس طرح نہ آنا کہ جیسے قبر سے نکل کر آئے ہو۔ میں نے سوچا کیا کروں کہ والدہ خوش ہو جائیں۔ ترکیب یہ سوجھی کہ ششماہی امتحان ہی نہ دوں۔ نہ محنت کرنا ہوگی نہ دبلے ہوں گے۔ سرے سے امتحان ہی نہ دینا ممکن نہ تھا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

فیصلہ یہ کیا کہ امتحان تو دیں گے لیکن کچھ لکھیں گے نہیں۔سادہ کاپی جمع کر دیں گے۔والدہ کو خط لکھا کہ اس بار پہلوان بن کر آئیں گے، لیکن فیل ہونے پر ناراض نہ ہوں۔اب کتابیں کا پیاں ایک طرف، کھانا پینا اور سونا معمول بن گیا۔امتحان کا وقت آیا۔پرچہ دیا اور سادہ کاپیاں جمع کر کے گھر روانہ ہو گئے۔چھٹیاں ختم ہوئیں جامعہ آئے تو وہ ہوا جو سوچا نہ تھا۔مولانا شبیر احمد صاحب نے طلب فرمایا اور کاپی لہرا کر فرمانے لگے: یہ کیا ہے؟اب بندہ کیا کہتا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ایک چپ ہزار چپ۔بڑی ڈانٹ پڑی۔مولانا بہت برہم ہوئے۔ڈنڈا بھی نکالا، لیکن مار سے بچ گئے۔صرف ڈرانے کے لیے ڈنڈا اٹھایا تھا۔آخر میں کہا تمہارے نانا (مولانا ملک حبیب اللہ صاحب) کو اطلاع کرتا ہوں۔آخر ڈانٹ کر بھگا دیا گیا۔رو دھو کر میں نے سوچا معاملہ ختم ہوا۔لیکن کچھ دیر بعد مولانا عبدالحسیب صاحب کے یہاں طلبی ہوئی۔مولانا کے کمرے میں پہنچے تو حضرت چھوٹتے ہی رونے لگے۔بندہ حق دق اس سوچ میں کہ کیا ماجرا ہے۔کاپی میز پر پڑی تھی۔میں سمجھ گیا کہ وہی امتحان والا معاملہ ہے۔مولانا روتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ میری کیا غلطی ہے، مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ تم نے یہ حرکت کی۔غلطی میری تھی اور مولانا رو رہے تھے۔میں بڑا پریشان ہوا۔اب مجھے احساس ہوا کہ بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔احساس جرم جگانے کا یہ عجیب انداز تھا۔میں احساس ندامت سے عرق عرق ہوا جاتا تھا۔ہوش و حواس گم، مولانا کو روتا دیکھ میں بھی رونے لگا۔مولانا مجھے روتا دیکھ چپ ہو گئے اور مجھے چپ کرانے لگے، کبھی آنسو پونچھتے کبھی پیٹھ سہلاتے، ''اچھا بچہ مت روؤ، مت روؤ کہتے''، میری ڈھارس بندھائی۔زبردستی چارپائی پر بیٹھایا اور خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائی۔جب میں نارمل ہوا تب جا کر رخصت کیا۔مولانا کا یہ انداز تربیت ایسا تھا کہ ساری انا ڈھے جاتی تھی۔مولانا جسم و جان میں ایسے سرایت کر جاتے تھے جیسے بھیگی مٹی میں نمی یا بادِ سحر گاہی میں نم۔مولانا کے رابطہ میں آنے والا مولانا اور ان کے انداز کا شائق ہو جاتا۔مولانا اندر اندر ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔مولانا سے وابستگی طالب علم کو حساس بنا دیتی تھی، بلکہ ذکی الحس، ایسا کہ خشونت خواہ اس کا تعلق زبان سے ہو یا رویہ سے، دل و دماغ میں چبھنے لگتی تھی۔یہ چیز اچھی بھی ہے اور بری بھی۔اچھی اس اعتبار سے ہے کہ حساس اور باشعور ہونا باعث فضیلت ہے اور خراب اس پہلو سے کہ آج کی دنیا میں کسی عذاب سے کم نہیں

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

مولانا کی طبیعت میں نفاست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔اس کا اظہار مختلف پیرایوں میں ہوتا رہتا تھا۔

جب بھی کوئی اچھی بات ناشائستہ انداز میں کہی جاتی، طلبہ کی رائیٹنگ خراب ہوتی یا اور کوئی ایسی بات ہوتی تو مولانا فوراً کہتے: ''مرغ کی ٹانگ بلریا کی رکابی میں''۔(اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اعظم گڑھ کے مختلف علاقوں کے تہذیبی رواج کی معلومات ضروری ہے۔) جامعہ کی مسجد بڑی خوب صورت عالیشان اور موزوں ہے۔ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ جامعہ آئے تو بہت متاثر ہوئے اور بڑی تعریف فرمائی۔ یہ مولانا ہی کے تخیل کا شاہ کار ہے۔

ایک دفعہ مسجد میں امتحان ہورہا تھا۔ کمپیوٹر سے پہلے پرچے سائیکلواسٹائل مشین سے چھاپے جاتے تھے۔ اکثر سیاہی کی کمی بیشی سے عبارتیں غیر مقروء ہوتی تھیں۔ ایک بار ہندی کا پرچہ تھا۔ کچھ الفاظ صاف نہ تھے۔ ماسٹر عبداللہ صاحب متعلقہ درجہ کے طالب علموں کو کھڑا کر کے پرچہ صحیح کروا رہے تھے۔ ایک لفظ ہندی کا 'گنڑ یتد یوتا سے' مٹا ہوا تھا کہ ماسٹر صاحب نے جیسے ہی یہ لفظ ادا کیا۔ مولانا نے جھٹ منھ پر ہاتھ رکھ کر ماسٹر صاحب سے فرمایا کہ ماسٹر صاحب! یہ مسجد ہے ایسے گندے الفاظ یہاں منھ سے نہ نکالیے۔ چنانچہ ہم لوگ صحن میں گئے اور پرچہ درست کیا۔

امتحان ہال سے یاد آیا کہ برادر جرار والی بال والے امتحان ہال میں کھڑے ہوکر مولانا سے کچھ پوچھنے لگے۔ اب مولانا اپنے انداز میں بولے: کثرت سوال جان کا وبال زیادہ قیل وقال باعث حلال اور معلوم نہیں اسی قافیہ میں کیا کیا کہتے رہے۔ سارے طلبہ واساتذہ اس سے خوب محظوظ ہوئے۔ مولانا اکثر مسجع ومقفیٰ جملے بولتے تھے۔ چائے کے بارے میں فرمایا: لب ریز ہو، لب سوز ہو، لب دوز ہو۔ ایک بار میں نے دریافت کیا کہ امتحان میں سوال کا جواب کیسے لکھا جائے کہ نمبر اچھے آئیں؟ فرمایا: اطناب مُمِل۔ ایجاز مُخِل نہ ہو جواب معتدل ہو۔ چنانچہ البلاغۃ الواضحۃ کا امتحان ایسے میں دیا اور مولانا پچاس میں پچاس نمبر دیے۔ مولانا کا 'عش یا ولد' طلبہ کے درمیان بہت معروف تھا۔

ہمارے کلاس کے حافظ اعظم بیگ اور نعیم غازی نے کیاری میں کچھ پودے لگانے کا فیصلہ کیا۔ پودے لائے گئے۔ رائے یہ ٹھہری کہ مولانا کے دست مبارک سے شجر کاری ہو۔ مولانا تشریف لائے اور پوچھا کہ یہ کون سا پودا ہے۔ نعیم غازی نے کہا رات رانی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ کتنی ہندی بولتے ہو؟ ہم سب نے کہا، مولانا رات رانی کو رات رانی نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ فرمایا، بچہ! ملکۂ شب کہو، ملکۂ شب۔ ہم سب بہت محظوظ ہوئے۔ دوسرے پودے کے بارے میں پوچھا یہ کون سا ہے؟ بتایا گیا کہ اشوک کا پودا ہے۔ فرمایا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

بچہ اشوک نہیں اورنگ زیب کہو۔ یہ تھا مولانا کا انداز۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ دعوتی اعتبار سے یہ کچھ مناسب نہیں لیکن بہرحال یہ مولانا کا انداز تھا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کے بعد اس انداز کا خاتمہ ہوگیا۔ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔

مولانا کا ساتھ چند دنوں کا نہیں برسوں کا رہا۔ استاد شاگرد کی حیثیت سے خادم اور مخدوم کی حیثیت سے۔ بے شمار یادیں مولانا سے وابستہ ہیں۔ نوید بود حکایت دراز تر گفتم والی بات ہے۔ لیکن کہاں تک۔

بندے کو اس کا بھی شرف حاصل ہے کہ مولانا ہمارے گھر یعنی گاؤں بھی تشریف لائے۔ اصلاً ہمارا خاندان اور خانوادہ ایک فلاحستان ہے۔ جامعہ کی ایک شاخ بھی گاؤں میں قائم ہے۔

مولانا عبدالحسیب صاحب کے بعد شاید دو چار لوگ ہی ایسے بچے ہوں جو مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے شاگرد کہلا سکتے ہوں۔ مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب، ڈاکٹر اشتیاق ظلی صاحب اور جین پور کے مولانا مختار اصلاحی صاحب۔ مولانا کا جانا دراصل ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً کسی ادارہ کے ملازم نہ تھے، بلکہ تحریک اسلامی کے تعلیمی وتربیتی محاذ کے سپاہی تھے۔ افسوس کہ آخر میں ملازموں والا سلوک اختیار کیا گیا۔ تنظیمی جبر بھی کس قدر راذیت ناک ہوتا ہے۔

پہنچ کر منزل جاناں پے آنکھ بھر آئی

شیدائے قرآن کا یہ شاگرد رشید، سراپا الفت ومحبت اور نرمی ولطافت کا نشان، کتنوں کو سوگوار کر کے ۲۵ رفروری ۲۰۲۰ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر کے عالم جاودانی کو چلا گیا۔

شمع خیال، فکر کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

●❐●

مولانا عبدالحسیب اصلاحی ۔جیسا میں نے ان کو دیکھا

ڈاکٹر غلام نبی فلاحی

ایک مفسر،ایک ادیب اور مترجم میرے استاد مولانا عبدالحسیب اصلاحی ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے مشہور ضلع اعظم گڑھ سے چند کلو میٹر دور موضع علاؤالدین پٹی میں ۲۶ ر فروری کو وفات پا گئے۔اللہ تعالی انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔(آمین) مولانا مرحوم ۱۳ر اگست ۱۹۲۸ء موضع علاوہ دین پٹی ضلع اعظم گڑھ میں ایک زمین دارانہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، جو علمی دولت سے مالا مال تھا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گرچہ اپنے گاؤں میں ہی ہوئی تھی،مگر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لیے ان کے والد ماجد نے انہیں مشہور معروف دینی درس گاہ مدرستہ الاصلاح میں داخل کیا تھا۔مولانا عبدالحسیب اصلاحی فراغت کے بعد بہار کے شہر دربھنگہ طلب کیا گیا۔لیکن وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی۔وہاں سے واپس آ کر پہلے رامپور میں مرکز جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوئے پھر علی گڑھ میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔لیکن جلد ہی اپنے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب کی ایما پر مدرستہ الاصلاح سے بحیثیت مدرس وابستگی ہوگئی جو ۱۹۶۱تک برقرار رہی۔

مدرستہ الاصلاح تقسیم ہند سے پہلے ہی سے جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اگر میں یہ کہوں کہ جماعت کی فکری اور عملی بنیادیں اسی مدرسہ کی مرہون منت ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔یہ نہ صرف جماعت کو فکری غذا فراہم کرتا رہا بلکہ اس کے مردان کار یہاں سے تیار ہوتے رہے۔یہی وجہ ہے مولانا عبدالحسیب صاحب اپنی طالب علمی کے دوران ہی جماعت اسلامی سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ اس عظیم تحریک سے وابستہ ہو کر آخری دم تک اس کے ساتھ منسلک رہے۔

جامعۃ الفلاح مشرقی یو پی کے ضلع اعظم گڑھ سے چند کلو میٹر دور ایک بستی بلریا گنج میں واقع ہے۔اس وقت ہندوستان کی مشہور و معروف دینی اور علمی تربیت گاہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔اس کی تعمیر و ترقی اور

اس کی تاسیس میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے دوسری شخصیات کے ساتھ مل کر جو کلیدی رول ادا کیا ہے اس کو کسی بھی حیثیت سے نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ ہی بھلایا جاسکتا ہے۔

جن دنوں جامعہ میں میرا ایڈمیشن ہوا تھا میری عمر پندرہ سال تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کشمیر سے ایک ہزار میل دور ہندوستان کے ایک ایسے علاقے میں حصول تعلیم کے لیے بھیجا گیا تھا جو میرے لیے بالکل ہی اجنبی تھا۔ یہاں کے در و دیوار سے ہی نہیں بلکہ آسمان سے بھی آگ برستی محسوس ہوتی تھی۔ کہاں کشمیر کی معطر اور مسحور کن ہوائیں کہاں یہاں کے باد سموم اور جھلسا دینے والی گرمی۔ اللہ توبہ۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اگر مجھے یہاں کی گرمی کا احساس ہوتا تو شاید ہی میں یہاں کا رخ کرتا۔

جامعۃ الفلاح کے لیے سفر کے وقت مجھے میرے ماموں مرحوم حسام الدین نے ہندوستان کے سابق امیر جماعت اسلامی مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم کے لیے سیبوں کا ایک ڈبہ بطور تحفہ اور ایک خط دیا تھا۔ مرحوم مولانا ابواللیث صاحب ان دنوں جامعۃ الفلاح کے ناظم تھے۔ وہ بھی اپنے گھر واقع چاند پٹی سے روز آیا جایا کرتے تھے۔ میرے ذہن میں یہی تھا یہ کہ مولانا کسی شان و شوکت والے مکان میں رہتے ہوں گے۔ مکان کے باہر دربان پہرہ دے رہے ہوں گے۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے مولانا کے گھر واقع چاند پٹی کو دیکھا جو مٹی کا ایک گھروندہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جب اجازت مانگی تو کہنے لگے بیٹا اندر آجاؤ۔ میں جب اندر داخل ہوا تو ان کی لائبریری تھی جہاں ایک لکڑی کی پرانی میز کے ساتھ ایک لکڑی کی پرانی کرسی پڑی ہوئی دیکھی جس پر بیٹھ کر مولانا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ یہ کمرہ کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا تھا۔ تل رکھنے کی جگہ بھی نظر نہ آتی تھی۔ اتنے میں ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ پانی کتابوں کے نیچے سے گزرنا شروع ہوا۔ میں سوچ میں پڑ گیا یا اللہ یہ تو کوئی ولی اللہ ہی ہیں۔

مشرقی یوپی کے دستور کے مطابق اتنی دیر میں مولانا خود ہی پانی کے ساتھ مکئی اور گڑھ لائے اور ہم نے پانی پی لیا۔ اس کے بعد عصر کا وقت ہوا تو مولانا نے نماز عصر کی امامت فرمائی۔ چونکہ بارش زور کی تھی اس لیے مسجد میں ہی تھوڑا سا توقف کرنا پڑا۔ لوگوں سے تعارف کرایا کہ یہ لوگ کشمیر سے آئے ہیں، پھر پندرہ بیس منٹ تک کشمیر پر ہی بات کرتے رہے۔ مجھے پوری طرح سے یاد ہے کہ وہ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب شیخ عبداللہ کا ہی کارنامہ ہے۔ میں گم سم سنتا رہا مجھے نہ تاریخ معلوم تھی اور نہ شیخ عبداللہ۔ بہر کیف بات آئی اور گئی۔ میں نے اجازت چاہی کہا بیٹے بارش بہت ہی تیز ہے۔ یہ میری شیروانی ہے اسکو پہن

لو اور کل جب میں جامعہ آؤں گا تو وہاں مجھے دے دینا۔ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر کسی اور موقع پر بات کی جاسکتی ہے۔

مولانا ابواللیث صاحب جامعہ کے ناظم تھے۔ان کی دوبارہ امیر جماعت کی تقرری کے بعد جامعۃ الفلاح کی نظامت کی نشست خالی ہوگئی تو مولانا عبدالحسیب صاحب مرحوم کو نظامت پیش کی گئی مگر انہوں نے معذرت کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ چند ماہ تک انہوں نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تھی مگر کار نظامت ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔میرے خیال میں اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے بلکہ ان کا مرکزی میدان **خیر کم من تعلم القرآن** سے جڑا ہوا تھا اور اخیر تک یہی منصب سنبھالتے رہے۔

چونکہ جامعہ میں ہر سال نئے طلبہ میں اضافہ ہوتا ہے جس کی بنا پر تمام طلبہ کو درجات اور کلاسوں کی مناسبت سے دوسرے ہوسٹلز میں منتقل کیا جاتا تھا۔ ہوسٹلز میں جگہ کی قلت کی بنا پر ایک ہی کمرے میں دس یا بارہ طلبہ کو رکھا جاتا تھا۔ مجھے بھی دوسرے لڑکوں طرح امسال مودودی ہوسٹل منتقل ہونا پڑا۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ ہم بارہ طلبہ ایک ہی کمرہ شیئر (Share) کرتے تھے۔ مجھے بھی بیچ میں کہیں جگہ مل گئی۔مولانا مرحوم وقت کے پابند تھے اور صبح سویرے علاؤالدین پٹی سے پیدل چل کر جامعہ تشریف لاتے تھے اور کلاس میں جانے سے پہلے ایک کپ چائے نوش فرماتے۔مرحوم چائے پینے کے بے حد عادی تھے۔ بروک بانڈ ٹی (Brookbond Tea) کے علاوہ انہیں دوسری کوئی چائے پسند نہ تھی۔

مولانا اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ادھر ادھر دیکھ لیتے۔اگر کوئی نظر نہ آتا تو فوراً مجھے نام لے کر بلاتے، میں بغیر کسی تامل کے فوراً پہنچ جاتا اور ان کے لیے پہلی فرصت میں چائے بنالیتا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی مرحوم اپنی شیروانی کھونٹی پر لٹکاتے اور چارپائی پر دراز ہوجاتے۔

اب دوسال سے تجربہ ہوا تھا کہ مولانا کس طرح کی چائے پیتے تھے اور اس میں کتنا دودھ اور چینی ہونی چاہیے۔وہ ہمیشہ اپنا کھانا گھر سے لایا کرتے تھے، میں نے کبھی بھی انہیں جامعہ کا کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ہاں کوئی خاص موقع ہو یا کوئی بڑا پروگرام تو مولانا پھر رات کو رک جاتے۔مولانا چائے کے لیے دودھ بھی اپنے ساتھ لایا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن وہ کچھ زیادہ ہی کھانا لاتے اور مجھے کھلاتے کہتے تھے۔ بیٹا یہ تو میں آپ کے لیے ہی لایا ہوں۔کھانا بہت ہی سادہ ہوتا تھا۔کبھی دو روٹیاں اور سالن کبھی روٹی اور تھوڑے سے چاول ہوتے تھے۔مولانا بہت ہی کم کھانا کھاتے تھے۔جس دن گوشت ہوتا تھا ایک بوٹی اور آدھا آلو میرے لیے رکھتے تھے۔

مولانا کو جو کمرہ الاٹ کیا گیا تھا وہ مودودی ہال کے اندر بائیں جانب واقع تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ بلڈنگ ابھی موجود ہے کہ نہیں بس ایک چھوٹا سا کمرہ یا جس کو حجرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔اس میں ایک چھوٹی سی الماری جس میں تدبر قرآن' تفسیر زمخشری'تفسیر جلالین اور عربی لغت المنجد کے علاوہ چند اور کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ تمام کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی ہوتی تھیں اور اس کا دروازہ ہمیشہ ایک معمولی تالے سے بند رہتا تھا۔ میں نے مولانا کو اکثر تدبر قرآن پڑھتے دیکھا۔اپنی کتابیں دوسروں کو دینے میں وہ بہت ہی بخیل تھے۔ میں نے کئی بار تدبر مانگا تو لیت ولعل سے کام لیا۔مگر جب میں درجہ پنجم میں پہنچا تو امتحان کے دوران چند ایام کے لیے مجھے اس شرط کے ساتھ تدبر کی چوتھی جلد عنایت فرمائی کہ میں اسے محفوظ رکھوں اور وقت پر اسے واپس کروں۔

مولانا درجہ پنجم میں ہمیں تفسیر قرآن پڑھایا کرتے تھے۔کلاس یا درجہ میں آنے سے پہلے وہ خود بھی تیاری کرتے تھے۔مگر کبھی کبھی وہ مکمل تیاری نہ کر پاتے تھے جس کو ہم طلبہ محسوس کر لیتے تھے۔ جب کبھی طلبہ شرارت کرتے تو ہمیشہ یہ الفاظ استعمال کرتے ایش یا ولد (میاں، یہ کیا ہو رہا ہے)۔میں نے انہیں کسی کو ڈانٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔البتہ انکے چہرے کے تیور ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ناراض ہیں۔

مولانا کا وقت چونکہ گھر آنے جانے میں لگ جاتا تھا اور وہ پھر صدر مدرس بھی تھے اس لیے مطالعہ کا وقت بھی کم ملتا۔طلبہ بھی کبھی کبھی شرارت کرتے یہاں تک کہ ایک بار طلبہ نے شکایت کی کہ مولانا خود قرآن کا مطالعہ کر کے نہیں آتے بلکہ وہ تدبر کی ان آیات کو پڑھ لیتے جن کا درس دینا ہوتا تھا۔شکایت موصول ہونے پر بہت ہی خفا ہو گئے۔زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکالا۔ دوسرے روز جب کلاس میں داخل ہوئے تو خفگی کے آثار چہرے پر صاف نظر آرہے تھے۔ پھر کہتے تھے: بچو! زیادہ شرارتی نہ بنو'اساتذہ کا احترام کرنا سیکھو۔ درس کے وقت وہ دوسری باتوں پر بہت ہی کم توجہ دیتے۔ ہمیشہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کا تذکرہ فرماتے کہ وہ کس طرح سے سمجھاتے اور پڑھاتے تھے۔ایک بار خود ہی فرمایا کہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے مجھ سے کئی بار تفسیر مانگی تو میں نے اس لیے نہیں دی کہ وہ مناسب وقت نہیں تھا کیونکہ اس وقت میں درجہ چہارم میں تھا۔ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ عام طور پر طلبہ مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ ادھر ادھر کی تفاسیر پڑھ کر کلاس میں آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ تفاسیر پڑھ کر کوئی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ تفاسیر دراصل کسی خاص اسکول کی ترجمان ہوتی ہے یا وہ روایات اور اقوال سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں حقیقی طالب علم کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔اگر طالب علم تفاسیر کے کی چکروں

میں رہا تو وہ قرآن پاک کی روح اور تہہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

فرماتے تھے کہ طلبہ کو چاہیے، مطالعہ قرآن کے وقت لسان العرب یا المنجد سامنے رکھ کر مطالعہ کریں اور جو مشکل الفاظ ہوں ان کا معنی اور تشریح اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا کریں۔ فرماتے تھے کہ لسان العرب لغت کی کتابوں میں سب سے عمدہ اور زیادہ مدد دینے والی لغت ہے کیونکہ اہل لغت کا تمام ماحاصل اس میں یکجا ہے۔ مجھے یاد ہے قرآن پڑھاتے وقت وہ فرماتے تھے کہ اصلی چیزیں جن کی ایک طالب علم یا طالب قرآن کو ضرورت ہے وہ یہ ہیں کہ ایک لفظ کے صحیح حدود واطراف کیا ہیں؛ پھر اس کے اصل معنی کیا ہیں اور اس کے معنی میں سے کن پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں لغت بہت ہی ضروری ہے مگر لغت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کی عربی زبان کی پہچان بھی ضروری ہے جس میں یہ قرآن نازل ہوا تھا اور اس زمانے کی تہذیب وتمدن اور جغرافیہ سے بھی واقفیت حاصل کرنا قرآن فہمی میں مدد دے سکتا ہے۔ مزید کہ آیات کس تناظر میں نازل ہوئی ہیں جس کو عرف عام میں شان نزول کہا جاتا ہے کو جاننا بہت ہی لازمی ہے۔

طلبہ جب کبھی مطالعہ نہیں کرتے تھے تو بہت ہی نارض ہوتے تھے۔ بہت ہی پیار سے سمجھاتے کہ وقت ضائع نہ کرو۔ جتنا ممکن ہو سکے خود سے قرآن سیکھنے کی کوشش کرو۔ یہ وقت تفاسیر پڑھنے کا نہیں۔ تفسیر تو بعد کی چیز ہے اس کے لیے تو پوری عمر ہے جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ گے تو بعد میں تفاسیر پڑھتے رہنا۔

مولانا کو چونکہ عربی زبان پر عبور حاصل تھا یہی وجہ ہے انہوں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی چند کتابوں کا عربی میں بھی ترجمہ کیا۔ ایک بار کہا کہ جب میں نے اس کا ترجمہ کیا تو خواہش تھی کہ کوئی عربی ادیب اس کو دیکھتا۔ چنانچہ کہا کہ ایک بار جب مجھے جامعہ کی خدمت کے لیے سعودی عرب جانا پڑا، تو جہاز میں ایک مصری سے ملاقات ہوئی جن کا نام کمال ہلباوی ہے۔ وہ الاخوان المسلمون سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پاکستان سے واپس مصر جارہے تھے۔ انہوں نے جب میرا ترجمہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور چند بہترین مشوروں سے بھی نوازا۔

مولانا موصوف سیاسی داؤ پیچ سے بہت ہی دور تھے۔ ہمیشہ درس وتدریس کو اہمیت دیتے۔ ادھر ادھر کی باتوں پر کم ہی توجہ دیتے۔ صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کرتے۔ کمرے میں مٹی کا ایک چھوٹا سے گھڑا رکھا ہوا ہوتا تھا جس کا پانی دن بھر استعمال کرتے۔ پانی کی اس طرح قدر کرتے کہ ایک ہی گھڑے سے غسل فرماتے۔

میں نے مرحوم کو ہمیشہ سفید کرتا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے دیکھا، اس کے اوپر شیروانی پہنتے۔

نفاست پسندی میں مولانا کا مذاق ہر معاملے میں نفیس تھا' ہر چیز نفاست سے رکھتے اور نفاست سے چیزیں رکھتے تھے۔ اپنا علمی سفر بھی نفیس لوگوں سے شروع کیا۔ جب کبھی موقع ملتا تو اپنے اساتذہ کرام کا تذکرہ بہت ہی نفاست سے کرتے۔ ان کا رہنا سہنا' کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا' بول چال' لکھنا پڑھنا غرض سفر حیات کا ہر قدم نفیس تھا۔ میں نے مولانا کے اندر بہت ہی سادگی دیکھی۔ مولانا زرق برق لباس نہیں پہنتے اور نہ اس کے شوقین ہی تھے۔ مگر آن بان کی شخصیت کے مالک تھے۔ اردو زبان کے بادشاہ تھے مگر اس میں بہت زیادہ عربی کی ملاوٹ ہوتی تھی۔ جب بولتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ الفاظ کو اندر ہی اندر سے چن لیتے تھے پھر اپنی زبان سے انہیں ادا کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ اکثر اردو محاوروں کا استعمال کرتے تھے۔ وقت اور قرآن پاک کے ترجمہ کی مناسبت سے اردو محاورے بھی استعمال کرتے تھے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت 96 جس میں **قبضتہ من اثر الرسول** وارد ہوئے ہیں۔ اس کا ترجمہ بطور محاورہ یوں کرتے تھے۔ ''نقش پائے رسل'' اس کے علاوہ الفاظ کی مناسبت سے بہت سے محاورے استعمال کرتے تھے تا کہ طلبہ قرآن پاک کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ چند محاورے حسب ذیل ہیں جو میں نے انہی سے سیکھے ہیں۔

۱۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنا
۲۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ
۳۔ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا
۴۔ چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل
۵۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی

درس کے دوران ہم کبھی مولانا سے پوچھتے تھے کہ آپ کے اساتذہ میں سے کون کون سے ہیں کیا آپ مختصر سا تعارف کرائیں گے۔ بڑی منت سماجت کے بعد کہتے تھے کہ بچو، اساتذہ کا احترام کیا کرو۔ یہ سوالات کرنے کے نہیں۔ بچو، اپنا وقت ادھر ادھر کی باتوں میں ضائع نہ کرو۔ ہم اپنے وقت میں بدزبان یا زبان دراز نہ تھے بلکہ اساتذہ کے سامنے سر جھکا کر چلتے تھے، پھر بعد میں کہتے تھے۔ اپنے اساتذہ میں مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا داوود اکبر صاحب اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین صاحب اصلاحیؒ اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کا بار بار نام لیتے تھے اور کہتے تھے میں ان سے بہت ہی متاثر ہوں اور ان سے مستفید بھی ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ (آمین)۔

پھر طلبہ سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ ان کے قدر شناس بنو اور اپنے اساتذہ سے زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرو۔ کہتے تھے کہ ایک طالب علم کی مثال ایک فقیر یا گداگر کی ہے جو اپنا کشکول لے کر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے، لہٰذا تم بھی اسی طرح ہر استاد سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

مولانا کی گفتگو یا درس وتدریس کے دوران محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کو پہلے سے نحو صرف اور عربی وزبان ادب سے دلچسپی تھی۔ اگر کبھی کبھار ہم میں سے کوئی دوسرا موضوع چھیڑ دیتا تو بہت ہی خوبی کے ساتھ اسے گول مول کر دیتے تھے۔ بہت ہی زور دے کر کہا کرتے تھے بچو، مطالعہ کر کے آیا کرو کیوں کہ مطالعہ آدھا علم ہے۔ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ ایک مرتبہ بات چلی دارالمصنفین اور علاوہ شبلی مرحوم کی تو کہنے لگے: بچو، تم نہیں جانتے اس سرزمین نے تین شبلیوں کو جنم دیا ہے۔ ایک متکلم ایک مورخ اور ایک فقیہ۔ پھر اس کی تشریح کرتے کہ مولانا شبلی متکلم مدرسۃ الاصلاح کے علم کلام کے ممتاز استاد تھے۔ علامہ شبلی مورخ اسلام تھے جنہوں نے سیرت النبی ﷺ لکھی ہے اور تیسرے مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری جو ندوۃ العلماء میں فقہ کے استاد اور سلف صالحین کا ایک نمونہ تھے۔

میرا ارادہ تھا کہ امسال میں اپنے بچوں کو ساتھ لے کر جامعۃ الفلاح جا کر مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا۔ لیکن منشا الٰہی کچھ اور ہی تھا۔ وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگئے، مجھے یقین کامل ہے کہ دوسری دنیا میں ان سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو پورنور کرے۔ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور دین اسلام کی ترویج واشاعت کے لیے انہوں نے جو خدمات انجام دیں ہیں اللہ انہیں قبول فرمائے۔ (آمین)

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

مولانا عارف حسین فلاحی

اس عالم آب وگل میں کتنے ہی أئمہ اور مجتہدین پیدا ہوئے اور ملک عدم کی طرف رخت سفر باندھ لیے۔ عالم رنگ وبو میں کتنی ہی علمی وادبی ہستیاں معرض وجود میں آئیں، مگر پردہ عدم میں روپوش ہوگئیں۔ کتنے صلحاء اور صدیقین منارۂ نور بن کر عالم انسانیت کی رہ نمائی کرتے ہوئے ہوئے صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئے۔ اس عالم فانی میں کسی کو دوام وقوام حاصل نہیں ہے، ہر آدمی مسافر ہے اور اپنی منزل پر پہنچ کر اپنی مسافرت مکمل کرلیتا ہے۔ جانے والا چلا جاتا ہے، گزرنے والا گزر جاتا ہے، مگر اپنے پیچھے کتنی ہی یادیں اور باتیں، کتنے محاسن ومکارم اور کتنے مناقب ومحامد چھوڑ جاتا ہے جو اسے جاوداں بنا دیتا ہے۔ ان کی علمی کاوشیں، انتظامی امور، قیادتی صلاحیتیں اور تربیتی شعور، گفتار وکردار، عادات واطوار، طرز عمل، طرز سخن، طرز زندگی، طرز بندگی، قابل رشک بود وباش اور حسین نشست وبرخاست کی وجہ سے اپنے غم خواروں، غم گساروں، بہی خواہوں اور خیرخواہوں کے دلوں میں جگہ بنالیتا ہے۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کی علمی وعملی شخصیت انہی زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے۔

۲۵ فروری ۲۰۲۰ء بروز منگل بعد نماز ظہر سوشل میڈیا کے ذریعہ یہ جانکاہ اطلاع ملی کہ علم وادب کے تاج دار، فضل وکمال کے گوہر نایاب، سنجیدگی وخموشی کے سمندر، پروقار شخصیت، بلند اخلاق وکردار کے حامل، خدا ترسی وخدا پرستی کے پیکر مجسم، عجز وانکساری کے خوگر ہمارے محترم ومحتشم اور مشفق ومربی استاذ جناب مولانا عبد الحسیب صاحب نصف صدی سے زائد تک اپنی تعلیمی وتدریسی اور فنی مہارتوں کی ضیاپاش کرنوں سے فیض یاب کرکے اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی رحلت علم وادب کے گہوارے کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ آپ کے انتقال پر ملال پر بے ساختہ زبان سے یہ الفاظ وکلمات ادا ہوئے۔

مخلص خادم قرآں چلا گیا　　فکرفراہی کا ترجماں چلا گیا
علم کا مہ تاباں چلا گیا　　گل زار ادب کا نگہباں چلا گیا
فلاح کا روح رواں چلا گیا　　صلاح کا لعل درخشاں چلا گیا
تحریک کا ارمغاں چلا گیا　　بصیرت کا سلطاں چلا گیا

حقیقت یہ ہے کہ آپ مایہ ناز ادیب، کہنہ مشق انشا پرداز، حلیم و بردبار، کامیاب مدرس، مشفق مربی اور پرسوز داعی تھے۔ قرآن کے شیدائی اور حوصلہ مند سالار کارواں تھے۔ کم گو مگر حکمت و دانائی اور علم و دانش کے بحر بے کراں تھے۔ مسجع و مقفی کلمات و تعبیرات کچھ اس طرح پیش کرتے کہ کانوں میں رس گھول دیتے اور کبھی سمع خراشی کے باعث نہ بنتے۔ الفاظ کے موتی آپ کے شیریں مقال دہن سے کچھ اس طرح جھڑتے کہ آپ کے تلامذہ ان موتیوں کو اپنے دامن مراد میں بھر کر مستقبل کے حسین خوابوں میں سجا دیتے۔ آپ کے عقیدہ و عمل اور فکر و خیال سے خلوص و محبت، نصح و خیر خواہی، دینی حمیت اور اسلامی اخوت کی نوید سنائی دیتی۔ آپ علامہ اقبالؒ کے ان دونوں اشعار کے بڑی حد تک مصداق تھے۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

ذاتی مشاہدات وافادات

اپریل ۱۹۸۶ کے آخری عشرہ میں جامعۃ الاصلاح الاسلامیۃ، نیپال سے درجہ ہفتم میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ عربی تعلیم کے حصول کے لیے جامعۃ الفلاح کے لیے رخت سفر باندھا۔ ۱۶/جون ۱۹۸۶ء کو پہلی بار جامعۃ الفلاح کا دیدار ہوا۔ داخلہ پر منظور لکھوانے کے لیے دفتر تعلیمات میں جانا ہوا۔ داخل ہوتے ہی ایک پر وقار مگر ایک بارعب شخصیت پر نظر پڑی۔ ابھی میں گم سم کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک شفقت بھری آواز سماعت سے ٹکرائی۔ بچہ آپ کا کیا معاملہ ہے۔ میں نے فارم بڑھا دیا کچھ مختصر سوالات کے بعد فارم پر منظور لکھ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کر دی کہ دو دنوں کے بعد داخلہ ٹسٹ ہوگا اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی مطلوبہ درجہ (عربی اول) میں داخلہ ممکن ہوگا۔ میں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور ٹسٹ کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ حسب نوٹس ٹسٹ ہوا اور عصر بعد نتیجہ لسٹ پر اپنا نام سرفہرست دیکھ کر بے ساختہ زبان سے الحمد للہ رب العالمین نکلا۔ اس وقت میری مسرت و شادمانی کی انتہا نہ رہی، کیوں نہ ہوتی مطلوبہ

کلاس میں داخلہ جو ہو رہا تھا جب کہ بہت سے دوست واحباب ناکام ہوکر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور دیگر اداروں کا رخ کر رہے تھے۔ساری کارروائی مکمل کرنے کے بعد ۲۱ جون ۱۹۸۶ء کو پہلی بار تعلیم کے لیے ہم جماعتوں کے ساتھ دارالاقامہ سے درس گاہ کی طرف نکلا۔ درجہ جانے سے پہلے طلبہ تذکیری کلمات سننے کے لیے صف بصف قطار در قطار کھڑے ہوگئے۔میں بھی ساتھیوں کی اتباع کرتے ہوئے ایک صف میں کھڑا ہوگیا۔ چندلمحوں کے بعد ایک عالم یزدانی اور زاہد ربانی فاضل استاذ صدر مدرس جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب ہمارے روبرو کھڑے ہوکر دس منٹ کی ایک وقیع، پرمغز اور حوصلہ بخش تذکیر فرمائی۔آپ نے وقت کی اہمیت کو موضوع سخن بنایا۔اور الوقت کالسیف ان لم تقطعہ یقطعک ۔عربی مثل کے ذریعہ گفتگو کو خوب صورت پیرائے ،خوشکن اسلوب اور حلاوت انگیز قالب میں ڈھال کر مسجع ومقفی عبارتوں سے سجا کر اس طرح پیش کیا کہ حرز جاں بن گئی۔آپ کی تذکیر بہت ہی مختصر اور جامع ہوا کرتی ۔تمہید طولانی سے اجتناب کرتے اور مقصد ومدعا کو پیش کرنے میں بخالت نہ کرتے ۔ان کے بہت سے کلمات کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔آپ جب تک صدر مدرس رہے ہفتہ یا عشرہ میں ایک بار ضرور تذکیر فرماتے ۔کبھی کبھی جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتے ۔آپ اپنی تمام گفتگو میں شائستہ،شیریں اور سلیس تعبیرات استعمال کرتے ۔آپ کی ہر گفتگو مختصر، جامع ، ایمان افروز اور فکر انگیز ہوتی ۔کبھی کبھی ظہر وعصر کی امامت بھی فرماتے ۔نماز معتدل اور پرسکون ہوتی ۔خشوع وخضوع کا عملی مظہر ہوتی۔

زندگی کے بعض خدوخال

مولانا مرحوم مردم خیز،علم وادب کے گہوارہ اور شبلی وفراہی کو جنم دینے والے ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔اسی ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاؤالدین پٹی کے ایک زمین دار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔علمی شوق فطری تھا اور ادبی ذوق وہبی تھا۔آپ نے خوشگوار اور مثالی ازدواجی زندگی گزاری۔بلریا گنج کے مکتب سے جو بعد میں جامعۃ الفلاح کے نام سے ایک عظیم الشان دینی درس گاہ بنا، ابتدائی تعلیم حاصل کی اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے فضیلت تک کی تعلیم مکمل کی۔مختلف ادوار ومراحل سے گزرتے ہوئے دوبارہ ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں بہی خواہان جامعۃ الفلاح کے اصرار پر مادر علمی کی کشت ویراں کی آبیاری پر مامور ہوگئے۔ آپ جامعہ کے تعمیری سفر اور عروج واقبال کے ستارے کے طلوع ہونے کے صرف گواہ نہیں بلکہ اس کے رکن رکین رہے۔جامعہ کی ترقی میں لگی ہوئی ایک ایک اینٹ آپ کی احسان منداور رہین منت ہے۔

مولانا محترم ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۹ء کے دوران چار بار صدر مدرسی کے باوقار عہدے پر فائز ہوئے۔اور سب سے طویل دورانیہ ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۹ کا تھا۔شاید یہ سلسلہ اور بھی دراز ہوتا،مگر نومبر ۱۹۸۹ء مولانا مرحوم اپنی صدر مدرسی کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو گئے،تب مولانا ابوبکر اصلاحیؒ نے اس عہدے کی پتوار سنبھالی۔اس وقت میں عربی چہارم کا طالب علم تھا۔اور پھر ایک طویل وقفہ کے بعد ۱۹۹۶ میں جملہ تعلیمی وتربیتی امور کے ذمہ دارِاعلیٰ کی حیثیت سے مہتمم تعلیم وتربیت کے منصب پر جلوہ افروز ہوئے۔

مودودی ہاسٹل کے زیریں طابق کے جنوب مغرب میں ایک 6x8 کا کمرہ تھا۔یہی مولانا محترم کا حجرہ علم وادب تھا۔جہاں ایک طرف ایک الماری تھی جس میں نظام القرآن،تدبر قرآن،تفہیم القرآن،ترجمہ قرآن کے کئی نسخے،بہت سی عربی ادب اور اردو ادب اور تحریکی کتابیں بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔دوسری طرف اشیاءِ خورد ونوش کے سامان اور وسائل طباخی سے حجرہ مزین تھا۔ایک المونیم کا لوٹا اور سفید گیلن پانی کے لیے استعمال کیا جاتا۔روزانہ گھر سے کھانا اور دودھ لاتے اور کھانا گرم کرنے اور چائے بنانے کے لیے پیتل کا اسٹو موجود تھا۔جب کبھی حجرہ میں جانے کا اتفاق ہوتا مولانا مرحوم کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے نوش کرنے کا موقع ضرور میسر ہوتا۔ذاتی لائبریری سے کتابیں دینے میں ذرا بخیل تھے البتہ علمی شوق وجذبہ کی قدر کرتے اور طلبہ لائبریری اور مرکزی مکتبہ کی طرف رہ نمائی کرتے۔آپ اپنا کام خود کرتے۔اپنے ذاتی کاموں کے لیے طلبہ کو کبھی زحمت نہ دیتے،جب کہ ہر طالب علم آپ کی خدمت کرنے کو اپنا شرف سمجھتے۔خود نل چلا کر پانی لیتے۔کبھی کبھی بہت اصرار کے بعد روم تک پانی پہچانے کی بادل نخواستہ اجازت دے دیتے اور احسان مند نظروں سے دیکھتے رہتے اور خوب خوب دعائیں دیتے۔آپ بڑے ہی غیور وخوددار تھے۔جفاکش اور محنتی تھے۔اپنا کام خود کرکے خوشی محسوس کرتے۔جب بھی ملاقات ہوتی آپ تعلیم کے لیے محنت ومشقت،کدو کاوش،جانفشانی اور دل جمعی ودلچسپی کی طرف توجہ دلاتے۔

مولانا کا طریقۂ تدریس

عربی اول سے عربی پنجم تک مختلف تذکیر،خطبہ،تقاریر اور مختلف مواقع پر آپ کی گراں قدر اور قیع گفتگو سے استفادہ کا موقع ملتا رہا۔مگر باضابطہ آپ کی تعلیم وتدریس کا موقع فضیلت کے پہلے سال میسر آیا۔آپ کے ذمہ عربی ادب وانشا مادہ کے تحت مقدمہ ابن خلدون کی تدریس تھی۔آپ نے یہ ذمہ داری حسن وخوبی سے نبھائی۔ابن خلدون کی طویل ترین عبارتوں کو مجزّأ ومقطع کرتے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح تقسیم

کرتے کہ درس سہل اور آسان ہوجاتا۔ ہمارے ٹوٹے پھوٹے ترجمہ کے بعد خوب صورت ادبی پیرائے ردیف وقافیہ کے ساتھ اس طرح ترجمہ کرتے کہ ہم انگشت بدنداں رہ جاتے۔ ہم اکثر ان کے مقفی کلام اور حسین تعبیرات کولکھ لیا کرتے کیونکہ آپ فرماتے :**قیدو ا العلم بالکتابۃ** ۔اور پھر جب فضیلت کے آخری سال میں پہنچے تو جمہرۃ اشعار العرب (معلقات) کے تین شعرا(امرؤ القیس ، زہیر اور عمرو بن کلثوم) کی تدریس کا لطف اٹھایا۔ معلقہ امراؤالقیس کا مطالعہ اور ترجمہ کی سیٹنگ گرچہ مشکل تھی پھر بھی ہم لوگ بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کرکے آتے ۔منظوم عبارتوں کو منثور میں تبدیل کرتے اور پھر ترجمہ کرنے کی ترغیب دیتے ۔ ہماری کمزوریوں پر مولانا محترم کبھی اظہار نکیر فرماتے نہ ڈانٹتے اور نہ سرزنش کرتے ۔ بلکہ لب و رخسار کے تیور سے اپنی خفگی اور ناراضگی ظاہر کرتے ۔ مطالعہ کی تشویق دلاتے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے: بچو بغیر مطالعہ کا درس نامکمل اور ناپختہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر صورت میں مطالعہ کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنالیں ۔علمی سفر میں زندگی صرف مطالعہ سے آتی ہے ۔ ہمارے ترجمہ کے بعد نہایت فصیح و بلیغ اور سلیس و جزیل ترجمہ کرتے کہ طبیعت خوش ہوجاتی اور ہم عش عش کرتے رہ جاتے ۔

ترجمہ وتشریح کرتے ہوئے قافیہ آرائی اور امثال وحکم کی چند جھلکیاں

کہاوتیں ،ضرب المثل اور محاورے ہر زبان کے اٹوٹ اور دلچسپ حصہ ہوتے ہیں ۔ان سے زبان و بیان کے اندر لطافت آتی ہے ۔معنی آفرینی اور اثر پذیری پیدا ہوتی ہے۔ ادبا اور فصحا نے ہمیشہ اس کی طرف بڑی توجہ دی ہے۔ اگر چہ موجودہ دور میں ان کی طرف میلان خال خال ہی نظر آتا ہے ۔مگر مولانا محترم نے اس کا حظ وافر پایا، جن کی چند مثالیں درج ذیل ہیں ۔

چشم نم دیدہ اور آنکھیں آبدیدہ تھیں ۔ہم نے ہرنیش زنی کا جواب اپنی تیغ زنی سے دیا۔ دل فگار ہے اور آنکھیں اشک بار ہیں ۔اس قوت سے برسرِ پیکار ہوا جو میرے درپے آزار تھی ۔ ماہی بے آب کی طرح بیتاب ہے ۔ایک دن مولانا کے ساتھ دارالاقامہ سے درس گاہ کی طرف جارہا تھا موسم گرما کی شدت وتمازت اپنے عروج پر تھی اور جب گرم ہوا چلی تو آپ نے کہا: باد زمہریر کس قدر آزار پہنچارہی ہے ۔اسی طرح آپ درجہ میں شامت اعمال، شب وصال ، شام فراق، آب حیات ، آب زلال ، کبیدہ خاطر ،ملول طبع ، آشوب محشر ، شب دیجور، زلف گرہ گیر کا اسیر ہے، اشک جگر سوز چھلک اٹھا، مار آستین کے فریب سے بچو، قدوم میمنت کی رنجہ فرمائی سے ہم شاداں وفرحاں ہیں اور آبلہ پائی کی زحمت نہ فرمائیں، زلف گرہ گیر چہرہ تاباں قیامت خیز است

، خطائے بزرگان گرفتن خطا است، آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را، عقل مند را اشارہ کافی است، خود کردہ را تدبیر نیست جیسے بہت سے فارسی الفاظ اور جملے استعمال کرتے۔ اسی طرح بکثرت فارسی مثل بھی استعمال کرتے۔ جیسے: صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند، مار گزیدہ از ریسمان می ترسد، چاہ کن را چاہ در پیش، جہاں چاہ راو ہاں راہ را، خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج، زلف کج بر چہرہ خوباں قیامت می کند، آمدن با ارادت رفتن با اجازت، عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، قدر جوہر جوہری داند، چوب خدا صدا ندارد وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح موقع ومحل سے عربی امثال وحکم بھی استعمال کرتے۔ جیسے۔ بکروا تسعدوا، الوقایۃ خیر من العلاج، الہوی یزید من النوی، ماتجلبہ الریاح تأخذہ الزوابع، من قصرت یدہ مدلسانہ اور الافعال ابلغ من الاقوال، فی التأنی السلامۃ وفی العجلۃ الندامۃ، الخطأ من العجول، ان اللہ یمہل ولا یہمل، عند الامتحان یکرم أو یہان الرمد خیر من العمی۔ ایک مرتبہ مولانا صغیر احسنا صلاحی مجھے کسی کام سے بھیج رہے تھے۔ آپ کچھ سمجھا رہے تھے کہ وہیں آپ بھی موجود تھے فوراً کہا: اذا ارسلت حکیما فلا توصیہ۔ ایک بار میں نے کہا: مولانا! آپ اتنے چھوٹے کمرے میں کیوں رہتے ہیں جب کہ دیگر اساتذہ بڑے بڑے کمرے میں رہتے ہیں؟ تو آپ نے برملا کہا: کوخ الحر قصرہ۔ کبھی مشکلات ومصائب کے دوران کبیدگی سے پرے ہٹ کر فرماتے: اذا صدق العزم وضح السبیل۔ کبھی مطالعہ پر ابھارتے ہوئے کہتے: فاقد الشیء لا یعطی۔ کلاس میں ایک طالب علم دوسرے کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے پاتے تو کہتے: لولا الامل لانفجر القلب۔ اور کبھی نصیحت کرتے ہوئے کہتے: العدو الحاذق خیر من الصدیق الخافق۔ اس طرح اشارات و کنایات، تشبیہات وتمثیلات اور استعارات وتلمیحات کے ترجمے کی پوری پوری رعایت کرتے۔ قیس ولیلی کی جب وادی عشق ومستی میں داخل ہوتے تو بڑی خوبصورتی اور پاکیزگی کے ساتھ دامن بچا کر نکل جاتے مقصود و مدعا بھی حاصل ہو جاتا اور غبار عشق جھاڑ کر بامراد بھی ہو جاتے۔ آپ کی زباں وبیاں میں جمال کی رعنائی، حسن کی یکتائی، فکر کی نکتہ آفرینی، نطق کی انگبینی اور محبت وشیفتگی کی ترجمانی ہوتی۔ کبھی صنف نازک کی محبت وآشفتگی اور دلربائی ودلفریبی کی طرف اشارہ کرتے تو کبھی لب ورخسار کی لطافت ونزاکت پر لب کشائی کرتے ہوئے مرور الکرام کی طرح گزر جاتے۔ مناسب سوالات کے جوابات ماقل ودل کے اصول پر دیتے اور غیر ضروری سوالات کو لائق اعتنا نہ سمجھتے ہوئے سبق آگے بڑھا دیتے۔

اوصاف ومحاسن

آپ کے اندر قرآنیات کے مطالعہ کا ذوق وشوق موجزن تھا۔ مفردات وکلمات، طرق واسالیب اور تاویل وتفسیر پر گہری نظر تھی۔ بلاغت قرآنی سے آشنا تھے۔ قرآنی علوم پر رسوخ حاصل تھا۔ علامہ فراہیؒ کے نظام القرآن، مولانا امین اصلاحی کے تدبر قرآن، مولانا مودودی کے تفہیم القرآن اور علامہ راغب اصفہانی کے مفرادات القرآن سے کافی لگاؤ تھا۔ فکر فراہی اور فکر مودودی دونوں کے مداح تھے اور ایک کو اپنا علمی رہنما اور دوسرے کو تحریکی قائد تسلیم کرتے۔ قرآنیات میں فکرِ فراہی کے آئینہ دار تھے تو معاملات زندگی میں فکرِ مودودی کے علمبردار تھے۔ گو کہ دونوں افکار کے پیکر میں ڈھل کر آپ کی شخصیت پروان چڑھتی رہی۔ قرآن کی تلاوت بڑی دل سوزی کے ساتھ کرتے۔ قرآنی محاسن وتعبیرات پر غور کرتے ہوئے کبھی کبھی اشک دل چھلک اٹھتا۔ یہ شعر آپ پر کس قدر صادق آتا ہے:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہوتو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

آپ جامعۃ الفلاح کے لیے ہمیشہ حسین خواب دیکھتے اور ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اپنی جانفشانیوں اور عرق ریزیوں کا نذرانہ پیش کرتے۔ تاریخ فلاح کے نازک حالات میں سالار کارواں بن کر ڈگمگاتی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچایا۔ آپ کے چشمہ علم وادب سے کتنے ہی تشنہ لبوں کو سیرابی ملی۔ پیاسوں کو تشنگی بجھانے کا سامان ملا۔ قافلہ علم وادب کو رعنائی ملی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صدارت وقیادت میں جامعہ تعمیر وترقی کی سیڑھیاں بڑی تیزی کے ساتھ چڑھتا رہا۔ جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے آپ نے پہلی بار بلاد عربیہ کا دورہ کیا اور جامعہ کو ان ممالک میں متعارف کرایا۔ توفیق یزدانی اور آپ کی کوشش بسیار کی بدولت منار فلاح کی تعمیر عمل میں آئی۔ مطالعہ وتحقیق آپ کا وظیفہ تھا اور علمی آبیاری آپ کا وطیرہ تھا۔ آپ جامعہ کے لیے طویل المدتی وژن رکھتے تھے۔ آپ علم دوست اور سادہ طبیعت کے مالک اور مقصد کے لیے یکسو تھے۔ فراخ دل، وسیع القلب اور ژرف نگاہ تھے۔ نیکی، خدا ترسی، شرافت ونفاست اور صبر وتحمل کے پیکر تھے۔ عزیمت واستقامت کے خوگر تھے۔ متقی وپرہیزگار اور عبادت گذار، متواضع وملنسار تھے۔ پیران سالی کے باوجود جوش وجذبہ، مستعدی وچستی جیسی صفات سے متصف تھے۔ گفتگو علمی وفکری اور بصیرت افروز اور فکر انگیز ہوتی۔ فلاح کے متاع گراں بہا اور علم وادب کے سرمایہ افتخار تھے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں پر یکساں عبور اور جاہلی ادب نثر ونظم کی تدریس و

تفہیم پر ملکہ حاصل تھا۔ پیچیدہ اور مشکل گتھیوں کو بڑی آسانی سے حل کر دیتے۔ تفسیر و ادب آپ کا خصوصی میدان تھا۔ فکر فراہی کے چشمہ شافی سے خوب خوب سیرابی حاصل کی تھی۔ آپ کی خود اعتمادی، قدر شناسی، قناعت شعاری، شیریں مقالی، سادگی کے ساتھ سلیقہ مندی، نرمی کے ساتھ اصول پسندی اور نرم خوئی اور دل نوازی کے ساتھ تنظیمی و تعلیمی امور کی ادئیگی بہت یاد آتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی رحلت باسعادت سے جامعۃ الفلاح کے قیام کی مہم کا ایک بے لوث سپاہی جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔ جس نے اس ادارے کے لیے اپنا تن من دھن سب نچھاور کر دیا۔ دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کی قربانی پیش کرتے ہوئے خالق حقیقی سے جا ملے۔ جامعہ کی تعمیر و ترقی میں آپ کا لازوال کردار آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اس طرح معرفت و آگہی کا گل سرسبد ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

●⧉●

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيم

(آل عمران:۳۱)

’کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اللہ غفور ورحیم ہے۔‘

گفتار اور کردار کے پیکر

مولانا محمد ادریس جمیل فلاحی

حضرت مولانا عبدالحسیب اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ سے جن سیکڑوں اور ہزاروں شاگردوں نے علمی، روحانی اور اخلاقی پیاس بجھائی ہے ان میں راقم خود بھی ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے

مولاناؒ کی عظمتوں اور رفعتوں کا کوئی کیا اندازہ کرسکتا ہے جن کو مبدأ فیاض نے اپنے خزانۂ خاص سے کچھ ایسی عظمتیں اور رفعتیں عطا کی تھیں جو صحیح معنوں میں انہیں امت کے اکابرین کی صف کھڑا کرتی ہیں۔ ہم یہاں اس مختصر سی تحریر میں مولاناؒ کی عظمتوں اور بیش بہا خوبیوں کو واضح کریں گے جو ہمارے خود کے مشاہدے میں ہیں۔

اس حقیقت سے ہر صاحب علم وفضل واقف ہوگا کہ تقریر وتحریر کی زبانیں اسلامی کردار کے آگے ماند پڑ جاتی ہیں۔ جو کام برسوں کی عرق ریزی، برسوں کی جانفشانی، برسوں کی منصوبہ بندی، لٹریچر کی زبردست تیاری اور تقریر وتحریر کی صلاحیتوں کی بے پناہی سے نہیں انجام پاسکتا وہ محض کردار کے ذریعے مکمل ہوجاتا ہے۔ جس کے تاجدار اور سرخیل مولاناؒ تھے۔

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر ہتھیار، ہر پکار اور ہر للکار کا مقابلہ اور توڑ ممکن ہے لیکن سلوک وسیرت، خلوص وصالحیت اور اخلاق وکردار کی کاٹ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال مرد مومن کو بے تیغ لڑتا ہوا سپاہی دیکھتے ہیں۔ سچی اور پکی بات یہ ہے کہ استاذ مکرمؒ ہمارے نزدیک گفتار میں اور کردار میں اللہ کی برہان تھے۔

اللہ کی کتاب قرآن حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت دونوں اس بات پر گواہ ہیں کہ ایک مرد مومن کو اخلاق حمیدہ اور فضائل کریمانہ سے متصف ہونا ازبس ضروری ہے۔ ان سے اس کا دین بھی مکمل ہوتا ہے اور

اس کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دنیا بھی سنورتی ہے اور آخرت بھی۔ استاذ مکرم انہی کے رجال میں سے رجل کامل تھے۔

استاذ مکرمؒ نہ صرف قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، بلکہ غور وفکر، تحقیق وجستجو اور علم وتدبر سے ان کا کردار بنا ہوا تھا۔ جب بھی ان کے حجرے میں جانا ہوا ان کو اکثر مطالعۂ قرآن اور مطالعۂ حدیث میں مستغرق پایا۔ مولاناؒ فکر فراہیؒ کے ترجمان تھے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ کا بڑے ہی ادب واحترام سے ان کے کارناموں کا ذکر فرماتے تھے۔ ہمارے ہاں کلاسوں میں جب کبھی جماعت اسلامی ہند کا ذکر چھڑتا تو مولاناؒ غیر معمولی سنجیدہ ہو جاتے اور اپنے معروف مغموم لہجے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی خدمات جلیلہ اور مساعی حمیدہ کا ذکر فرماتے۔ اس طرح وہ اپنے اکابرین کے بڑے مداح اور بڑے قدر دان تھے۔

استاذ مکرمؒ عبادت وریاضت میں اپنی مثال آپ تھے۔ اپنی نمازوں کی محافظت میں اس قدر حساس تھے کہ اللہ کے حضور سج دھج کر مسجد تشریف لاتے، قیام وقعود، قرأت وتلاوت اور رکوع وسجود کا کیا کہنا ان کا سارا وجود خشوع وخضوع کا پیکر بنا ہوا ہوتا۔ نمازوں میں ان کی سنجیدگی ومتانت کا عالم یہ تھا کہ وہ امامت کرنے سے اگرچہ گھبراتے تھے لیکن بحالت مجبوری جب کبھی وہ جہری نمازوں کی امامت فرماتے تو وجد انگیز تلاوت فرماتے، ہر آیت کی تلاوت میں ترتیل کا اتنا لحاظ فرماتے کہ آواز میں لرزہ طاری رہتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ مقبول عبادت اسی کو کہتے ہیں اور یہی وہ عبادت ہے جس کا حکم حدیث جبرئیل میں دیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ استاذ مکرمؒ ایک باوقار صوفی، بے مثال متقی اور باکمال ولی اللہ تھے، اتباع سنت، زہد وورع، تقویٰ وطہارت، عجز وانکسار اور ذکر واذکار سے ان کا قلبی لگاؤ تھا۔ ان کی وضع قطع، ڈیل ڈول، گفت وشنید، رہن سہن، خورد ونوش، وعظ ونصیحت، آمد ورفت اور نشست وبرخاست ان کی ہر خوبی ریاکاری، نام ونمود اور شہرت وناموری سے پاک تھی۔

پتا دیتا ہے ان کے نقش پا کا
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

استاذ مکرمؒ کا اگرچہ تصنیف وتالیف اور تحقیق وتنقید کے میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ نہیں ہے لیکن ان کی شخصیت کی جامعیت اور دلآویزی، ان کے اقوال وافعال کی سحر آفرینی، ان کے دروس کی اثر پذیری اور ان کی

تذکیروں کی لطافت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ان کے چھوٹے چھوٹے جملے، ہر جملہ کا دوسرے جملہ سے ربط اور ہر جملہ ردیف وقافیہ سے لیس، جس سے مضمون میں نہ کوئی خلل اور نہ کوئی خلجان۔ان کی ہر گفتگو، ہر خطبہ اور ہر تذکیر مختصر اور جامع جسے ہر سننے والے نے غور سے سنا اور ہر لکھنے والے نے اطمینان سے لکھا۔جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔

استاذ مکرمؒ عربی اور اردو زبان وادب میں نہ صرف اہل زبان کی سی قابلیت اور صلاحیت رکھتے تھے، بلکہ وہ اس میدان میں یکتائے عصر بھی تھے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن فہمی میں ان کا لوہا سب نے مانا ہے۔اردو تو اردو اس کی بات نہ کیجیے۔ جہاں تک عربی زبان وادب کی بات ہے تو اس میں ان کے تمام شاگردان رشید اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ عرب کے جاہلی شعراء کے اشعار کی ترجمانی اور ان کی توضیح وتشریح اس طرح فرماتے کہ تراکیب، اسالیب، بلاغت اور استشہاد سے متعلق تمام گتھیوں کو اپنے مختصر اور جامع جملوں میں سلجھا دیتے۔

استاذ مکرمؒ خاموش طبع اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔شریعت میں خاموشی کی نہ صرف بڑی پذیرائی کی گئی ہے بلکہ اسے نجات کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولاناؒ شریعت کے اس فرمان کی مکمل تعبیر وتصویر تھے۔ایسوں کے لیے اس شعر میں یوں تعریف کی گئی ہے:

وہی لوگ رہتے ہیں اکثر خاموش
زمانے میں جن کے ہنر بولتے ہیں

استاذ مکرمؒ ہمارے زمانے میں تقریباً نو سالوں تک مسلسل جامعۃ الفلاح کیصدر مدرس رہے۔ وقت سے پہلے دفتر جانا، دفتری نظم وانصرام کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنا، وقت پر کلاسوں میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دینا اور چھٹی کے بعد دیر تک دفتر میں جمے رہنا ان کا وظیفہ بنا ہوا تھا۔ڈیوٹی سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ خود سراپا ڈیوٹی بنے ہوئے تھے۔اساتذہ کی جھرمٹ میں انہیں گلہ شکوہ کی نہ عادت تھی اور نہ سننے کی تاب بلکہ بڑے ہی بردبار اور متحمل مزاج تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اساتذہ کرام کے قدرداں تھے۔

جامعۃ الفلاح اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر یہ ہندوستان میں منفرد دینی ادارے ہیں۔ جہاں پر عام بول چال میں اساتذہ اپنے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔وہ آپس میں مولانا یا حضرت کا استعمال نہیں کے برابر کرتے ہیں خود اساتذہ کے درمیان بھی اور طلبہ کے مابین بھی اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ابوبکر صاحب، عنایت اللہ سبحانی صاحب، رحمت اللہ اثری صاحب، طاہر مدنی صاحب وغیرہ۔ ماحول کا

اثر اگر چہ استاذ مکرمؒ پر بھی تھا لیکن وہ اس کے خلاف تھے۔ وہ طلبہ کو اکثر روکتے اور ٹوکتے تھے کہ آپ اپنے اساتذہ کو ادب و احترام سے ناموں کے آگے مولانا کہہ کر پکاریں۔

استاذ مکرمؒ طبعی طور پر کھیل کود کو پسند نہیں فرماتے تھے اس لیے وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ طلبہ کھیل کود کی بجائے پڑھنے لکھنے کو ترجیح دیں، ان کے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے۔ ایک دفعہ مسجد کے سامنے بلیک بورڈ پر ہاکی میچ کا اعلان چسپاں تھا۔ طلبہ اکثر عصر کے بعد اعلانات پڑھا کرتے تھے۔ بورڈ پر میچ کا اعلان پڑھنے کے لیے طلبہ کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مولاناؒ نے یہ منظر دیکھ کر برادر مکرم ابوذر فلاحی کو مخاطب کر کے فرمایا: ''یا اباذر! انظر الی ھاکی انی باکی علی ذاکی۔'' مولاناؒ اپنی نصیحتوں میں اکثر فرمایا کرتے: کعبہ بناؤ کعبہ کو، عمل خواہ تھوڑا کرو مگر اس کو دوام بخشو، ماقل دل۔ سحر خیزی سے قلب ونظر کو آباد رکھو، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے پیار کرو، بروں کی صحبت سے تنہا رہنا پسند کرو، نظریں نیچی رکھو اور باوقار بنو، کم کی خواہش کرو کہ اس کو پاسکو، اللہ سے تعلق ضابطہ کا نہیں رابطہ کا رکھو، وغیرہ۔

ساتھ اللہ سے دعا ہے کہ وہ استاذ مکرمؒ پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، انہیں جنت میں اونچے سے اونچا مقام بخشے، انہیں ان کی خدمات اور قربانیوں کا بھرپور صلہ عطا فرمائے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

●◘●

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ آتَيْنٰهَا إِبْرٰهِيْمَ عَلَى قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّن نَّشَآءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ

(الانعام:۸۳)

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ۔ دل نواز شخصیت

ڈاکٹر محی الدین غازی

مدارس کے اساتذہ کی گفتگو میں شگفتگی، شیرینی، شستگی اور لفظ واسلوب کی ندرت جیسی خوبیاں عام طور سے نہیں پائی جاتی ہیں، ان کی گفتگو پر خشک قسم کا فقہی اسلوب غالب رہتا ہے۔ استاذ محترم کی زبان بہت اعلیٰ معیار کی ہوتی، وہ کبھی عوامی زبان میں گفتگو نہیں کرتے تھے، خواہ درجے میں پڑھا رہے ہوں، یا کسی طالب علم کو سمجھا رہے ہوں، یا اپنے اعزہ واقارب سے محو گفتگو ہوں۔ طلبہ ان کی گفتگو سنتے اور پھر ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک ان کے خوب صورت اور بلیغ جملوں کو دوہرا کر لطف اندوز ہوتے رہتے۔ اس طالب علم نے بہت سے مدارس اور جامعات میں وقت گزارا ہے، عربی وعجمی بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے، اہل علم کی بہت سی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع پایا ہے، لیکن ایسی شگفتہ گفتگو بہت کم لوگوں سے سننے کو ملی۔

مدارس میں اساتذہ کی توجہ عام طور سے پڑھانے پر ہوتی ہے، وہ کتاب خوانی اور نصاب کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں، طلبہ ان سے صرف کتاب پڑھنا سیکھتے ہیں، لیکن استاذ محترم کی خوبی کچھ اور تھی، ان سے طلبہ کو ادب اور سلیقہ سیکھنے کا موقع حاصل رہتا تھا، ان کی ہر ہر ادا میں سلیقگی ہوتی، اور یہ سلیقگی آخری دم تک باقی رہی، اس خوبی میں وہ ممتاز ترین تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے کہ اگر وہ کچھ نہیں پڑھائیں، طلبہ کے درمیان صرف کچھ وقت گزاریں، طلبہ ان کو دیکھیں اور سنیں، اور ان سے شائستگی اور متانت کا سبق لیں، تو یہ طلبہ کی شخصیت سازی کے لیے اچھا پڑھانے والے بعض اساتذہ سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ مدارس کی ترجیحات میں عام طور سے ایسی تربیت ہوتی نہیں ہے، اس لیے وہ ایسے معلم آداب شخصیتوں کے قدرداں بھی نہیں ہوتے ہیں۔

استاذ محترم کی گفتگو بہت پاکیزہ ہوتی، خلاف مروت تعبیر ان کی زبان پر آ ہی نہیں سکتی تھی، مجھے موجودہ صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں ہے، لیکن طالب علمی کے زمانے میں جامعۃ الفلاح کا یہ عمومی مزاج تھا، یہاں کے اساتذہ کے اندر گفتگو میں شرم وحیا کا لحاظ اتنا زیادہ تھا کہ فقہ کی بعض عبارتوں اور معلقات کے بعض اشعار کا

ترجمہ کیسے بنا گزر جاتے۔ استاذ محترم کے یہاں بھی شرم وحیا بہت زیادہ تھی، اس کا اثر طلبہ کی گفتگو پر پڑنا یقینی تھا۔ جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد بعض دوسرے اداروں میں جانے کا موقع ملا، تو اس سلسلے میں بہت خراب صورت دیکھنے کو ملی۔

طالب علم جب مادر علمی میں چھ سال گزار کر عالمیت اور فضیلت کی تکمیل کر چکا تو ایک دن اسے کسی نے بتایا کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اہل حدیث ہیں، نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو واقعی رفع یدین کرتے ہوئے پایا، مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ مادرِ علمی میں ایسا مسلکی توسع پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے مسلک پر عمل تو کرتے ہیں، لیکن اس کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ طلبہ کی نظر میں یا ان کے درمیان بحث میں اساتذہ کا مسلک کبھی نہیں رہتا، اور نہ اساتذہ طلبہ کے درمیان کوئی مسلکی تفریق کرتے۔ باہر سے آنے والے اساتذہ جو فلاح کے مزاج آشنا نہیں ہوتے ہیں، وہ تو مسلکی بحثوں کو چھیڑ دیتے ہیں، لیکن وہ بحثیں بھی عام طور سے سرد مہری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مسلکی توسع کے اس ماحول کو بنانے میں فلاح کے اولین اساتذہ کا اہم رول ہے، جن میں کچھ حنفی اور کچھ اہل حدیث تھے۔

وسعت قلبی کے حوالے سے ایک واقعہ ذکر کرنا مناسب ہوگا: ایک مرتبہ ٹرین کے سفر میں دار العلوم دیوبند کے بزرگ استاذ مولانا نعمت اللہ اعظمی صاحب کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا، مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کا ذکر آیا، فرمانے لگے، ہم دونوں ایک ساتھ جامعۃ الرشاد میں بطور استاذ رہے، میں دیوبند سے تعلق رکھتا تھا اور وہ جماعت اسلامی سے، لیکن ہم دونوں کے درمیان ذرا سی تلخی یا تکرار نہیں ہوئی۔ مجھے دونوں بزرگوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، میں نے دونوں کو وسعت قلبی کے معاملے میں ممتاز پایا۔

دینی مدارس میں اساتذہ عام طور سے طلبہ کو خدمت کے فضائل بتاتے ہیں، اور خود مخدومیت کا نمونہ بنے رہتے ہیں، ہر بزرگ کے ایک یا ایک سے زیادہ خادم ہوتے ہیں، خاص بات یہ ہے کہ ان خادموں میں کبھی حضرت کے صاحب زادے یا پوتے نواسے نظر نہیں آتے۔ جامعۃ الفلاح میں طلبہ سے خدمت لینے کا عام مزاج نہیں ہے، طلبہ اپنے شوق اور اصرار سے خدمت کرنا چاہتے ہیں، بعض اساتذہ ان کے شوق کو تکمیل کا موقع آسانی سے دیتے ہیں اور بعض بہت مشکل سے۔ استاذ محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی خدمت کرنا بہت مشکل کام ہوتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی وہ نل سے پانی بھرنے کے لیے بالٹی یا لوٹا لے کر کمرے سے نکل جاتے، طلبہ دوڑ کر ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے اور مشکل سے لے پاتے۔

مولانا محترم کے اندر خاکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اسٹیج پر انھیں لانے کے لیے اصرار کرنا پڑتا تھا، کوئی جلسہ ہوتا تو سامنے بیٹھنے کے بجائے کہیں پیچھے چھپ کر بیٹھ رہتے۔ گفتگو میں بھی بے حد خاکساری کا اسلوب اختیار کرتے۔ وہ جب کمال خاکساری سے طلبہ کے سامنے اپنا نام لیتے تو سب کا سر ادب سے جھک جاتا۔

مولانا زندگی بھر دو جہتوں کے ساتھ وفاداری ایک ساتھ نباہتے رہے، وہ فکر فراہی کے شیدا تھے، اور جب قرآن پڑھاتے تو فکر فراہی کے ترجمان بن کر پڑھاتے، ساتھ ہی وہ جماعت اسلامی کے مخلص رکن تھے، اور جب جماعت ان سے جو تقاضا کرتی وہ لبیک کہتے۔ دونوں جہتوں میں فرضی تصادم کے مفروضے لوگ گھڑتے رہتے، مگر وہ ہمیشہ ایسے ہر مفروضے سے بالاتر رہتے۔ وہ اپنے رویے میں اس حقیقت کی مجسم دلیل تھے کہ فکر فراہی اور تحریک مودودی میں غیر معمولی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

مولانا سے ایک بار ملاقات کرنے ان کے گاؤں جانا ہوا، ساتھ میں ہمارے ساتھی اور ہم درس عابد بیگ فلاحی بھی تھے، دیکھا کہ کرانہ کی چھوٹی سی دکان پر بیٹھے ہیں، گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں شکر اور نمک جیسے سامان خرید رہے ہیں، اور مولانا اسی سلیقہ مندی کے ساتھ سامان وزن کر کے دے رہے ہیں، جس سلیقہ مندی سے ہمیں قرآن کی تفسیر اور عربی ادب پڑھایا کرتے تھے۔ اس وقت مولانا کو جامعہ سے ریٹائرمنٹ کا پروانہ مل چکا تھا، آنسوؤں پر مشکل سے ضبط کیا، مولانا کے ہم عصر وہ بہت سے بزرگ ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے، جو زندگی بھر اپنے اپنے دارالعلوم کی رونق بنے رہے، اور جن کے شاگرد اور خدام زندگی کی آخری سانس تک ان کی خدمت اور ناز برداری میں مشغول رہے۔

احساس ہوتا ہے کہ شخصیت پرستی کے دائرے سے ہم اس جوش کے ساتھ باہر نکلے کہ شخصیت شناسی تو دور کی بات ہے، شخصیت کے بنیادی حقوق کی ادائی سے بھی غافل ہو گئے۔

فکر فراہیؒ و فکر مودودیؒ کا سنگم: مولانا عبدالحسیب اصلاحی

ڈاکٹر رضوان احمد رفیقی

جامعۃ الفلاح کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اس عظیم الشان تعلیمی قلعے کو روزِ اوّل سے ملت کے ایسے سپوت میسر آئے جنھوں نے اس کو ایک ایسا تناور درخت بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، جن کے فیض سے بلریا گنج واطراف کے باشندگان نے ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے تشنگان علم نے استفادہ کیا، بلکہ بسا اوقات طالبان علم نبوت نے سرحدوں کی مصنوعی دیواروں کو بھی پھلانگ دیا اور جامعہ کے فارغین ومستفیدین برصغیر ہند و پاک کے علاوہ دنیا کے تمام براعظموں میں پہنچے اور علم نبوت اور دعوت حق سے اقوام عالم کو سیراب کرنے لگے۔

جامعہ کے ان مخلص بانیان کی، جنھوں نے جامعہ کی تعمیر وترقی میں اپنا خون پسینہ سب کچھ لگا دیا ہے، اگر فہرست تیار کی جائے، تو اس میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحسیب اصلاحی — رحمۃ اللہ علیہ — کا نام سب سے اوپر آئے گا- مولانا اس وقت جامعہ سے وابستہ ہوئے جب ان کے سامنے کئی ادارے نگاہیں بچھائے ہوئے تھے، مدرسۃ الاصلاح سے سبک دوشی کے بعد جامعۃ الرشاد کے ناظم مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے اس گوہر نایاب کو اچک لیا تھا اور مولانا نے حسب وعدہ جامعۃ الرشاد میں اپنی تعلیمی وانتظامی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں، مگر ان کی زندگی ایک مشن کے لیے تھی جو جامعۃ الفلاح کی شکل میں آپ کا انتظار کر رہا تھا، اس لیے ایک سال کے بعد انھوں نے جامعۃ الرشاد سے معذرت کر لی اور پوری زندگی کا سودا جامعۃ الفلاح سے کر لیا۔ مولانا کی شخصیت جامعہ سے لازم ملزوم کی سی ہے، کسی ایک کا تذکرہ دوسرے کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ جامعہ کی تاریخ مولانا مرحوم کے ذکر کے بغیر لکھی نہیں جاسکتی۔

کسی بھی ادارے سے منسلک شخصیات تین طرح کی ہوتی ہیں: بعض اس ادارے کے انتظام وانصرام اور تعمیر وترقی سے متعلق امور کے لیے وقف ہوجاتی ہیں اور تعلیم وتعلم سے ان کا رشتہ برقرار نہیں رہ پاتا۔

بعض صرف درجات ومکتبات تک محدود رہتی ہیں اور کسی طرح کی انتظامی ذمہ داری کو اپنے مقصد کی راہ میں حارج گردانتی ہیں۔ بعض ان دونوں خصوصیات کا مجمع ہوتی ہیں، لیکن ان کی حد بندی اس ادارے کے درو دیوار تک ہوتی ہے، اس سے باہر ان کی علمی وجاہت، دعوتی کردار اور معاشرتی اصلاح کے حوالے ان کا کوئی تعارف نہیں ہوتا، لیکن میرے ممدوح مولانا عبدالحسیب اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ انہوں نے ان تینوں محاذوں پر اپنے جوہر دکھائے۔ کبھی وہ صدر مدرس کے دفتر میں ترانہ کے گھنٹے سے قبل بڑے باوقار انداز میں داخل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، دو گھنٹے بعد ہی عالمیت سال اول کے درجے میں قرآنی موتی رول رہے ہوتے ہیں، اس کے معاً بعد فضیلت سال اول میں جاہلی شعراء کے اشعار کو بڑے لطیف انداز میں سمجھا رہے ہوتے ہیں، مہینہ کے آخری جمعہ کو اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں وابستگان جماعت اسلامی ہند کو ان کا فرض منصبی یاد دلاتے ہیں، ہر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی میدان کے شہ سوار ہیں۔

مولانا اصلاحی کی ہمہ جہت شخصیت کا سب سے ابھرا ہوا پہلو آپ کا تواضع اور انکسار تھا، ہم آخر کہاں اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ ایک عظیم ادارے کا صدر مدرس، جس کے زیرنگیں سیکڑوں اساتذہ وکارکنان ہوں اور وہ ہزاروں طلبہ وطالبات کے دلوں پر حکم رانی کرتا ہو، وہ خود اپنے چھوٹے سے کمرے میں کسی نو وارد طالب علم کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پیش کرے اور اگر چائے بنانے کے لیے پانی کی ضرورت ہو تو کسی چپراسی یا طالب علم کو آواز نہ دے کر خود پانی کے نل کی طرف دوڑ پڑے، حالاں کہ کمرے سے نل تک دسیوں طلبہ اپنے اس عظیم وعزیز استاذ کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوں۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ دن جب مولانا اپنے گھر سے اپنی ٹفن میں اعظم گڑھ کا مشہور پکوان ''قیمے کا سموسہ'' (گوجھیا) لائے تھے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں جامعہ کے دو مخلص خادموں کو، جو دفتر صدارت سے وابستہ تھے، صدیق صاحب اور منظور صاحب (اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنی جنت کا مکین بنائے) اپنے کمرے میں دعوت دی تھی اور ان کے لیے وہیں پر دعوت شیراز کا اہتمام کر کیا تھا۔

مولانا کے اندر اخفا کا بڑا اہتمام تھا۔ شاید اسی کا اثر مولانا کی حیات پر بھی تھا۔ وہ نام ونمود کے قائل تھے نہ اپنے لیے پسند کرتے تھے، وگرنہ عربی ادب کا یہ شناور گوشۂ گم نامی میں کیسے رہ سکتا تھا، جس کو جدید وقدیم عربی زبان وادب پر یکساں قدرت ہو، جب وہ بولے تو سننے والے کے کان ان کی مسجع ومقفع عبارتوں سے سیراب نہ ہوں، عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں کیسے ہوتی ہے؟ کوئی ان سے سیکھے، ایسی شخصیت کا مدرستہ

الاصلاح وجامعۃ الفلاح کے درودیوار تک محدود رہ جانا شاید اس زمانے میں قابل تعجب ہے، مگر اس میں مولانا کے اخفا کے مزاج کا بڑا دخل ہے، ورنہ جس شخصیت نے عرب علماء کے دروس وتقاریر کی برجستہ ترجمانی کی ہو، جس کی عربی دانی پر صاحب تدبر قرآن علامہ امین احسن اصلاحیؒ کو اتنا بھروسہ ہو کہ بلا جھجھک اپنی تمام کتابوں کے ترجمے کا آپ کو امین بنا دیا ہو، وہ زندگی بھر اتنا گم نام رہا ہو۔

طلبہ کے اندر مولانا ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے، آپ کا احساس تھا کہ فضیلت کے درجات میں طلبہ کی ادبی حس اس معیار تک پہنچ جانی چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں ادب کی چاشنی محسوس کرسکیں۔ ایک بار ہمارے ایک ہم سبق ساتھی نے معلّقہ امرؤالقیس کی تشریح میں مزید وضاحت طلب کی تو مولانا کا برجستہ جواب تھا، "بچہ! رس گلّے کو مٹّھی میں بھینچ کر نہیں کھایا جاتا کہ اس کا رس ہی نکل جائے، رس گلہ کی چاشنی ہی اس کو رس گلہ بناتی ہے۔ یہی حال امرؤالقیس کے معلّقہ کا ہے۔

قرآن مجید آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ درجات میں بار بار آپ کی تذکیر قرآن کی مرجعیت پر ہوتی تھی۔ جامعۃ الفلاح کے امتیاز کی جب بھی بات ہوتی تو آپ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ کے نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کو اصل کا درجہ حاصل ہے، باقی تمام علوم اس کے تابع ہیں۔ جامعہ کا یہ امتیاز باقی رہنا چاہیے۔ تفسیر کے درجات میں تدبر قرآن کو مرجع کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے بعض ساتھیوں کا یہ کہنا کہ ذرا سستا لیا جائے، رات میں تدبر قرآن سے مراجعہ کرلیا جائے گا، شاید ان کی کم فہمی تھی ورنہ مولانا کے دروس میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ و مولانا جلیل احسن۔۔ رحمہما اللہ۔۔ کے قرآنی افکار پر گفتگو ہوتی تھی۔ قرآنی علوم ومعارف میں مولانا عبدالحسیب رحمہ اللہ اپنے استاذ مولانا اختر احسن رحمہ اللہ کے صحیح معنوں میں جانشین تھے، بلکہ انھوں نے مولانا اختر احسنؒ کی شخصیت کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ اس میں آپ کا علم وحلم، زہد وتقویٰ، علمی وجاہت ودعوتی کردار سب شامل ہے۔ درجات میں بار بار "میرے استاذ" کا ورد اس بات کی علامت تھا کہ مولانا اختر احسن اصلاحی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت مولانا کے اندر رچ بس گئی ہے۔

مولانا ایک طرف فکر فراہی کے خوشہ چیں تھے۔ انھوں نے علامہ فراہی کے شاگرد رشید مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے براہ راست استفادہ کیا تھا تو دوسری طرف وہ تحریک احیاء دین کے نقیب اور جماعت اسلامی ہند کے رکن رکین تھے۔ اتنے بڑے عالم دین ہونے کے باوجود کئی بار مقامی امارت کی ذمہ داری ان کے کسی شاگرد کے کندھوں پر ڈالی گئی تو اس کی اطاعت کرنے میں انھوں نے ذرہ برابر بھی تأمل نہیں کیا، بلکہ ایک مثالی

کارکن کی حیثیت سے ہمیشہ ہر حکم پر صاد کیا۔ 1994 میں جماعت اسلامی ہند حلقہ اتر پردیش نے ہفتۂ تعارف قرآن منانے کا فیصلہ کیا- اس موقع پر مختلف مقامات پر خطابات عام اور سمپوزیم کے پروگرام رکھے گئے، ایس آئی او کے طلبہ نے اشتہارات لگانے کے ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی، بلریا گنج کے امیر مقامی محترم منشی محمد انور صاحب رات بھر بلریا گنج کے طلبہ کے ساتھ پوسٹرس لگواتے رہے، دوسرے دن مولانا نے دو طلبہ کو بلا بھیجا کہ بھئی! اگر چہ میں فلاح یونٹ کا رکن ہوں، لیکن میری خواہش ہے کہ میرے گاؤں والوں کو بھی جماعت کی اس مہم کے بارے میں پتہ چلے اور وہ بھی دعوت کی اہمیت سے واقف ہوں، کچھ پوسٹرس کے ساتھ آپ دونوں علاؤالدین پٹی چلیں۔اس کو دیوار پر لگوانے کے لیے گوند میں اپنے گھر پر تیار کرالوں گا، پھر ہم سب مل کر جماعت کی اس مہم کا تعارف کرائیں گے۔

مرکزی پالیسی کی روشنی میں ارکان وکارکنان کی تربیت کا ایک خاکہ تمام ارکان کی خدمت میں ارسال کیا گیا، جس کا ایک لازمی جز کسی تفسیر کا سبقاً سبقاً مطالعہ بھی تھا۔امیر حلقہ کی خواہش تھی کہ تمام ارکان ایک بار تفسیر تفہیم القرآن کا مطالعہ کرلیں، جس کا انہوں نے ارکان کی نشست میں اظہار کیا۔ یہ بات ایک رکن جماعت کو بہت ناگوار گزری۔انھوں نے بھری مجلس میں تبصرہ کر دیا کہ ہم قرآن پڑھنے پڑھانے والے لوگ ہیں، ہم سے تو تفہیم القرآن پر تنقیدی جائزہ لے لیں، مطالعہ آپ لوگ کریں، مولانا عبدالحسیب اصلاحی -رحمہ اللہ- نے اس پر ناگواری کا اظہار کیا کہ ایسی مجالس اس طرح کی باتوں کی متحمل نہیں ہوتیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندوستان کے حالات بگڑ چکے تھے، مسلم نوجوانوں میں مایوسی اور تشدد دونوں طرح کے رجحانات پرورش پارہے تھے۔ایسے میں ایس آئی او فلاح یونٹ نے ایک پروگرام کا انعقاد کیا، جس میں مولانا عبدالحسیب صاحب سے استفادہ کی خواہش کی گئی۔مولانا نے اس نشست میں بہت متوازن گفتگو رکھی اور ان حالات کا آزادی کے بعد کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں رجحانات ملت اسلامیہ ہند کے لیے قاتل ہیں، ہمیں انہی چیلنجز میں راہیں نکالنی ہیں اور یہاں کی بڑی اکثریت کے اندر دین اسلام کے بارے میں نرم گوشہ پیدا کرنا ہے، اس وقت ملت اسلامیہ ہند کا یہی لائحہ عمل ہونا چاہیے۔امید ہے حالات بدلیں گے۔

جامعۃ الفلاح کی شوریٰ میں مولانا تادم واپسیں شریک ہوتے رہے اور تمام امور میں اپنی بے باک رائے کا اظہار کرتے رہے۔مولانا اپنی بات مکمل دلائل اور پوری قوت کے ساتھ رکھتے تھے۔ایک بار ایک

بڑے ذمہ دار کا ایک خط مجلس میں زیر بحث آیا، جس میں کچھ زیادہ ہی سخت تبصرہ تھا۔ ایسے موقع پر عموماً لوگ خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن مولانا کی حق گوئی ان کو روک نہ سکی اور وہ یہ بول پڑے: ''اوہ ہو! اتنی بڑی شخصیت کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔''

طلبۂ قدیم سے آپ کو والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کی سرگرمیوں پر آپ کی نظر تھی، ایک بار فرمانے لگے، بیٹا! ''جامعہ کے لیل ونہار'' تو وہی ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مگر حیاتِ نو ملتے ہی نگاہیں ''لیل ونہار'' ہی کو تلاش کرتی ہیں۔ انجمن طلبہ قدیم کی نشأۃ ثانیہ پر بہت خوش تھے اور اس کا بار بار اظہار کرتے تھے۔ انجمن طلبۂ قدیم کے اجلاس کے موقع پر مولانا کے دولت کدہ پر حاضری ہوئی تو دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ دعوت نامہ مل گیا تھا، میں وقت سے پہلے خود حاضر ہونے والا تھا، اس تکلّف کی ضرورت نہ تھی، اپنے عزیزوں سے ملنے کو دل تو مچلتا رہتا ہے، بس مجھے علم ہو جائے، میں تو خود اپنی اس چھڑی کے سہارے چلا آتا، آئندہ سے اس تکلّف کی ضرورت نہیں، غانم یا قاسم کسی کے ذریعے بس اطلاع کر دیا کریں۔

مولانا مرحوم تو اپنے رب کے حضور پہنچ گئے، مگر جامعۃ الفلاح کے منتسبین کے لیے ایک بڑی ذمہ داری چھوڑ گئے۔ جامعۃ الفلاح کے مقاصد کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری، اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی ذمہ داری!

●●

إنّ العلماء ورثة الأنبياء ، و إنّ ألانبياء لم يورّثوا ديناراً و لا درهماً، و إنّما ورثوا العلم ، فمن أخذه أخذ بحظٍّ وافرٍ

(مشكوٰة، كتاب العلم)

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑتے، وہ تو علم کی وراثت چھوڑتے ہیں۔ جس نے اسے حاصل کیا اس نے بڑا حصہ پالیا۔

اخلاق وکردار کے روشن چراغ

ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی

''نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یوم آخرت کو اور ملائکہ کو، اللہ تعالی کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب وہ عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی ومصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں، یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی متقی ہیں۔'' (البقرہ: ۱۷۷)

اس آیت کو جب میں پڑھتا ہوں اور استاذ محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی علیہ الرحمۃ سابق استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر وسابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی شخصیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ مولانا محترم کی پوری زندگی (جو کچھ مجھے معلوم ہے) اس آیت کی تفسیر ہے۔ اللہ کرے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو۔

ایسا شاید اس لیے ممکن ہوسکا کہ وہ قرآن کے طالب علم تھے اور تا حیات قرآن وقرآنی ادب کے استاذ رہے۔ ان کی تعلیم وتربیت بھی اس درسگاہ میں ہوئی تھی جو قرآن کی محققانہ تعلیم کا مرکز ہے۔

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ مدرسۃ الاصلاح کے متعلق جو تصور رکھتے تھے اسے انھوں نے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے نام ایک مکتوب میں یوں واضح فرمایا ہے:

''کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں، اس کا نظم ونسق درست کردیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی، قناعت اور مذہبی خدمت اس کا مطمح زندگی ہو۔'' (مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۳۳)

مولانا فراہی علیہ الرحمۃ نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قیام کی غایت خود مدرسہ کے دستور میں اس

طرح واضح فرمائی ہے :

انتظام تعلیم میں یہ مدرسہ خصوصیات ذیل ہمیشہ پیش نظر رکھے گا:

الف: قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتناء

ب : اصل علم اور قابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کہ کسی محدود نصاب کتب کو الاّ قرآن مجید ومتون حدیث۔

ج : درستی اخلاق یعنی پابندیٔ شرائع وروحانیت اسلام ۔

د : آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت ۔

ہ : کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ ۔

جب میں علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ حمیدالدین فراہیؒ کے مندرجہ بالا الفاظ پر غور کرتا ہوں اور ان الفاظ کی خیالی تصویر بناتا ہوں تو یقیناً مولانا عبدالحسیب اصلاحی علیہ الرحمۃ کی شخصیت میں وہ تصویر نظر آتی ہے اور میں یہ کہنے میں اپنے آپ کو حق بجانب پاتا ہوں کہ مدرسۃ الاصلاح اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل میں کامیاب رہا۔ میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے باضابطہ استاذ اور شاگرد کی حیثیت سے کسی مدرسہ میں تو تعلیم حاصل نہیں کی، مگر جامعۃ الفلاح بلریا گنج ۱۹۸۴ء سے آتا جاتا رہا ہوں۔ اکثر جانا ہوتا ہے۔ ہمارے مربی و محسن مولانا ابوبکر اصلاحی مرحوم ومغفور، مولانا سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ ہوسٹل کے ایک گوشہ میں مقیم ہوا کرتے تھے۔ دوسرے گوشہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ اپنے کمرہ میں بوریا نشین کی کیفیت کے ساتھ رہا کرتے تھے، بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی لاشریک لہٗ چاء سے لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ جی ہاں لاشریک لہٗ چائے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے خود بناتے تھے اور کسی طرح سے کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے اور دوسرے یہ کہ اکثر چائے بغیر دودھ کے ہوتی۔

میں نے ان کی پاکیزہ نیت کو دیکھا اور محسوس کیا۔ پوراوجود اخلاص کا مجسمہ۔ صبر وشکر وتوکل کا پیکر جمیل اور ان کی زندگی حسن خلق، فقر وزہد، تفکر وتدبر کی آئینہ دار پایا اور ان کے سراپا میں محاسبہ ومجاہدہ، محبت وشفقت و دعا واستغفار کو قریب سے دیکھا۔ جب کبھی کوئی ناپسندیدہ عمل کا ارتکاب ہوا، کسی سے ہوا، ان کی زبان پر توبہ ،توبہ کا ورد کرتے سنا۔ بظاہر بہت نرم، مگر اپنے اصول اور ضابطوں کی پابندی میں سخت تھے۔ کسی معاملے میں کسی

کی سفارش قبول نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۹۸ء میں، میں جماعت اسلامی ہند گورکھپور واعظم گڑھ اضلاع کا ناظم ہوا ۔اس وقت کے امیر حلقہ جناب نصرت علی صاحب کے ہدایت پر اس علاقہ کا دورہ کیا۔ جامعۃ الفلاح بھی گیا۔ تمام ارکان وکارکنان کے علاوہ مولانا مرحوم سے ملاقات کی ۔مولانا اس طرح پیش آئے جیسے میں بہت بڑا ذمہ دار ہوں اور مولانا میرے اشارے کے تابع ۔اللہ اللہ عجز وانکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔فرمایا: ’آپ ہمارے ناظم ہیں ‘ آپ جیسا فرمائیں، میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔اور واقعہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں جب کبھی کسی پروگرام کے لیے جیسے درس قرآن، مذاکرہ کی صدارت یا دیگر کاموں کے لیے بصد احترام گزارش کی، مولانا نے کبھی منع نہیں کیا اور نہ ہی کسی طرح کی معذرت پیش کی۔اس وقت میری عمر ۲۷ / ۲۸ سال تھی اور مولانا ۷۵ سال کے رہے ہوں گے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔معلوم نہیں، یہ صفات، یہ کمالات کیوں، یہ خوبیاں، کس طرح اور کس کی صحبت سے حاصل ہوئیں۔ مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم وتربیت کی وجہ سے یا جماعت اسلامی کی وابستگی ذریعہ بنی۔ میں اکثر سوچتا ہوں مدرسۃ الاصلاح افراد کی تعلیم وتہذیب کی فیکٹری کے مانند ہے جہاں سے خام مال کو کندن بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر جماعت اسلامی ہند ان افراد کے لیے میدان عمل ہے۔ وہ موقع فراہم کرتی ہے کہ جو کچھ مدرسہ میں اس کے اغراض ومقاصد کے مطابق سیکھا ہے، اب آیئے اور اپنی شخصیت کو بنایئے، سنواریئے اور پورے عالم کو یہی سکھایئے۔ دونوں میں اس قدر یکسانیت ہے۔ایک دوسرے کا تکملہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مدرسۃ الاصلاح کے بغیر جماعت اسلامی میں رونق نہیں ہے اور جماعت اسلامی کے بغیر مدرسۃ الاصلاح کی فیکٹری ملک وملت کے لیے کارآمد نہیں ہو پا رہی ہے۔ یہ میرا ناپختہ خیال ہے کوئی نتیجہ یا حتمی رائے نہیں ہے۔

میرے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ جوں ہی جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ مدرسۃ الاصلاح کے بیشتر نمایاں فارغین جماعت اسلامی سے وابستہ ہوگئے۔ جیسے کسی چھوٹے سے سوکھے ہوئے تالاب میں مچھلیاں تڑپ رہی ہوں، مگر ان کو اچھلنے کودنے اور فرّاٹے سے تیرنے کے لیے کوئی جگہ میسر نہ ہو۔ کوئی تالاب کشادہ تالاب نہیں ہے۔ اتنے میں موسلا دھار بارش ہوتی ہے، ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے اور پھر مچھلیوں کو تازہ زندگی نصیب ہو جاتی ہے۔ مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی علیہما الرحمہ جو مدرسۃ الاصلاح اور مولانا فراہیؒ کی زندگی کا حاصل ہیں یہ لوگ بلا تأمل جماعت اسلامی سے نہ صرف وابستہ ہو جاتے ہیں بلکہ جماعت اسلامی کا دل ودماغ بن جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ باحیات

ہوتے تو وہ بھی جماعت اسلامی سے ضرور وابستہ ہو جاتے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی علیہ الرحمۃ اور ان جیسے دیگر فارغین مدرسۃ الاصلاح ، جیسے مولانا شہباز اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا امانت اللہ اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، مولانا عبدالعلیم اصلاحی۔ یہ وہ نام ہیں جو مدرسۃ الاصلاح کے نامور ترین فرزند اور سپوت شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر ان کو مدرسۃ الاصلاح سے علیحدہ کر دیا جائے اور پھر غور کیا جائے کہ گزشتہ ایک صدی میں مدرسہ کا کارنامہ کیا رہا، تو اس کا جواب شاید مشکل ہوگا۔ اور یہ تمام افراد جماعت اسلامی کے جرنل، کرنل اور سپاہی رہے ہیں۔

مولانا عبدالحسیب صاحب علیہ الرحمۃ سے جب کبھی مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ پر میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو وہ گریز کر گئے۔ انتقال سے تین ماہ پہلے بھی اور ایک ماہ پہلے بھی اُن کے دولت کدہ پر حاضری ہوئی تھی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ میں بہت کچھ سوچ کر اور ایک کاپی پر چند سوالات لکھ کر لے گیا تھا، مگر ایسی کیفیت میں دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے مولانا سے بہت کچھ معلوم کرتا رہتا تھا اور مولانا کھل کر بات بھی کرتے تھے مگر جب مدرسۃ الاصلاح اور جماعت اسلامی کے عنوان پر آتے تو بالکل زبان بند کر لیتے۔ میں نے مولانا ابوبکر اصلاحیؒ، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا عبدالعلیم اصلاحی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، مولانا رحمت اللہ اثری، ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحیؒ اور ماسٹر اشتیاق احمدؒ و دیگر اصلاحی و متعلقین مدرسہ سے مختلف گوشوں پر کم و زیادہ، مجمل و مفصل بہت کچھ معلوم کیا اور تمام بزرگوں نے کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا، مگر مولانا عبدالحسیب صاحب ہمیشہ خاموش رہے۔ اچھا میرے سوال کرنے کا مقصد بھی صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ جب مدرسۃ الاصلاح اور جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد میں اور فکر وعمل میں اس قدر مناسبت اور یکسانیت ہے تو پھر بہت سارے اساتذہ مدرسہ سے الگ کیوں کئے گئے؟ اور اس کا اثر مدرسۃ الاصلاح یا جماعت اسلامی پر کیا پڑا؟ یہ تحقیق کا موضوع ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ یہ تعزیتی تحریر صرف مولانا عبدالحسیب صاحب کی شخصیت تک محدود رکھوں گا، مگر بات سے بات نکلتی گئی اور مدرسۃ الاصلاح کا ذکر آ گیا۔ لیکن کچھ نامناسب بھی نہیں ہے کہ مولانا کی شخصیت مدرسۃ الاصلاح کی روشن تاریخ کا اہم جز ہے، جسے کبھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تادمِ آخر مادر درس گاہ کے مجلس

انتظامیہ کے بزرگ ترین رکن رہے ہیں۔

مولانا کی زندگی پر ایک بار پھر غور کرتا ہوں تو قرآن مجید کی یہ آیت مجھے یاد آتی ہے:

''سنو، اللہ کے اولیا کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

میری آخری ملاقات ۹ رفروری ۲۰۲۰ء کی صبح ان کے گھر علاء الدین پٹی میں ہوئی۔ میں جب بھی جامعۃ الفلاح کا سفر کرتا تو مولانا سے ضرور ملاقات کرتا، یہ ملاقات کبھی جامعہ ہی میں ہو جاتی اور اگر وہ نہ آتے تو میں بعد نماز فجر پیدل ان کے گھر جاتا۔ آخری مرتبہ ملاقات نہیں دیدار کیا اس لیے کہ بالکل ناتوانی کا عالم تھا۔ واپسی میں مجھے بار بار یہ ڈر ستا رہا تھا کہ شاید اب ملاقات نہ ہو سکے۔ بالآخر ۲۵ رفروری کی دوپہر دو بج کر دس منٹ پر اطلاع ملی کہ قرآن وسنت کا عالم باعمل اس دنیائے فانی سے جاتا رہا۔ ۲۶ رفروی کی صبح میں بھی جنازے میں شریک ہوا۔ تاحدِّ نظر جمِّ غفیر تھا۔ مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی حالانکہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مولانا نظام الدین اصلاحی مدظلہٗ سے درخواست کی جائے، مگر یہ حق تو گھر والوں کو ہوتا ہے۔ جب میں مٹی دے رہا تھا اور منھا خلقنٰکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃً اخریٰ ٹھہر ٹھہر کر پڑھ رہا تھا تو اس وقت رنجیدہ اور سوگ وار دل آواز دے رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہے۔ یہ سراپا آسمان ہے جسے تم مٹی کے حوالے کر رہے ہو۔

استاذ محترم مولانا محمد ایوب اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار یاد آ رہے ہیں:

دم وداع مرا دل بھٹک گیا آخر
وہ کوئی سایہ تھا جیسے ڈھلک گیا آخر
مری حیات اندھیروں کے اب حصار میں ہے
سرور و کیف کی منزل کہیں غبار میں ہے

انکساری وتواضع کی مجسم تصویر

محمد انس

خلوص وللّٰہیت اور صدق وصفا کے پیکر کامل مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ۲۵رفروری ۲۰۲۰ءکو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا محترم ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے، آبائی وطن شہراعظم گڑھ سے تقریبا بارہ کلومیٹر کی دوری پر واقع موضع ''علاؤالدین پٹی'' تھا، ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسۃ الاصلاح میں طالب علم ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں یہاں سے فارغ ہوئے،فراغت کے بعد ماہ شوال سے عیدالاضحیٰ کی تعطیل تک مدرسۃ الاصلاح میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کے مشورے سے رام پور گئے، ایک ماہ وہاں رہے۔ پھر علی گڑھ چلے گئے اور وہاں تحریکی وتدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ تین برس کے بعد مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے انہیں مدرسے بلالیا۔علی گڑھ سے واپسی کا ایک دلچسپ قصہ مولانا نے بیان کیا کہ سفر کے روز وہاں کے نوجوان طلبہ نے ان کا سامان غائب کردیا اور ٹرین کا وقت گزر جانے کے بعد واپس کیا، یہ انہیں علی گڑھ میں روکنے کی ایک محبت آمیز اور پرخلوص تدبیر تھی۔مگر استاذ کے حکم کی تعمیل سے کوئی چیز انہیں روک نہ سکی اور وہ علی گڑھ چھوڑ کر مدرسے آ گئے۔ مدرسۃ الاصلاح میں منصب تدریس پر فائز ہوئے، اس وقت ان کے ساتھیوں میں مولانا محمد ایوب اصلاحی ومولانا امانت اللہ اصلاحی تھے۔سوچ وفکر میں ہم آہنگی اور توافق کے باعث ان لوگوں کے درمیان ایک خاص تعلق تھا۔ ۲۹۶۱ء میں جب چند اساتذہ کو جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں تعلیمی طور پر نقصان دہ حد تک شمولیت کے بہانے مدرسے سے رخصت کیا گیا تو ان میں مولانا موصوف بھی شامل تھے، گرچہ یہ الزام کم از کم مولانا کی حد تک بالکل بیجا اور ناحق تھا، جب انہیں مدرسے سے رخصت کیا گیا اس وقت وہ سفر حج کا عزم کر چکے تھے، وہاں سے واپسی ہوئی تو مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے انہیں اپنے مدرسے میں بلالیا۔اس کے بعد جامعۃ الفلاح کا ایک وفد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں باصرار بلریا گنج لے گیا۔ اس وقت جامعۃ الفلاح بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا، کچھ عربی درجات کی

ابتدا ہورہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے وہاں تحریک اسلامی سے وابستہ اصلاحیوں کی ایک کہکشاں قائم ہوگئی اور اسے ایک مکمل مدرسہ بنا کر چھوڑا، جب مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ وہاں پہنچے تو اسی میں فنا ہو گئے اور اپنی تمام صلاحیتوں، مواقع اور امکانات کو جامعہ کے لیے ہی وقف کر دیا۔ جامعۃ الفلاح کی بے مثال خدمت کی اور اس کے مناروں کو ان بلندیوں تک پہنچایا کہ اہل فلاح یہ کہنے کے قابل ہو سکے کہ ’’ہے ہمالہ سے بھی اونچا میرا مینار فلاح‘‘۔ چالیس برس تک اسی صحرا کے نشیب وفراز کو ہموار کرتے رہے، مگر افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ جس عندلیب چمن نے خون جگر سے گلوں کو سرخی جاودانی بخشی تھی اسی کا وجود وہاں کے دربانوں کو کھٹکنے لگا حتی کہ اسے مختلف حیلوں بہانوں سے چمن بدر کر دیا گیا، حق تو یہ تھا کہ یہ عندلیب خوشنوا نغمہ سرائیوں کے بجائے نوحہ گری اور نالہ انگیزی میں بقیہ عمر گزار دیتا، مگر اسے غضب کا دل عطا ہوا تھا جو ہر جھٹکے اور کچوکے کے بعد بھی اسے جینے کے نئے حوصلے دیتا تھا، جوانی میں ماں کے پاسبانوں نے اس کو سایہ عاطفت سے محروم کیا اور اب بڑھاپے میں ناخلف اولاد نے انہیں دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔ سب کے بعد بھی کبھی ان کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ نہیں نکلا، وہ نہایت خاموشی اور وقار کے ساتھ فلاح سے رخصت ہوگئے اور بندول کے ایک مدرسے میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے اور جب تک قویٰ نے ساتھ دیا اسی مدرسے سے وابستہ رہے۔

مولانا محترم، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کا بیشتر حصہ مولانا سے ہی پڑھا تھا، ان کا معمول تھا کہ چھٹی کے بعد کسی وقت دن میں پڑھی ہوئی آیات کے تفسیری نوٹس قلم بند کرلیا کرتے تھے ان کی نوٹس کی کاپی بڑی قیمتی اور اہم تھی۔ بقول مولانا کے ’میں نے ہمیشہ اسے سینے سے لگا کر رکھا‘۔ اس کاپی سے انہوں نے ساری عمر فہم قرآن اور تدریس قرآن میں فائدہ اٹھایا، وہ بتاتے تھے کہ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے یہ نوٹس ان سے لے کر اپنے پاس رکھے اور اس سے تدریس قرآن میں مدد لیتے رہے، ان دنوں مولانا ندوی کے ایک شاگرد کے لکھے ہوئے نوٹس سہ ماہی ’حیات نو‘ میں ’افادات مولانا جلیل احسن ندویؒ‘ کے عنوان سے شائع ہورہے ہیں، ان مضامین اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے نوٹس کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ندویؒ کی ساری تقریر مولانا کی کاپی ہی سے مستعار ہے۔ مولانا ندویؒ نے بھی مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے باقاعدہ قرآن مجید پڑھا تھا اس وجہ سے بھی دونوں میں یکسانگی کا پایا جانا ممکن ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو عربی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ وہ عربی لکھنے اور بولنے دونوں پر قادر

تھے۔انھوں نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تین تصانیف (دعوت دین اوراس کا طریقہ کار، پردہ اورقرآن اور حقیت شرک) کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، یہ تراجم مختلف رسائل میں قسط وارشائع ہوئے اور پھر کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔مولانا موصوف مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے خاص تعلق رکھتے تھے،مولانا اصلاحی سے خط و کتابت بھی تھی،مولانا اصلاحی کے مولانا موصوف کے نام بعض خطوط رسالہ تدبر کے 'مکاتیب اصلاحی نمبر' میں شائع بھی ہوئے۔انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سانحہ ارتحال پر پاکستان کا سفر کیا اور مولانا اصلاحی سے ملاقات کی اوران کی خاص عنایات کے مستحق ٹھہرے۔وہ اخیر عمر میں حقیقت توحید کا بھی ترجمہ کرنا چاہتے تھے،مگرخراب ہوتی صحت کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

بے شمار خداداد صلاحیتوں اور لیاقتوں کے باوجود وہ انکساری اور تواضع کی مجسم تصویر تھے۔ان کی ہر ادا سے خاکساری کا اظہار ہوتا تھا۔ایک عزیز محترم لکھتے ہیں:'ملاقات کے دوران فرمایا: بیٹا سند کے اعتبار سے اصلاحی ہوں علم کے اعتبار سے نہیں۔'ان سے آپ کچھ پوچھنا چاہیں ان کی تکریم کرنا چاہیں تو وہ سمٹتے چلے جاتے۔انہیں محسوس ہوتا کہ یہ بچے مجھے میرے علم سے زیادہ سمجھ رہے ہیں۔ایک بار مولانا ایک شادی میں گھر پرتشریف لائے، مجھے ان سے آٹوگراف لینے کی سوجھی، ڈائری اور قلم لیے خدمت میں حاضر ہوا۔اس وقت ان کی انکساری اورگھبراہٹ قابل دید تھی: بیٹا! عبدالحسیب جاہل ہے، میں کسی قابل نہیں،نہایت معمولی شد بد رکھتا ہوں،تم مجھے اپنے دادا کی طرح نہ سمجھنا، میں ان کی طرح باصلاحیت نہیں''۔گھبراہٹ میں ان کی زبان سے الفاظ نہیں ادا ہورہے تھے۔

مولانا مرحوم ہمارے گھر میں سب سے زیادہ معزز و محترم رشتہ دار تصور کیے جاتے تھے۔اس کی وجہ مولانا کے خانوادے میں متعدد رشتوں اوران کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ابامحترم مولانا محمد ایوب اصلاحیؒ سے مولانا کے دیرینہ اور گہرے تعلقات تھے۔لہٰذا ہرخوشی وغم کے مواقع پر وہ ضرورتشریف لاتے تھے۔مولانا مرحوم بلا کے ہمت والے واقع ہوئے تھے۔عمر کی نویں دہائی میں علاؤالدین پٹی سے بندول کا پیدل سفر اسی ہمت کا ایک مظہر تھا۔مدرستہ الاصلاح پر ہونے والے ہر بڑے پروگرام میں اورقدیم اصلاحیوں کے انتقال پر ان کے جنازے میں وہ ضرورشریک ہوتے تھے۔چند ماہ قبل ناظم مدرسہ مولانا اشفاق احمد اصلاحی کا انتقال ہوا تو بے حد کم زوری اور ناتوانی کے باوجود وہ شرکت کے لیے تشریف لائے۔اس وقت یہ حال تھا کہ گاڑی کے طویل سفر کے بعد وہ بغیر سہارے کے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔مجھ سے کہا: مجھے وضو کرادو کہ ظہر کی نماز پڑھ لوں

اور جنازے میں شریک ہونے کی کیا سبیل ہوگی۔ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ فکر نہ کریں ہم لوگ آپ کو گاڑی سے لے جا کر نماز جنازہ میں شریک کروائیں گے۔ یوں مولانا کہ ذرا سی خدمت کرنے کا موقع ملا اور مفت میں ڈھیروں دعاؤں کی سوغات ملی۔ یہ مولانا سے آخری ملاقات ثابت ہوئی، اس وقت مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ مولانا اب چراغ سحر ہیں، بجھا چاہتے ہیں، اس کے بعد ایک دفعہ فون پر بات ہوئی، تاریخ مدرسہ پر ہونے والے سیمینار کے حوالے سے بھی بات ہوئی تو انہوں نے خرابی صحت کے باعث معذرت کر لی۔

مولانا کو بارگاہ خداوندی سے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ودیعت ہوئی تھیں۔ دو بیٹیوں کا مولانا کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا، صاحبزادے ذہنی طور پر ذرا کم زور تھے، جس کی وجہ سے انہیں مستقل دقتوں کا سامنا رہا، زہر غم ان کے رگ و پے میں مکمل طور پر سرایت کر گیا تھا۔ مگر وہ ایک ایسے رواں دریا کے مانند تھے کہ جس کی تہہ میں متعدد غم واندوہ کے طوفان کروٹیں لیتے رہتے تھے، مگر دریا کے ساحل پر کھڑے ہو کر نظارہ کرنے والوں کو بمشکل ہی اس کا اندازہ ہوتا تھا۔

●●

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (النحل:۴۴)

'اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے، تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس ہدایت کی تشریح و توضیح کرو جو ان کے لیے اتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔'

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ڈاکٹر انعام اللہ اعظمی فلاحی

میں اور میرے ہم سبق مولانا کو پیار سے نانا جان کہتے تھے۔ کیوں کہ مولانا کے دونواسے عبدالرحیم غانم اور عبدالعظیم قاسم ہمارے درسی ساتھی تھے۔ مولانا سے مجھے عربی چہارم میں قرآن مجید پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ قرآن کے سچے شیدائی تھے، کتاب الٰہی کے خادم تھے اور قرآنی اخلاق و کردار کے پیکر تھے۔ قرآن سے بڑا جذباتی لگاؤ تھا۔ ان کی پوری زندگی تدریس قرآن سے وابستہ رہی۔ مولانا کا فکر فراہی سے غیر معمولی تعلق تھا اور علامہ فراہی رحمہ اللہ کی تصانیف پر بڑی باریک نگاہ تھی۔ مولانا جماعت اسلامی کے سچے سپاہی تھے۔ طلبہ کو مولانا فراہیؒ، مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر زور دیتے۔

مولانا مدرسۃ الاصلاح کے قدیم فارغین میں سے تھے۔ عہد زریں میں مولانا نے مدرسۃ الاصلاح سے استفادہ کیا۔ اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں فاضل اساتذہ کی ایک کہکشاں تھی۔ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ جیسے اساطین مسند تدریس پر جلوہ افروز تھے۔ فراغت کے بعد مولانا مدرسۃ الاصلاح کے مسند تدریس پر چند سال فائز بھی رہے۔

مولانا دوران تدریس تمام بچوں پر یکساں نگاہ رکھتے، کسی کو درس سے غافل ہوتے ہوئے دیکھتے تو فوراً تنبیہ کرتے۔ مولانا کا اسلوب تدریس منفرد اور نرالا تھا۔ مولانا متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنے پر زور دیتے۔ وہ خود بھی متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرتے اور حاصل مطالعہ طلبہ کے سامنے پیش کرتے، جس سے طلبہ کے اندر قرآن فہمی کا ذوق پروان چڑھتا۔ میں پابندی کے ساتھ مولانا کی کلاس میں حاضر ہوتا۔ شاذ و نادر ہی غیر حاضر ہوتا۔ کیوں کہ مولانا کے دروس میں شرکت کا لطف ہی اور ہوتا تھا۔

مولانا کی زبان بڑی نفیس، سلیس اور شیریں تھی۔ مولانا قلیل الکلام تھے لیکن جب ہم کلام ہوتے تو ادب

کے موتی بکھیر دیتے اور فصاحت و بلاغت کی چاشنی پیدا کر دیتے۔آج بھی مولانا کے بہت سے جملے ومحاورے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔مولانا کے انمول موتیوں کو میں اپنی کاپی پر ٹانک لیتا تا کہ یادوں کے دریچہ سے محو نہ ہونے پائے۔دوران تدریس بکثرت عربی اشعار سے استشہاد کیا کرتے تھے۔

مولانا کو عربی زبان سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔مولانا کو عربی زبان میں لکھنے اور بولنے پر یکساں قدرت تھی۔ مولانا کو اہل زبان سے عربی پڑھنے وسیکھنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کے باوجود عربی میں فی البدیہہ خطاب کرتے تھے۔دوران خطابت کبھی عجمیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایسا لگتا کہ کوئی اہل زبان ادبی پیرایہ میں خطاب فرما رہا ہے اور اس کا مشاہدہ ہر طالب علم کو عربی مما لک کے وفود کی آمد پر ہوتا تھا۔زبان کی طرح عربی میں قلم بھی رواں دواں تھا۔آپ کے کئی مضامین عربی مجلّات کی زینت بنے اور ترجمہ شدہ متعدد عربی تصانیف معتبر اہل علم کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔سب سے شاہ کار ترجمہ"**التفسیر الحقیقی للاسلام**" ہے جو مولانا سید احمد عروج قادری کے مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مولانا ابوالحسن ندویؒ کی کتاب"**التفسير السياسي للإسلام**" کی تردید میں تحریر فرمایا تھا۔

مولانا میرے بہت ہی شفیق استاد تھے۔دوران تعلیم مولانا سے مستقل ملاقات ہوتی اور فراغت کے بعد گاہے بگاہے مولانا کے گھر بھی جانا ہوا لیکن ہر ملاقات کے وقت پدرانہ شفقت ومحبت کا احساس ہوتا۔ جامعۃ الفلاح میں چالیس سالہ تدریسی خدمات کے دوران آپ سے علم دین اخذ کرنے والوں کی تعداد حیطہ شمار سے باہر ہے۔آپ کے شاگرد دنیا کے مختلف گوشوں میں مختلف شعبہ حیات میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

مولانا ہر طالب علم سے انفرادی طور پر ٹوٹ کر ملتے تھے۔سب کے احوال سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے۔سب کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے اور ہر طالب علم یہ محسوس کرتا کہ مولانا مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

مولانا حد درجہ اصول پسند انسان تھے، وقت کے پابند تھے۔ ہر طرح کے موسم میں وقت پر جامعہ میں موجود رہتے۔کلاس شروع ہونے سے پہلے حاضر ہوتے اور پانچ منٹ پہلے سبق بند کر دیتے تاکہ مختلف سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکیں۔مولانا کسی کو ذرہ برابر زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔میں جب عربی چہارم میں تھا، میری کلاس بالائی منزل پر تھی۔ درازئ عمر کی وجہ سے مولانا کو اوپر چڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی۔لیکن پھر بھی مشقت برداشت کر کے بالائی منزل پر چڑھتے اور طلبہ کو اپنے علم سے فیض یاب کرتے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

بار ہا اصرار کے بعد استاد محترم، ابو للیث ہال کی نچلی منزل میں پڑھانے پر راضی ہوئے۔

سادگی، تواضع اور خاکساری سے مولانا کی حیات عبارت تھی۔ مولانا اپنا کام خود کرتے تھے۔ طلبہ خدمت کرنا چاہتے لیکن طلبہ کو اس کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا۔ جب بھی مولانا کو اپنے گھر دعوت دی، مولانا ضرور حاضر ہوتے۔ مولانا جب بھی میرے گھر آتے میری خوشی دوبالا ہو جاتی۔ چند سال قبل مولانا حج کے لیے آئے ہوئے تھے، مولانا سے خصوصی ملاقات کے لیے مکہ روانہ ہوا- عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہوٹل میں مولانا سے ملاقات ہوئی اور مختلف علمی موضوعات پر مستفید ہونے کا موقع ملا۔

جامعۃ الفلاح کے منصب صدارت پر کئی سالوں تک فائز رہے۔ مسجد کی تعمیر مولانا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آخر وقت تک جامعۃ الفلاح سے مولانا کا تعلق باقی رہا۔ جامعہ سے سبک دوشی کے باوجود بھی مولانا کا دل جامعہ کے لیے دھڑکتا رہا۔ کبھی بھی جامعہ یا ذمہ داران جامعہ سے متعلق حرف شکایت لب پر نہیں لاتے۔ جامعہ کا ذکر خیر کرتے۔ پابندی کے ساتھ شوریٰ کی مجلس میں شریک ہوتے اور مدلل انداز میں اپنی بات پیش کرتے۔ انجمن کے اجلاس میں اپنے وجود سے چار چاند لگا دیتے تھے۔

مولانا زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ پشتینی زمین ہی مولانا کے معاشی مسائل کے لیے کافی تھی۔ جامعۃ الفلاح کی خوش قسمتی تھی کہ استاد محترم جیسا مخلص و بےلوث خادم اسے نصیب ہوا، جس نے جامعہ کو بام عروج پر پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا اور جامعہ کی تعمیر و ترقی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ استاد محترم رحمہ اللہ کی لغزشوں کو دامن عفو میں جگہ دے۔ ان پر رحم فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے آمین۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

نعمان بدر فلاحی

استاذ گرامی قدر مولوی عبدالحسیب اصلاحیؒ کا ہمارے خانوادے کے متعدد بزرگوں کے ساتھ مراسم اور ربط و تعلق کا سلسلہ یوں تو بڑا قدیم تھا، مگر میں نے ان کو پہلی بار اُس وقت دیکھا جب ۸ برس کی عمر میں ۱۹۸۲ء میں والد محترم حافظ بدرالدین فلاحی کے ہمراہ درجہ اول ابتدائی میں داخلہ کے لیے جامعۃ الفلاح میں قدم رکھا۔ چونکہ میرا شمار بورڈنگ ہاؤس کے کم سن ترین طلبہ میں ہوتا تھا' اس وجہ سے بحیثیت صدر مدرس وہ مجھے اپنے پاس بلا کر نہایت شفقت آمیز لہجے میں خیریت پوچھتے اور مرحوم نانا اور دادا جان کے علاوہ بڑے ماموں فیض الرحمان صاحب، بڑے ابو ڈاکٹر شمس الدین اصلاحی، ڈاکٹر نورالدین اصلاحی اور والد محترم حافظ بدرالدین فلاحی وغیرھم کے احوال بھی دریافت کیا کرتے تھے۔

بڑے ابو ڈاکٹر نورالدین اصلاحی نے اپنی یادداشتوں کو مجتمع کرتے ہوئے بتایا کہ ''۵۰ کی دہائی میں مولانا علی گڑھ سے اصلاح پر بحیثیت استاذ تشریف لائے تھے۔(۱) ہم لوگوں کو نحو و صرف، کتاب الامثال اور القرأۃ الراشدہ وغیرہ اتنے اچھے انداز اور محنت سے پڑھاتے تھے کہ سبق ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ مولانا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ زمانۂ طالب علمی میں مدرسۃ الاصلاح پر ہمارے مرحوم بھائی محمد یونس (بندی کلاں، ضلع مؤ) کے ہم سبق تھے۔ اس زمانے میں مدرسہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، جس کی تیاری کے دوران سخت محنت کے سبب یونس بھائی مرحوم کا ذہنی اور دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔ مولانا اکثر 'بندی کلاں' میں ہمارے دادا شیخ عبدالحیٔ کے کارخانے میں بنے 'گڑ' کا ذائقہ یاد کرتے تھے جو یونس بھائی مرحوم اصلاح پر ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ ۸۰ کی دہائی میں اپنے بیٹے عزیزم شایان احمد سلمہ سے ملاقات کے لیے جب بھی میں جامعۃ الفلاح جاتا تو مولانا بڑی شفقت اور محبت سے ملتے اور چائے پلاتے تھے۔(۲)

بڑے ماموں فیض الرحمان (مقیم حال، ہلدوانی، ضلع نینی تال) ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''۱۹۶۴ء میں مولانا نے ہم کو فلاح پر ریاض الصالحین کا درس دیا ہے جس کا بغیر اعراب والا نسخہ مصر سے منگایا گیا تھا۔ ہم طلبہ ڈکشنری کی مدد سے مطالعہ کر کے آتے اور کلاس میں مولانا ہماری اعراب کی غلطیوں کو درست کرتے۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں میرے نکاح میں شرکت کے لیے مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ کے ساتھ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ بھی والد صاحب کی جیپ پر سوار ہو کر ہمارے گاؤں 'بندی کلاں' تشریف لائے تھے اور ایک شب قیام بھی کیا تھا۔ روایتی اہل حدیث گاؤں میں جمعہ کے دن آمین بالجہر کی صدائے بازگشت پر مولانا نے اپنا اعتراض درج کرایا تو مولانا جلیل احسن ندوی نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا'' آپ نے حج کے موقع پر کیا حرمین میں آمین بالجہر کا مشاہدہ نہیں کیا ہے؟ اس موقع پر مولانا جلیل احسن صاحب نے ہی گاؤں کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا تھا اور میرا نکاح بھی پڑھایا تھا۔ غالباً ۱۹۶۸ء میں والد محترم (لطف الرحمان اعظمی عرف منیجر صاحب) کی دعوت پر مولانا عبدالحسیب اصلاحی ہلدوانی تشریف لائے تھے اور چند روز ہمارے فارم پر قیام کیا تھا''۔ (۳)

بڑے ابو ڈاکٹر شمس الدین اصلاحی (متوفی ۲/مارچ ۱۹۹۳ء) بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے خاص عقیدت اور تعلق رکھتے تھے۔ ۸۰ کی دہائی میں جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم اپنے بیٹے محمد فرحان اور شعبۂ نسواں میں انگریزی کی معلّمہ اپنی بیٹی شہناز باجی سے ملاقات کے لیے جاتے تو مولانا کی خدمت میں ضرور حاضری دیتے۔ (۴)

والد محترم حافظ بدرالدین فلاحی صاحب کے مطابق'' مولانا عربی ادب کے ایک مایۂ ناز استاذ تھے۔ فضیلت سال اول یعنی عربی ششم میں ہم لوگوں کو مقدمہ ابن خلدون بھی پڑھایا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں ہی فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ اور عبارات مقفع اور مسجع ہوتی تھیں۔ طلبہ کو تاکید کرتے تھے کہ مطالعہ کر کے ہی کلاس میں آئیں اور مشکل الفاظ کو لغات کی مدد سے حل کریں۔ ۱۹۷۰-۱۹۷۱ میں فلاح کی عظیم الشان مسجد کی تعمیر میں ان کا کردار بہت اہم اور بنیادی تھا۔ چونکہ عربی میں مافی ضمیر کی ادائیگی ان کے لیے آسان تھی اس لیے چندہ کی غرض سے متعدد عرب ممالک کے طویل سفر کیے۔ ان کی نگرانی میں ہم طلبہ نے بھی مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کی طرح خوب کام کیا ہے۔ وہ اپنی ایک صاحب زادی کا نکاح ہمارے خاندان میں کرنا چاہتے تھے، مگر بعض اسباب سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ چند برس قبل مولانا نے مجھ سے ٹیلی فون پر گفتگو کی تھی اور جملہ تمام متعلقین کے احوال و کوائف دریافت کرنے کے بعد علاؤالدین پٹی میں اپنی زمینوں پر آم کا باغ لگانے کے سلسلے میں مشورہ کیا

تھا۔ غالبًا اُن کے صاحب زادے شارق سلمہ کا باغ کے سلسلے میں اسرار شدید ہوگیا تھا‘‘۔(۵)

جامعۃ الفلاح میں اپنے زمانۂ طالب علمی ۱۹۸۲ء-۱۹۹۴ء کے دوران مجھے استاذ گرامی سے کلاسوں کے علاوہ مختلف مواقع اور شکلوں میں استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ مختلف پروگراموں اور اجتماعات میں ان کی فصیح و بلیغ تقاریر اور صدارتی خطابات بھی سنے۔ زبان بڑی نستعلیق، شستہ اور بلیغ ہوتی تھی۔ ان کی اردو ہی نہیں عربی بھی ٹکسالی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ روزمرہ کی بول چال میں مقامی دیہاتی نہیں بلکہ فصیح اردو زبان کا استعمال کریں۔ ہندی زبان یا اس کے الفاظ کا استعمال ان کی طبیعت پر سخت گراں گزرتا تھا۔ طلبہ میں یہ بات معروف تھی کہ مولانا کے خیال میں ہندی الفاظ کے استعمال سے وضو مکروہ ہوجاتا ہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک مدرسۃ الاصلاح کے زمانۂ قیام میں انہوں نے صاحب تدبر مولانا امین احسن اصلاحی کی معروف تصنیف ’دعوت دین اور اس کا طریقہ کار‘ کا ترجمہ شروع کیا تھا جس کے چند مضامین اخوان کے ترجمان ’المسلمون‘ مصر میں شائع ہوئے تھے۔ امین احسن اصلاحیؒ کے رسالے ’پردہ اور قرآن‘ کا عربی ترجمہ ’**احکام الحجاب فی القرآن**‘ کے نام سے مکتبہ اصلاح سرائے میر سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب ۲۴صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ **المجتمع**، کویت اور ’**الدعوۃ**‘ مصر اور ’**الدعوۃ**‘ کویت وغیرہ میں بھی ان کے مضامین اور جامعۃ الفلاح کا تفصیلی تعارف شائع ہوا ہے۔ کویت کی ایک انتہائی مؤثر، صاحبِ خیر، علمی اور حکومت کے اہم عہدہ پر فائز شخصیت شیخ عبداللہ علی المطوع سے مولانا کے مراسم بڑے گہرے تھے۔ ان کے تعاون سے وزارت اوقاف کویت کی جانب سے جامعہ کی مرکزی لائبریری کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل کتابوں کا ایک قیمتی تحفہ بھی موصول ہوا تھا۔

ایمرجنسی کے دوران شائع ہونے والی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ’عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح‘ (عربی میں اس کتاب کا ترجمہ ’**التفسیر السیاسی للاسلام**‘ کے نام سے شائع ہوا تھا) کے جواب میں مدیر ماہ نامہ زندگی مولانا سید احمد عروج قادری نے ’عہد حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح پر ایک نظر‘ تصنیف کی تو مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے اس کا عربی ترجمہ کیا جو ’**التفسیر الحقیقی للاسلام**‘ کے نام سے مکتبہ المنہل جدہ سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔(۶)

۷۰ اور ۸۰ء کی دہائی میں جماعت اسلامی ہند کے پندرہ روزہ عربی ترجمان ’’الدعوۃ‘‘ میں بھی مولانا کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔(۷)

مولانا کے مزاج میں انتہائی نرمی اور سادگی تھی ۔ وہ انتہائی خلیق وشفیق نیز تواضع اور انکساری کے پیکر تھے۔ نام ونمود اور شہرت ونمائش سے دور بھاگتے تھے۔ جامعہ کی مسجد میں جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع میں وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انہیں اپنا کام خود کرنا پسند تھا۔ پانی کے لیے لوٹا لے کر اپنے کمرے سے کچھ فاصلے پر واقع ہینڈ پمپ کی طرف جاتے تو طلبہ لپکتے' مگر وہ منع کرتے تھے۔ چائے کے شوقین تھے، کمرے میں آرام کرسی پر دراز ہوکر اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے نظر آیا کرتے ۔ نمازعصر کے بعد ہاتھوں میں ناشتہ دان ، بیگ اور چھڑی لے کر پیدل ہی اپنے گاؤں علاؤ الدین پٹی جاتے ہوئے اکثر نظر آتے تھے ۔ عالمیت کے آخری سالوں میں ہنگائی پور تک مولانا کے ساتھ راستہ طے کرنے کا متعدد بار شرف حاصل ہوا ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی غالباً ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی ہند کے رکن بن گئے تھے اور تا دم آخر جماعت سے وابستہ رہے، مگر دوران طالب علمی وہ طلبہ کی اسلامی تحریک یا تنظیم میں شرکت اوراس میں سرگرمی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۸۰ کی دہائی میں جامعۃ الفلاح میں سرگرم کل ہند طلبہ تحریک ایس آئی ایم کے وابستگان وذمہ داران کے ساتھ ان کے مراسم خوشگوار نہیں تھے۔

اکتوبر ۱۹۸۴ء میں رام لیلا میدان دہلی میں منعقد ہونے والی ملک گیر اسلامی طلبہ تحریک ایس آئی ایم آف انڈیا کی تیسری کل ہند کانفرنس میں جامعۃ الفلاح کے طلبہ کی شرکت کو وہ محدود رکھنا چاہتے تھے، مگر طلبہ کی بڑی تعداد اجازت کے بغیر کانفرنس میں شریک ہوئی۔ اس کا افتتاح سابق ناظم جامعہ اور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ نے کیا تھا۔ کانفرنس سے واپسی کے بعد صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے اجازت کے بغیر دہلی جانے والے طلبہ کو اپنے سرپرستوں کے ساتھ آنے کا حکم دیا جسے طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد نے عملاً تسلیم نہیں کیا۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہوکر مولانا نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس دوران مولانا ابوبکر اصلاحیؒ تقریباً ٦ ماہ جامعہ کے صدر رہے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے ۵ر مئی ۱۹۸۵ء کو جامعہ کی مجلس انتظامیہ کے فیصلہ کے مطابق دوبارہ صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ اسی زمانے میں مئی ۱۹۸۵ء میں فلاح پر ایس آئی ایم کی سرگرمیوں پر مکمل پابندی عائد کردی گئی تھی جو عملاً ۱۹۸۸ء تک باقی رہی۔ عاملہ کی نشست میں مولانا عیسیٰ صاحب مرحوم ومغفور نے اور انتظامیہ (موجودہ شوریٰ) میں ڈاکٹر محمد رفعت صاحب نے اس پابندی کی مخالفت کی تھی۔

حواشی وتعلیقات

۱- مولانا نظام الدین اصلاحی (جامعۃ الفلاح کے سابق استاذ اور صدر مدرس) کے مطابق ''عبدالحسیب اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح پر ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۰ء تک طالب علم رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد علی گڑھ میں جماعت اسلامی کی ایک درس گاہ میں ایک سال تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد دوبارہ بحیثیت استاذ اصلاح پر تشریف لائے تھے جہاں وہ ۱۹۶۱ء تک رہے۔

۲- ڈاکٹر نورالدین اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں درجہ سوم سے فضیلت تک طالب علم رہے۔ ۱۹۶۰ء میں اصلاح سے فراغت کے بعد یونانی میڈیکل کالج الٰہ آباد سے ۱۹۶۷ء میں F.M.B.S کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت ہلدوانی ضلع نینی تال میں مقیم ہیں۔ ان سے رابطہ کا نمبر 9359526811 ہے۔

۳- فیض الرحمان صاحب (مقیم حال، ہلدوانی، ضلع نینی تال) جامعۃ الفلاح میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک عربی سوم اور چہارم میں طالب علم رہے ہیں۔ فلاح سے قبل انہوں نے مرکزی درسگاہ اسلامی رامپور میں درجہ دہم تک اور اس کے بعد چتر پور ضلع ہزاری باغ میں واقع جامعہ کاشف العلوم میں مولانا جلیل احسن ندوی (۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء-۸ر جولائی ۱۹۸۱ء) مولانا شہباز ہندی (۱۹۲۷ء-۹ر نومبر ۲۰۰۲ء)، ان کے برادرخورد مولوی محمود عالم اصلاحی (وفات ۷ر مارچ ۲۰۱۲ء) اور مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحبان سے بھی ایک سال کسب فیض کیا ہے۔ ان سے رابطہ کے لیے 9412129117 پر فون کیا جاسکتا ہے۔

۴- ڈاکٹر شمس الدین اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح سے ۱۹۵۶ء میں فضیلت کی تھی۔ اصلاح کے سابق ناظم مرزا اشفاق بیگ (وفات ۲۸ر اکتوبر ۲۰۱۹ء) اور ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی علیگ (وفات ۱۸ر ستمبر ۲۰۱۹ء) ان کے ہم سبق رفقاء میں سے تھے۔ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۱ء میں 'بی یو ایم ایس' کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد محمد آباد گوہنہ ضلع مؤ میں مستقل مطب قائم رکھا۔ ادبی ذوق رکھتے تھے، زمانۂ طالب علمی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ۲ر مارچ ۱۹۹۳ء کو دہلی میں وفات پائی۔

۵- حافظ بدرالدین فلاحی ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۶ء تک جامعۃ الفلاح میں طالب علم رہے۔ اس سے قبل جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، مدرسہ فرقانیہ چوک لکھنؤ اور مدرسہ تجوید الفرقان پاٹا نالہ لکھنؤ سے حفظ قرآن مکمل کیا اور مرکزی درسگاہ اسلامی رامپور میں درجہ ہفتم تک تعلیم حاصل کی ہے۔ بعد ازاں زراعت وکاشت کاری کے آبائی پیشے سے متعلق ہوگئے۔ ہلدوانی، ضلع نینی تال میں مقیم ہیں۔ ان سے رابطہ کا نمبر : 9012120911 ہے۔

۶- مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی علمی، تصنیفی اور ترجمہ سے متعلق خدمات کے بابت مندرجہ معلومات عبدالرحمان خالد فلاحی صاحب (لائبریرین جامعۃ الفلاح) نے فراہم کی ہیں۔

۷- متعدد تحقیقی مقالات کے مطابق مولانا محمد یوسف صاحب کے دور امارت میں ایمرجنسی سے قبل اپریل ۱۹۷۵ء میں جماعت اسلامی ہند کا عربی ترجمان پندرہ روزہ 'الدعوۃ' دہلی سے جاری کیا گیا تھا۔ مولانا سلمان ندوی اس

کے مدیر تھے جب کہ ابوالمکارم فلاحی، شبیر احمد فلاحی، عبدالحلیم فلاحی، ارشد اصلاحی اور مسیح الزماں فلاحی صاحبان خصوصی طور پر ان کی معاونت کرتے رہے ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران جون ۱۹۷۵ء تا مارچ ۱۹۷۷ء اس کی اشاعت بند رہی۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۹ء کو مولانا سلمان ندوی کی وفات کے بعد ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو اس کا آخری شمارہ منظر عام پر آیا، پھر بادل ناخواستہ اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ الدعوۃ کی دوبارہ اشاعت اپریل رمئی ۱۹۹۶ء کے پارلیمانی انتخابات سے قبل فروری ۱۹۹۶ء میں ذرا مختلف شکل میں مولانا جلال الدین عمری کی ادارت میں دہلی سے ماہانہ شروع کی گئی جو تقریباً ۲ سال جاری رہی۔ مولانا عبدالحق فلاحی صاحب ماہ نامہ الدعوۃ کی مجلس ادارت کے رکن اور مولانا عمری کے خصوصی معاون تھے۔

(الدعوۃ سے متعلق مندرجہ بالا معلومات ڈاکٹر ایوب تاج الدین ندوی استاذ شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تصنیف'' **الصحافة العربية فی الهند نشأتها وتطورها**'' اور سعید الاعظمی ندوی کی کتاب ''**الصحافة العربية نشأتها وتطورها**'' کے علاوہ مولانا عبدالحق فلاحی، سابق منیجر دعوت جناب خلیل احمد، انتظار نعیم، ابوالمکارم فلاحی، پرواز رحمانی، حافظ احسان الحق فلاحی اور عبدالرحمان خالد فلاحی صاحبان سے بذریعہ فون حاصل کی گئی اطلاعات پر مشتمل ہے۔)

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً إِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْم

(المومنون: ۵۱)

'اے پیغمبر! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ یقیناً میں تمہارے اعمال سے خوب واقف ہوں۔'

گوشۂ عبدالحسیب سے وابستہ چند یادیں☆

ابن العلم فلاحی

زندگی کا ایک اچھا خاصہ حصہ طالب علمی میں گزرا اور اس دوران دنیا میں بہت سارے بڑے لوگوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا لیکن مولوی عبدالحسیب اصلاحیؒ جیسا انسان نہیں ملا۔ ان کا درس تلمذ اختیار کر کے ایک عجیب ہی مزا ملا، جو شاید قرطاس پر کما حقہ بیان نہ کر سکوں لیکن زندگی بھر دماغ پر نقش رہے گا۔

میں ایک کالج کا طالب علم تھا اور کالج ہی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میری والدہ بیمار رہتی تھی اور میں ڈاکٹر بن کر اپنی والدہ اور دنیا کے غریب انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شاید قسمت میں نہ والدہ تھیں اور نہ ہی ڈاکٹر بننا تھا۔ اس لیے دونوں کام بھی نہیں کر سکا۔ بہر کیف میرے والد نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ان کی بڑی خواہش تھی کی میں مولوی بن جاؤں۔ وہ اپنی خواہش میں بہت ہی زیادہ متشدد تھے۔ اور میں بھی بہت بضد تھا کہ مجھے مولوی نہیں بننا ہے۔

اس کی بہت ساری وجوہات تھیں لیکن اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی ہمارے پڑوسی بہت زیادہ ظالم تھے۔ وہ ایک عالم تھے، بہت اچھی تقریر کرتے تھے اور ایک تحریک سے بھی وابستہ تھے لیکن اپنی بیوی اور بچوں کو بہت گالی دیتے تھے اور بیوی کو بہت مارتے تھے۔ ان کی بیوی بھی کافی بدزبان تھیں۔ مولوی حضرات کی یہ حرکت دیکھ میں مولویت سے کافی بدظن ہو گیا تھا۔ بہر کیف زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر ہزاروں کلومیٹر دور ایک شہر چلا گیا اور وہاں پر جا کر ملازمت اختیار کر لی۔ یہ غالباً ۱۹۹۱ کا واقعہ ہے۔ وہاں پر میری ملاقات تبلیغی جماعت کے ایک شخص سے ہوئی اور ان کی بے پناہ ہمدردی نے مجھے مدرسے میں پڑھنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

☆ گوشہ عبدالحسیب سے مراد مولانا کا چھوٹا سا کمرہ تھا جو مودودی ہاسٹل کے ریڈنگ روم میں واقع تھا۔ یہ اس مضمون کا ایک چھوٹا سا کردار ہے۔ اگرچہ یہ مرکزی عنوان نہیں ہے لیکن دوران طالب علمی یہ کمرہ راقم الحروف کے توجہ کا مرکز تھا۔ اسی مناسبت سے راقم الحروف نے اس کو مضمون کا عنوان بنا دیا۔ یہ مضمون ایک طالب علم اور استاذ کے درمیان محبت کا مظہر ہے۔ یہ مضمون ایک کتاب روشنی کا سفر سے ماخوذ ہے۔

پھر میں نے اپنا رختہ سفر باندھا اور اپنے گھر چلا گیا۔اور سوچا کہ لاؤ یہ حلوا پوڑی والا علم حاصل کر لیتا ہوں۔دیکھتا ہوں کیا حقیقت ہے۔اگر صحیح نہیں لگا تو چھوڑ دوں گا۔کئی اداروں میں گیا لیکن ایڈمیشن نہیں مل سکا۔بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں اردو زبان سے واقف نہیں تھا۔پھر ایک ادارے میں گیا تو انہوں نے عارضی طور سے داخلہ دیا اور کچھ انتظام کیا کہ میں اردو زبان سیکھ سکوں۔بہر کیف کچھ مہینے میں اردو سیکھ لیا، پھر انہوں نے مجھے تھوڑا بہت نحو اور صرف بھی پڑھایا جو عربی گرامر کے بنیادی علم میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد میں ہندوستان کے ایک مشہور ادارہ جامعۃ الفلاح میں گیا،ٹیسٹ ہوا اور عربی سال سوم میں داخلہ مل گیا۔ویسے مجھے عربی پڑھنا تھا لیکن ٹیسٹ میں بہت زیادہ انگریزی پر زور دیا جار ہا تھا۔اپنے عمر کے حساب سے میں بہتر انگریزی جانتا تھا۔مجھے عربی کی فکر زیادہ لاحق تھی۔ممتحن صاحب نے مجھے انگریزی میں ایک پیراگراف لکھنے کے لیے کہا۔تھوڑا پریشان تھا۔اتفاق سے ایک لفظ کے املا میں غلطی ہوگئی اور کہنے لگے کہ آپ سوم کلاس میں نہیں چل سکتے۔آپ کا داخلہ دوم میں ہوسکتا ہے۔میں پریشان تھا کہ میں تو عربی پڑھنے آیا ہوں یہاں انگریزی کا ٹسٹ لے رہے ہیں۔اس کے بعد ہم ایک بزرگ ہستی مولانا سلامت اللہ صاحب کے پاس گئے اور انہوں نے عربی درجہ سوم میں داخلہ کی منظوری دے دیا۔

پھر پتہ چلا کہ جو حضرت مجھے عربی سوم کے لیے نااہل سمجھ رہے تھے وہ اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کو ایک کلاس اوپر داخلہ دلانا چاہ رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے ایک پلان کیا تھا۔آپ نے اس طالب علم کو عربی سوم کے لیے درخواست دلوائی پھر اس طالب علم کو ایک کلاس نیچے گرا کر عربی دوم میں داخلہ کی منظوری دے دی۔حالاں کہ وہ حضرت عربی اول کے لیے بھی مناسب نہیں تھے۔اس واقع کو دیکھ کر پھر دل میں ایک بے چینی پیدا ہوگئی اور ممتحن صاحب کے اقربا پروری پر بڑی حیرت ہوئی۔پھر دل کو سمجھایا کہ ان کی بات پر توجہ نہیں دینا چاہیے۔انسان ہے، غلطی ہوگئی ہوگی۔ایک عرصے کے بعد میں جب اس ادارے فارغ ہوگیا تھا تو ایک مرتبہ کچھ کام کے لیے دہلی جانا ہوا۔پتہ چلا کہ موصوف ممتحن ایک یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے۔تین مرتبہ ان کے مقالے کو مسترد کیا گیا تھا۔سن کر بہت پریشان ہوگیا۔اللہ سے معافی مانگی کہ اس طرح کی مصیبت سے بچائے۔مجھ کو ان کی زندگی سے بہت بڑا سبق ملا۔اب تک میں ہزاروں طلبہ کو پڑھایا اور ان کا امتحان لیا لیکن کسی کو بھی فیل نہیں کیا، الا یہ کہ اس طالب علم نے کاپی میں کچھ بھی نہ لکھا ہو۔میں ہمیشہ ایک دو سوال ایسے بناتا جس سے ہر معمولی محنت کرنے والا طالب علم پاس ہوجاتا ہے۔بہت سارے لوگ اس پر تنقید بھی کرتے

لیکن میں پرواہ نہیں کرتا ہوں۔ میں یہ کام اللہ کو حاضر جان کر کرتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ اس خطا کار کا معاملہ آسان کردے۔

بہر کیف ایک سال کا عرصہ جامعۃ الفلاح میں ختم ہوگیا۔میں عربی سوم سے عربی چہارم میں پہنچ گیا۔عربی چہارم میں میری ملاقات ایک بہت بزرگ استاذ سے ہوئی۔اور مجھے اس کا بہت جلد احساس ہوگیا۔ کیونکہ میری عمر دوسرے طلبہ کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ تھی اور دنیا کے تھپیڑوں نے بہت کچھ سکھادیا تھا۔انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔حالانکہ میں نے ان کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ عام طلبہ کی طرح سلوک نہیں کروں گا۔آپ بس خاموشی سے میرا درس سنتے رہیے اور ایک معریٰ قرآن رکھیے اور اس میں جو ضروری باتیں ہیں اختصار کے ساتھ لکھ لیجیے۔ میں نے استاذ کو بتایا کہ مجھے اردو کی زیادہ معلومات نہیں ہے۔ بہت زیادہ عربی ترکیب سے بھی واقف نہیں ہوں۔آپ نے تسلی دی اور کہا کہ رفتہ رفتہ سب سیکھ جاؤ گے۔مزید مشورہ دیا کہ میں کسی عربی جاننے والے اپنے سے اونچے درجے کے کسی طالب علم سے دوستی کرلوں لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ایک طالب علم سے دوستی کیا تو وہ اگلے سال ہی فارغ ہوگئے۔البتہ اسی مشورے کے چکر میں دو انگریزی کے استاد سے میری دوستی ہوگئی۔ان دونوں اساتذہ سے بے پناہ انگریزی سیکھی اور بلریا گنج میں گھوم گھوم کر ٹیوشن پڑھایا۔الحمدللہ خوب بسکٹ اور چائے پی۔بلریا گنج کے لوگ اساتذہ کی کافی عزت کرتے تھے۔سلامتی ہو عبدالحسیب اصلاحی پر جس کے مشورے نے اس فقیر طالب علم کو مال دار کردیا۔ مجھے الحمداللہ انگریزی سمجھنے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی۔جب میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تھا وہاں بھی کچھ طلبہ نے حیرت سے پوچھا کہ آپ کو انگریزی لیکچر سمجھ میں آتا ہے۔ میں ان کو جب ہاں کہتا تو وہ تعجب میں پڑ جاتے تھے۔وہ کہتے تھے کہ آپ تو مدرسے سے آئے ہوئے ہیں۔مدرسہ میں کہاں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ مدرسے سے پہلے بھی کچھ تعلیم ہوتی ہے۔اس تعلیم کو میں نے انگریزی میں ہی پڑھا تھا۔بقیہ جو کمی باقی رہ گئی تھی میرے مدرسے کے استاد نے پوری کردی۔ مجھے زبان کے سلسلے میں دنیا میں کہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔اس نعمت پر میں اپنے استاد عبدالحسیب صاحب کا احسان نہیں بھلاسکتا۔اگر وہ مجھے دوستی پر نہ ابھارتے تو شاید میں انگریزی زبان نہ سیکھ پاتا۔

بہر کیف ایسا ہی ہوا۔جب میں نے اپنا خارجی مطالعہ شروع کیا اور سیروا فی الارض کا معاملہ ہوا تو بہت ساری چیزیں واضح ہوگئیں۔ جو شاید ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنے کے بعد بھی حاصل نہیں

ہو پاتی۔ میں دنیا میں بہت سارے اساتذہ سے ملا لیکن مجھے مولانا عبدالحسیب رحمتہ اللہ علیہ جیسا کوئی سادہ لوح استاذ نہیں ملا۔ میں طالب علمی کے دور سے ایک شخصیت کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اس لیے جب بھی کوئی علمی اور روحانی شخصیت سے ملاقات ہوتی بہت جلد ہی اس کے اندرونی زندگی کو ٹٹولنے میں لگ جاتا تھا کہ شاید کچھ قیمتی اثاثہ مل جائے لیکن جتنا ہی زیادہ اندر جاتا مایوسی ہاتھ لگتی تھی۔ لیکن مولانا عبدالحسیب صاحب کی اندرونی زندگی انکے ظاہری زندگی سے بھی بہتر تھی۔ دوران درس ہم کبھی مولانا کی تعریف کر دیتے تو آپ آب دیدہ ہوجاتے تھے اور کہتے بچہ بچہ میں تمہارا خادم عبدالحسیب بہت معمولی انسان ہوں۔ دعا کرو کہ اس کو بھی جنت میں ایک کونا مل جائے تو کافی ہوجائے گا۔

ایک دفعہ کہیں مضمون نویسی کا کوئی مقابلہ تھا، میں بھی ایک مقالہ لکھ رہا تھا۔ ایک دن مسودہ لے کر ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریڈنگ روم سے متصل مولانا کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دروازے پر بہت ہی خوبصورت خوشخط میں ان کا نام لکھا ہوتھا' گوشہ عبدالحسیب'، جسے ہم انگریزی میں نیم پلیٹ کہتے ہیں تا کہ تلاش کرنے والے کو آسانی سے ان کا کمرہ مل جائے۔ اتنا عاجزی سے بھرا ہوا نیم پلیٹ اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس نیم پلیٹ کا بہت شدت سے احساس اس وقت ہوا جب مجھے ہندوستان کے ایک مذہبی رہنما کا ایک مختصر پاور پوائنٹ پرزینٹیشن دیکھنے کو ملا، جس کے ہر ہر سلائڈ پر ایل کے جی سے لے کر پی ٹیک تک ڈگریاں لکھی ہوئی تھیں۔ اس تقریر سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پروگرام ان کی ڈگریوں کے نمایش کے بارے میں ہے اور دنیا اور آخرت کی ساری کامیابی ان ڈگریوں کے حصول میں مضمر ہیں۔ ویسے تقریبا دو درجن ڈگریاں تو میرے پاس بھی ہیں، لیکن مولانا کی اس نیم پلیٹ نے میرے حوصلے کو توڑ دیا۔ اور شاید میں زندگی بھر اپنے وزیٹنگ کارڈ پر اپنی ڈگریاں نہ لکھ سکوں۔ روزگار کے اس دور میں سی وی بنانا اور اس میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی لیاقت کو ظاہر کرنا ایک فطری عمل بن گیا۔ تا کہ نوکری دینے والے کو آسانی سے متاثر کیا جا سکے۔ لیکن اس غرض سے بھی کبھی دل میں یہ خیال آیا کہ لاؤ میں بھی کچھ ڈگریاں لکھوں تا کہ میں بھی کچھ لوگوں کی نظر میں نمایاں ہوجاؤں لیکن جب ایک مرتبہ ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو مولانا کے اس نیم پلیٹ نے ضمیر کو ایسا کچوکا لگایا جو نا قابل بیان ہے۔ بہر کیف! ایک بہترین معلم وہی ہے جو اپنے اعمال سے اپنے طلبہ کو اس کا سبق یاد دلا دئے۔ ورنہ بے جان کتابوں کے ورق پلٹنے سے بہت ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں لیکن بہت جلد ذہن سے اوجھل ہوجاتی ہیں اور اس کے برخلاف انسانی اعمال اور نیکیاں لوگوں کے ذہنوں میں ایک تصویر بنا لیتی ہیں اور اس کے نقش جلدی

مٹتے نہیں ہیں۔اسی لیے شاید اللہ نے قرآن کو رفتہ رفتہ نازل کیا اور محمد ﷺ اس پر عمل پیرا ہو کر صحابہ کے سامنے قرآن کا عملی نمونہ پیش کیا تا کہ قرآن کی ساری تعلیمات لوگوں کے دلوں میں نقش ہو جائے۔

مولانا ریڈنگ روم میں داخل ہوئے تو مجھے دیکھ لیا اور سوال کر بیٹھے اور ہمت افزائی کرنے لگے اور ایسے تعجب سے کچھ چیزیں پوچھنے لگے جیسے ان کو کچھ معلوم نہ ہو۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے تا کہ طالب علم کی ہمت افزائی ہو سکے۔مولانا بہت ہی نفیس اردو بولتے تھے۔ایک دفعہ کسی بچے کو دیکھا وہ مسجد کے حوض میں پانی سے کھیل رہا تھا۔مولانا نے دیکھتے ہوئے اس بچے سے فرمایا: اے صبی تاب نشیں ہو جائے گا۔آپ کی زبان سے بلا شاختہ اردو کے ایسے الفاظ نکل آتے تھے کہ سننے والے عش عش کرنے لگتے تھے۔آپ جب بھی لکھتے تھے بہت سوچ سمجھ کر لکھتے تھے۔ایک مرتبہ لکھی ہوئی تحریر کو کبھی کاٹتے اور مٹاتے نہیں تھے۔ چائے کی شوقین بھی تھے۔ چائے خود سے بنا کر پیتے تھے اور کوئی مہمان آ جائے تو اس کو بھی چائے پلاتے تھے۔کبھی کبھی کسی خاص طالب علم سے پانی وغیرہ مانگ لیا کرتے تھے۔میرے زمانے یہ شرف فیصل شبیبی کو حاصل تھا، جو صالح شبیبی کے فرزند ہیں اور اس وقت العرفان اسکول اورنگ آباد میں تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ہیں۔ میں بھی مولانا کے کمرے میں جاتا تھا۔لیکن میں زیادہ تر کچھ پوچھنے یا کوئی مضمون وغیرہ تصحیح کرانے کے لیے جاتا تھا۔

آپ انسانی نفسیات کا بھی کافی خیال کرتے تھے۔ جامعہ میں الہدیٰ نامی ایک عربی پرچہ آتا تھا۔اس میگزین میں بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں ہوتی تھیں۔زبان آسان تھی،اس لیے مجھے بھی پڑھنے میں مزا آتا تھا،لیکن ایک کاپی ہونے کی وجہ سے پڑھنے کو نہیں ملتا تھا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی اس کو پڑھتا رہتا تھا۔ایک دن خیال آیا کہ کیوں نہ اس میگزین کو ادارے سے رابطہ کر کے حاصل کرلوں۔ میں نے ایڈیٹر کے نام خط لکھا۔عربی میں خط کیسے لکھا جاتا تھا بہت زیادہ علم نہیں تھا۔لائبریری میں ایک کتاب تھی اس کی مدد سے ایک چھوٹا سے خط تیار کیا۔خط کا نصف پیراگراف بڑے بڑے القاب سے ہی بھر گیا۔مثلاً،فضیلۃ الشیخ،حفظہ اللہ، دامت برکاتھم بحر العلوم وغیرہ وغیرہ۔میں نے یہ القاب کتاب سے تلاش کر کے لکھا تھا کہ ایڈیٹر خوش ہو کر یہ میگزین میرے نام سے جاری کر دے۔خط لے کر مولانا کے پاس گیا تا کہ ان کو دکھا کر تصحیح کرالوں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ عربی میں خط لکھا تھا۔مولانا نے خط کو دیکھا تو میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ایسا لگا کہ کوئی بڑی غلطی ہوگئی ہے لیکن پھر تھوڑی دیر بعد مولانا مسکرائے اور کہا کہ ابن علم! خط کو اپنے عمر کے حساب سے لکھا کرو۔تحریر کی بھی اپنی عمر ہوتی ہے۔پھر مولانا نے بہت سادی عربی میں چار یا پانچ جملہ لکھا اور میں نے اسی کو ملفوف کر کے ایران بھیج دیا۔اس کے تین

مہینہ بعد وہ رسالہ میرے نام سے جاری ہو گیا۔ تقریباً پانچ چھ سال تک وہ میرے نام سے جاری رہا۔ اسی طرح سے چھوٹے موٹے مضمون اردو میں لکھتا تھا تو مولانا سے اصلاح کروالیتا تھا۔ الحمدللہ وہ بعض اخبارات میں چھپ بھی جاتا تھا۔ ان مضامین کی کٹنگ کر کے فائل میں محفوظ کر رکھا تھا۔ مسلم یونی ورسٹی میں جب بھی اشکالرشپ وغیرہ کے لیے درخواست دیتا تو اسے لگا دیتا تھا۔ اس سے اشکالرشپ کی شکل میں کچھ پیسہ وغیرہ مل جاتا تھا۔

والدہ بیمار رہتی تھیں۔ اس لیے والد صاحب کا سارا پیسہ علاج و معالجہ میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اس لیے زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے اشکالرشپ کی رقم سے کافی فائدہ ہو جاتا۔ مولانا عبدالحسیب صاحبؒ کی نصیحت تھی کی ہمیشہ اپنے سے بڑے لوگوں اور علم والے لوگوں کے ساتھ بیٹھا کرو۔ میں ہمیشہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اس نتیجے میں یونی ورسٹی میں بڑے بڑے اساتذہ سے پہچان ہوگئی۔ اور لوگ مغالطے میں وقت سے پہلے پروفیسر سمجھنے لگے۔

مولانا کو عربی ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا لیکن کبھی بھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ آپ نے رسالہ دینیات کا عربی ترجمہ بھی کیا تھا جو کئی ممالک کے اسکولوں میں زیر نصاب تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی عادت تھی کہ میں یہ بھی پتہ لگانے کی کوشش کرتا تھا کہ اساتذہ کس کتاب سے استفادہ کرتے ہیں اور پڑھانے کے لیے کہاں کہاں سے مواد اکٹھا کرتے ہیں تاکہ میں بھی انہی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکوں اور زیادہ سے زیادہ علم و معرفت حاصل کر سکوں۔ لغت دیکھنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ میں نے بعض اساتذہ کو بہت کثرت سے لغات کا استعمال کرتے دیکھا تھا۔ میں بھی بہت کثرت سے لغت دیکھتا تھا

لیکن میں نے مولانا کو بہت کم ہی لغت تلاش کرتے ہوئے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ انہوں نے کسی لفظ کو دیکھ لیا تو وہ انہیں یاد ہو جایا کرتا تھا۔ اللہ نے ان کو بہت قوی حافظہ عنایت فرمایا تھا۔ آپ بہت ہی مختصر مگر بہت ہی جامع بولتے تھے اور اسی طرح سے جامع اور مختصر لکھتے بھی تھے۔ کبھی کبھی کلاس میں درس متعینہ وقت سے دو چار منٹ پہلے ختم ہو جاتا تو مولانا خاموشی سے بیٹھے رہتے تھے۔ اور کلاس کی گھنٹی بجنے کے بعد ہی کلاس سے باہر جاتے تھے۔ غیر ضروری بات ہرگز نہیں کرتے تھے۔

مولانا کے پاس ایک مصحف تھا جو اے فور سایز سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ یہ مصحف کو مولانا کو کسی طالب علم نے تحفتاً دیا تھا۔ اس مصحف میں اللہ کا نام سرخ حروف میں لکھا ہوتا تھا۔ مولانا نے قرآن کے اوراق کے درمیان

سادہ کاغذ چسپاں کر کے رکھے تھے۔اسی کاغذ کے ٹکڑے پر ضروری چیزیں لکھ لیا کرتے تھے۔مولانا کبھی بھی کلاس میں کوئی تفسیر لے کر داخل نہیں ہوتے تھے۔اپنے معریٰ قرآن سے پڑھاتے تھے۔اپنے استاذ کی کافی عزت کرتے تھے۔ان کا نام بہت ہی ادب واحترام سے لیتے تھے۔کبھی کبھی دوران درس مولانا امین احسنؒ اور اختر احسنؒ کا کا ذکر کیا کرتے تھے۔مولانا کو کبھی بھی طیش میں آ کر کسی بھی مفسر کو لعن وطعن کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔لیکن بعض ہمعصر اساتذہ کبھی کسی سابقہ مفسر کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کرتے تو کہتے تھے مودودی صاحب سے یہاں چوک ہوگئی یا مودودی صاحب ڈنڈی مار گئے،لیکن مولانا جب کبھی کسی مفسر کا تذکرہ کرتے تو اس مفسر کا پورا نام لیتے تھے اور بہت وادب احترام سے ان کا ذکر کرتے تھے اور کبھی کبھی مختصراً صاحب تدبر فرماتے تھے یا صاحب تفہیم فرماتے تھے۔اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔مولانا دوران درس کسی طالب علم کو شرمندہ نہیں کیا۔اگر طلبہ کا مطالعہ نہیں ہوتا تو بھی خود سے معنی بتا کر وضاحت کر دیتے تھے۔لیکن تاکید کرتے تھے کہ مطالعہ کر کے آئیں۔کہتے تھے کہ مطالعہ کرنے سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور انسان کو خود سے بہت ساری چیزیں سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔مولانا ہمیشہ عربی لغات دیکھنے کا مشورہ دیتے تھے۔بعض مرتبہ میں مولانا سے شکایت کرتا تھا کہ عربی لغت سے بہت سارے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔آپ کہتے تھے اگر نہیں سمجھ میں آئیں پھر بھی دیکھا کرو۔ان شاء اللہ ایک دن سمجھ میں آنے لگے گا۔آج ان کے مشورے کی برکت بہت ساری عربی کتابیں بھی پڑھ لیتا ہوں۔کبھی کبھی عرب ممالک میں دوران تدریس کچھ فصیح عربی بول کر بہت سارے عربی طلبہ کو قریب کر لیتا تھا اور طلبا کی خفیہ سرگرمیوں کو بھی جلدی سے پتہ لگا لیتا تھا۔

مولانا کو کبھی بھی کسی طالب علم کو ڈانٹتے ہوئے نہیں پایا۔بچوں سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔مولانا عربی ادب بھی پڑھاتے تھے۔عربی اشعار کا بامحاورہ ترجمہ کرتے تھے اور ایسے مسجع اور مقفع جملہ بولتے تھے کہ کان مزید اس طرح کے جملے سننے کی خواہش کرتا۔اگر کوئی قرآنی لفظ شعر میں ملتا تو اس کا مکمل تحلیل صرفی کر دیا کرتے تھے۔جن اشعار میں عاشقی اپنے حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی تھی اس شعر کی تشریح نہیں کرتے تھے۔الفاظ کے معنی بتا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ لغت سے پڑھ لینا۔کہتے تھے کہ امرؤالقیس پگلا گیا ہے۔بچہ! بچہ!۔چھوڑو آگے چلو۔یہ تھا مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا ظرف۔استاذ کا بڑا اعلیٰ ظرف تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں بیمار ہو گیا تھا،سارے اساتذہ عیادت کے لیے آئے لیکن مولانا شاید کہیں باہر گیے ہوے تھے۔میں نے ایک طالب علم سے مولانا کے بارے میں پوچھ لیا۔شاید اس طالب علم نے مولانا کو

بتا دیا یا مولانا کو میں خود کلاس میں نہیں ملا تو ایک دن خود ہی صبح میری عیادت کے لیے آ گئے اور کہنے لگے ابن العلم مجھے معاف کرنا مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ بیمار ہو۔مولانا نے بہت ساری دعائیں دیں۔مولانا بہت ہی نیک طبیعت کے مالک تھے۔دنیا میں بہت ساری شخصیتوں سے ملنے کا موقع لیکن آپ کی شخصیت بالکل یکتائے روزگار تھی۔گزشتہ پینتیس سالوں میں تقریبا سو کے قریب اساتذہ سے میں نے تحصیل علم کیا ہوگا، لیکن مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ جیسا منکسر المزاج انسان نہیں دیکھا۔اس دور میں آپ جیسا انسان ملنا بہت ہی مشکل ہے۔

مولانا کو لیڈر شپ اور چمک دمک سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور نہ ہی ان کو شہرت کی کوئی خواہش تھی۔ البتہ انتظامی امور بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔اس کا اندازہ جامعہ میں آپ کی انتظامی امور سے لگایا گیا ہے۔ایک دفعہ آپ پانی کے جہاز سے حج کے لیے گئے تو دوران سفر کچھ مسافروں نے آپ کو اپنا امیر بنانا چاہا، لیکن مولانا نے معذرت کر لی۔مولانا بہت نفاست پسند تھے۔آپ کے پاس دو کلر کی شیروانی تھی۔ آپ اسی کو تبدیل کر کے یکے بعد دیگرے پہن کر جامعہ آتے تھے۔

سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتے تھے۔اور جب بھی وہ صبح آتے آپ کی شیروانی آیرن کی ہوئی رہتی تھی۔مولانا ہمیشہ پیدل چلتے تھے۔بہت کم ہی بس استعمال کرتے تھے۔کوئی طالب علم یا آدمی آپ کو اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی دعوت دیتا تو اکثر عاجزی سے انکار کر دیتے تھے۔آپ ہمیشہ تندرست نظر آتے تھے۔دورانِ درس ہمارا یک ساتھی مولانا کے بائیں جانب بیٹھتے تھے۔انہیں لوگ پیار سے حاشیہ بردار کہتے تھے۔مولانا اکثر ان پیارے بھائی سے قرآن مجید پڑھنے کے لیے کہتے تھے۔میں استاذ کے سامنے بیٹھتا تھا۔میں جلدی جلدی مولانا کی باتوں کو لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔پوری گھنٹی ایسے گزر جاتی تھی۔وقت کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔کبھی طلبہ کو آپ کے درس میں بوریت نہیں محسوس ہوتی تھی۔کچھ طلبہ اساتذہ کے صفاتی نام رکھے ہوئے تھے۔مولانا کا بھی ایک نیک نیم تھا اور اسکے معنی نہایت شریف اور بھولا بھالا انسان کے ہوتے تھے۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ مولانا کے درجات کو بلند کرے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔آمین

کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا ابوالمکارم فلاحی زہری

یہ غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے، جب میں نے جامعۃ الفلاح میں عربی چہارم میں داخلہ لیا۔ اسی سال جامعہ میں چار عربی درجات سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا تھا، ہمارا کلاس آخری تھا جو ۱۹۶۷ء میں جامعہ کے پہلے بیج کے طور پر فارغ ہوا تھا، اس میں صرف تین طلبہ تھے اور اگلے سال تینوں کا داخلہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہوگیا تھا۔

جامعہ میں ہمارے نمایاں اساتذہ میں مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا شہباز اصلاحی، مولانا صغیر احسن اصلاحی اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی تھے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی عربی ادب، انشا و ترجمہ اور تفسیر وغیرہ میں نمایاں صلاحیت کے مالک تھے۔ طلبہ بھی ان سے کافی استفادہ کرتے تھے۔

مولانا عبدالحسیب صاحب جامعۃ الفلاح کی تعلیمی و تعمیری ہر قسم کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور طلبہ کو بھی جامعہ کے تعمیری کاموں میں حصہ لینے پر ابھارتے تھے۔

جب جامعہ کی جامع مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو مولانا خود اس میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے اور انھیں دیکھ کر طلبہ بھی کام میں لگ جاتے تھے۔

مولانا انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ بہت مہمان نواز تھے اور ہر ایک سے انتہائی خلوص و محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ میں جب ان کے کمرے میں جاتا تھا تو بہت عزت سے بٹھاتے تھے اور خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر اصرار کے ساتھ پلاتے تھے۔ کبھی گھر سے لایا ہوا ناشتہ بھی چائے کے ساتھ پیش کر دیتے تھے۔

مولانا کی شخصیت کو اگر ''جامع کمالات'' کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ آپ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جامعہ میں آپ مختلف مناصب پر فائز ہوئے۔ کبھی صدر مدرس، کبھی نگراں اعلیٰ دارالاقامہ، کبھی ممبر مجلس عاملہ، کبھی ممبر تعلیمی و تربیتی کمیٹی وغیرہ اور آخر میں مہتمم تعلیم و تربیت۔ آپ نے ہر شعبہ

میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور ہر موقع پر اپنے مناسب مشورہ سے جامعہ کو فائدہ پہنچایا۔ بورڈنگ ہاؤس اور مطبخ وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے میں بھی بروقت مناسب مشورے دیتے تھے۔

مولانا کے دروس قرآن، تذکیرات اور خطبات جمعہ وغیرہ میں اختصار اور جامعیت کا پہلو نمایاں رہتا تھا اور زبان میں ادبی رنگ، لہجے اور اندازِ بیان میں جاذبیت اور روانی پائی جاتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا اور اپنی تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں سے جامعہ اور اس کے طلبہ کو بہت ہی فائدہ پہنچایا، جو کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ آپ کی گرانقدر مخلصانہ اور بیش بہا خدمات کو قبول فرمائے اور آپ کو اجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین۔

●◻●

اِن اللّٰهَ طيّبٌ لا يقبل اِلا طيّباً، و اِنّ اللّٰهَ تعالىٰ أمر المؤمنين بما أمربه المرسلين ، فقال : يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً.

[جامع ترمذی ،کتاب التفسیر، سورة البقرة]

(بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ وہ پاک کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اسی چیز کا حکم فرمایا ہے جس کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ فرمایا: (اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی) اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔)

تمہارے بعد چمن لٹا لٹا سا ہے!

نصرت رضی فلاحی

ہر قدم پہ نسل نو کو سیکھ اک دیتی ہوئی
زندگی ہر موڑ پر کتنی کہانی لکھ گئی

آج کی اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں جہاں ہر کوئی کسی مقصد کے تحت اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ وہیں پر کچھ مخلص چہروں نے مفاد پرستی سے بہت دور فی سبیل اللہ خود کو وقف کر دیا اور آنے والی نسل کو صحیح معنوں میں زندگی جینے کا ہنر سکھایا۔ ان میں سے مولانا کا شمار بھی یقینی ہے۔

بچپن سے لے کر عمر کے آخری پڑاؤ تک ان کی زندگی سراپا ایثار و مثال رہی ہے:

بڑا مخلص تھا وہ اک شخص دل سے
بچھڑ جانے پہ اب ہم سوچتے ہیں

واقعی مولانا کی پوری زندگی فکر و اخلاص کا گہوارہ رہی ہے۔ آپ کا آبائی وطن اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی میں ہے۔ مولانا ایک دینی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ سو کتابوں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ آپ کے دادا (ابوعیسیٰ نور محمد) ایک شہرت یافتہ عالم دین تھے۔

آپ کے والد محترم گاؤں کی جامع مسجد میں لوگوں کو نماز کے طریقے نیز قرآن و ناظرہ کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے ہی گاؤں علاء الدین پٹی میں انھوں نے ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھولا تھا، جہاں پر گاؤں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم جامعہ ہی میں ہوئی۔ والد محترم کی خواہش کے پیش نظر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ نے مدرسۃ الاصلاح کا رُخ کیا۔

فراغت کے بعد کئی سال تک درس و تدریس کا فریضہ بھی یہیں انجام دیا۔ پھر وقت اور حالات کے

مطابق مختلف مقامات پر جس میں رامپور، علی گڑھ، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الرشاد قابل ذکر ہیں، جہاں پر مولانا نے اپنی صلاحیت سے لوگوں کو مستفید کیا۔ اسی اثنا میں آپ جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ جماعت اسلامی سے آپ کو گہری انسیت تھی۔ اور ۱۹۴۹ء میں باقاعدہ رکن جماعت بن گئے۔ اور پھر ایک دن بلریا گنج کے معروف ومقبول حکیم محمد ایوب صاحبؒ کے اصرار پر جامعہ کو اپنا علمی وادبی سرمایہ حیات مان کر اس کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

جامعہ کو لے کر کئی سنہری خواب بھی انھوں نے پورا کیا۔ جامعہ کی ایک اینٹ مولانا کے اخلاص کی گواہ ہے۔ اپنی زندگی کے چالیس سال انھوں نے جامعہ کو دیے وہ یہاں پر صدر مدرس رہے۔ مہتمم تعلیم وتربیت رہے اور کچھ خاص مضامین، جس سے انھیں بے پناہ رغبت تھی جیسے قرآن، تفسیر، ادب وغیرہ بچوں کو خود پڑھایا۔ ان کی رفتار وگفتار سے شفقت جھلکتی تھی وہ سراپا محبت تھے۔

میں کیا لکھوں کہ میرے پاس لفظ ہی نہیں ہیں
میں ان کو لکھتی ہوں اور حرف حرف روتے ہیں

اور ایک دن اس فرشتہ صفت انسان کے انتقال کی خبر آتی ہے اور دل درد کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا سا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی پر یقین ہونے لگتا ہے اور ہم ایک قدم اور ان کی بے مثال زندگی سے جڑے پہلو سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے حق میں سوائے دعائے خیر کرنے کے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ اور دین کے حق میں کی گئی ان کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

یادیں اتنی گہری کیوں ہیں؟

راحلہ بنت عبدالحکیم

جامعہ کو الوداع کہے کافی عرصہ بیت چکا ہے، لیکن کچھ باتیں کچھ یادیں کچھ لوگ اب بھی روزِ اول کی طرح ذہن ودل پر نقش ہیں۔ بس ذراسی آہٹ اور پوراماضی نظروں کے سامنے۔

یہ دن بھی عام دنوں کی طرح ہی تھا کہ کہیں سے مولانا عبدالحسیب اصلاحی کے انتقال کی خبر ملتی ہے اور اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی قیمتی اثاثے کو کھودینے کا دکھ، کوئی نہ پر ہونے والا خلا۔

حالاں کہ میں انہیں براہِ راست تو نہیں جانتی تھی۔ میرا ان کا تعلق صرف اتنا تھا کہ ان کا آبائی وطن علاؤالدین پٹی تھا اور میرا ہنگائی پور۔ وہ روزانہ جامعۃ الفلاح جانے کے لیے میرے گھر کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے۔ پرنور چہرہ، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں ٹفن ہوتا تھا۔ میں انہیں سلام کرتی اور غائبانہ طور پر روز ان کا انتظار کرتی۔

اللہ اور اس کے محبوب بندوں کو لے کر جو تصویر ایک بچے کے ذہن میں ابھرتی ہے، ان نیک بندوں میں مولانا کا پروقار چہرہ بھی ہوتا تھا۔ میرے لیے وہ ایسے انسان تھے جو اپنے آپ میں مکمل تھے۔ ان کا انداز، ان کا متانت بھرا لہجہ، ان کی رفتار وگفتار، ہر چیز اپنے آپ میں مکمل تھی۔

میں انہیں براہِ راست نہیں جانتی تھی، لیکن میرے بچپن نے جوان کو لے کر میرے اندر ایک انمٹ شبیہ بنائی تھی، یہ میرے لیے کافی اہمیت کی حامل تھی۔ چونکہ میرا اور ان کا روحانی رشتہ تھا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اچھے سے سمجھنے کے لیے مجھے اور زیادہ مطالعے کی ضرورت تھی۔

اس سلسلے میں میری اپی محترمہ نصرت فلاحی صاحبہ، جو کہ نسواں میں لائبریرین ہیں، انہوں نے میری بہت مدد کی۔ یقین جانیے جہاں میں ان کی زندگی سے جڑے حقائق کو جان کر حددرجہ متاثر ہوئی۔

ایک ایسا شخص جو ایک بچے کے ذہن میں ایک فرشتے کی طرح نمودار ہوتا ہے، اس کی اچھائیوں کی کوئی

یادیں اتنی گہری کیوں ہیں؟

قیمت کیوں نہیں ہوتی؟ کیا بھلائیاں ضائع ہونے کے لیے ہوتی ہیں؟ ان باعظمت لوگوں کو حقیقی مرتبہ کیوں نہیں ملتا؟ ان کی نیک صفت خصلت کو ہماری آنکھیں محسوس کرنے سے قاصر کیوں ہوتی ہیں؟ ایسے کتنے ہی سوال ہیں جس کے ادھیڑ بن میں من الجھا ہوا ہے۔

کچھ باتیں ہیں۔کسی کے چلے جانے کا دکھ ہے، کسی کے یادوں کی راہ دکھاتی ہوئی مدھم مدھم روشنی ہے اوران کے حق میں رب کائنات کے حضور دعائیں مانگتا ہوا ہمارا دل کہ خدا انہیں اپنے سائبان میں رکھے اور ان کی مغفرت کرے۔آمین

رشتہ تو انجانا سا ہے
یادیں اتنی گہری کیوں ہیں

●●

اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الاِحسَانَ عَلَی کُلِّ شَیءٍ، فَاِذَا قَتَلتُم فَاَحسِنُوا القِتلَۃَ، وَاِذَا ذَبَحتُم فَاَحسِنُوا الذَّبحَ، وَلیُحِدَّ اَحَدُکُم شَفرَتَہُ، وَلیُرِح ذَبِیحَتَہُ.

[صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الأمر باحسان الذبح]

(بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ احسان کو لازم قرار دیا ہے، لہٰذا جب قتل کروتو اچھے طریقے سے قتل کرواور جب ذبح کروتو اچھے طریقے سے ذبح کرو، چھری کو تیز کرلواور ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔)

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے معمولات زندگی

ابوسالم یحییٰ فلاحی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حرم میں دوپہر کا کھانے سے ابھی فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ گاؤں کے ایک ساتھی کا فون آیا۔ انھوں نے اطلاع دی کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اب نہیں رہے۔ یہ سننا تھا کہ دل کی دھڑکنیں اچانک جیسے رک گئی ہوں، یکا یک مولانا سے جڑے بہت سے حسین مناظر اور واقعات دل ودماغ میں سفر کرنے لگے۔ دل ہی دل میں علاؤالدین پٹی کے باشندوں پر رحم آنے لگا کہ اب اس جیسا انمول ہیرہ کہاں سے پائیں گے۔ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے علاؤالدین پٹی کی روح ہی جذب کر لی گئی ہو۔ امی جان نے اپنے تأثر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پورا گاؤں جیسے ویران ہو گیا ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی پیدائش دیارِ شبلی کی ایک زرخیز سرزمین علاؤالدین پٹی میں ۲۰ اگست ۱۹۲۸ کو ایک خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ مولانا کے آبا واجداد کوئی چار پانچ پشت پہلے کوئلا ڑی اور ابراہیم پور ہوتے ہوئے علاؤالدین پٹی میں مقیم ہوئے۔ ابتدا ہی سے تعلیم وتعلم سے وابستہ رہے۔ چنانچہ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور پھر بلریا گنج کے مکتب اسلامیہ میں ہوئی۔ بعدازاں ۱۹۳۶ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا رخ کیا۔ فراغت کے بعد چند ماہ درس وتدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد رام پور اور علی گڑھ ہوتے ہوئے اپنے استاد گرامی مولانا اختر احسن اصلاحی کی دعوت پر مادر علمی مدرسۃ الاصلاح واپس آ گئے اور تقریباً چھ سال تک درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ بعدازاں جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ میں رہے جو ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ ایک دن مولانا کے رفیق جناب حکیم محمد ایوب صاحب بلریا گنج کے چند احباب کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے اس غرض سے گئے کہ بلریا گنج کے مکتب میں مولانا درس وتدریس کی خدمت انجام دیں۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء تا ۲۰۰۴ء یعنی ۴۰ سال تک مسلسل مولانا نے اپنا سب کچھ اس مکتب کے لیے قربان کر دیا۔ اس قدر محنت ولگن سے اس کی آبیاری کی کہ آج یہ مکتب جامعۃ الفلاح کے نام سے ہندوستان کے عظیم

مدارس میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا کی زندگی کا اصل ہدف اللہ کی کتاب کو سمجھنا اور سمجھانا تھا۔اس کے لیے آپ نے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ زندگی کے بڑے عرصے تک آپ قرآن مجید سے چمٹے رہے۔ جب ذمہ داران جامعہ نے آپ کو جامعہ سے الوداع کہنے کا حکم نامہ آپ کے سپرد کیا تو مولانا کے دل کی آواز اس وقت جونکلی وہ یہی تھی کہ ''خدارا مجھے قرآن سے الگ نہ کریں''، جب کہیں سے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی تو مولانا خاموشی سے واپس علاؤالدین پٹی چلے آئے۔ سرزمین شبلی بندول کے مدرسۃ البنات کے ذمہ داران نے مولانا سے کافی اصرار کیا کہ مولانا ان کے اس مدرسے کی طالبات ومعلمات کو قرآن وعربی ادب پڑھائیں۔ مولانا راضی ہوگئے۔ جب تک مولانا کی ہمت اور صحت نے ساتھ دیا مولانا پابندی سے جاتے رہے اور وہاں کی طالبات اور معلمات کو اپنے علم سے منور کرتے رہے۔تقریباً بارہ سال آپ اس مدرسہ میں قرآن وعربی ادب کی شمع روشن کرتے رہے۔ جب کمزوری زیادہ ہوگئی تو وہاں سے رخصت لے کر گھر پر ہی مقیم رہے۔ ۲۵رفروری ۲۰۲۰ءکو اپنے رب حقیقی سے جاملے۔

خدا رحمت کند ایں پاک طینت را

ہمارے دادا مرحوم جب تک باحیات تھے، دعوت اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ دادا دعوت اخبار کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے اور بڑی باریک بینی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے۔ دادا مرحوم کے مولانا عبدالحسیب صاحب سے بہت گہرے مراسم تھے اور مولانا کو بہت عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے۔اس وقت میرے ذمہ یہ کام تھا کہ دادا کے مطالعہ کے بعد اخبار مولانا کو دے آؤں۔ اس بنا پر مجھے مولانا کے گھر جانے کا اکثر وبیشتر موقع ملتا۔ مولانا بھی دعوت اخبار کا بڑی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرتے تھے۔

مطالعہ

مولانا سے ملاقات کے لیے یا کسی اور کام کی خاطر جب بھی مولانا کے گھر جانا ہوتا، اکثر مولانا کو مطالعہ میں غرق، یا چارپائی پر بیٹھے اہلیہ سے گفتگو کرتے ہوئے پاتا۔ مولانا گھر سے باہر کم ہی نکلتے البتہ کبھی کبھی گھر سے قریب بیٹھک میں بھی بیٹھتے۔ مولانا کا اصل موضوع قرآن مجید تھا۔ جو کچھ بھی مطالعہ کرتے، بیش تر قرآن مجید سے ہی متعلق ہوتا۔ ایک مرتبہ میں دادا کے ساتھ کسی غرض سے اعظم گڑھ جارہا تھا کہ مولانا بھی ساتھ ہی تھے۔ کچھ باتیں ہورہی تھیں کہ مولانا نے اس پر قرآن کی ایک آیت پڑھی اور پھر اس کی تفسیر بیان کرنے لگے۔

اس طرح پورے راستے قرآن ہی کے متعلق بات کرتے رہے، منزل کب آ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔

خطبۂ جمعہ

مولانا کے والد حاجی محمد عثمان صاحب گاؤں کی مسجد میں بچوں اور بوڑھوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، اور دعا وغیرہ یاد کرانے کا اہتمام کرتے۔ مولانا عبدالحسیب صاحب نے بھی اپنی زندگی میں ان باتوں کا اہتمام کیا۔ جامع مسجد میں پنج وقتہ نمازوں کی امامت کرتے۔ کبھی طبیعت خراب ہوتی تو کسی اور کو آگے بڑھا دیتے۔ مولانا خطبہ جمعہ میں اکثر معمولات زندگی کے متعلق احادیث بیان کرتے اور ان کی تشریح سماج و معاشرے کے لحاظ سے کرتے۔ خطبہ نہ بہت لمبا ہوتا کہ سامعین اکتا جائیں اور نہ ہی اتنا مختصر کہ پیغام واضح نہ ہو سکے۔ مولانا کی ہر چیز کی طرح خطبہ جمعہ بھی اعتدال پر مبنی ہوتا۔

درس قرآن

مولانا کو زندگی بھر قرآن سے لگاؤ رہا۔ ان کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن کا خاص اہتمام کرتے۔ خطبہ جمعہ کی طرح درس قرآن بھی اعتدال پر مبنی ہوتا جو کہ چند آیتوں پر مشتمل ہوتا۔ چند آیتوں کے درس کے ذریعہ ہی مولانا نے متعدد بار قرآن مکمل کیا اور اپنے طور پر یہ کوشش کی کہ گاؤں کے لوگ بھی مکمل قرآن کو سمجھ سکیں اور اس کے معانی اور پیغام کو اپنی زندگی کا حرز جاں بنالیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے رہیں۔ یقیناً مولانا کا یہ عظیم کارنامہ گاؤں والوں پر بہت بڑا احسان ہے جس کا بدلہ انہیں اللہ تعالیٰ ضرور دے گا۔ مولانا کے بعد اب نمازی اس عظیم فیض سے محروم ہیں۔

درس حدیث

مولانا نے عصر کی نماز کے بعد درس حدیث کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو کچھ عرصے جاری رہا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہ سلسلہ رک گیا۔

رمضان

مولانا ماہ رمضان کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ خود بھی اس کی تیاری کرتے اور گاؤں والوں کو بھی اس مہینے کی عظمت سے آشنا کراتے اور نصیحت کرتے۔ ہر رمضان سے ایک ہفتہ قبل مسجد کی صفائی کے لیے باقاعدہ مسجد آتے اور مسجد میں اعلان کرتے کہ بچوں آپ لوگ آ جائیں مسجد کی صفائی کرنی ہے۔ اتنا سننا ہوتا کہ جس

جس کے کان میں مولانا کی آواز پہنچتی سب تیزی کے ساتھ مسجد کا رخ کرتے اور دل وجان سے مسجد کی صفائی کرتے۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں۔ ہم دیکھتے کہ مولانا بچوں کی آمد سے اتنے خوش ہوتے کہ کم زوری کی حالت میں خود بھی مسجد کی صفائی میں مصروف ہوتے اور خوشی سے مسکراتے رہتے۔

ایک دوست نے بتایا کہ جامعۃ الفلاح کے استاد اپنے طالب علمی کے زمانے میں مولانا سے ملاقات کے لیے علاؤالدین پٹی آئے۔ مولانا کو گھر پر نہ پا کر مسجد آئے تو دیکھا کہ مولانا تن تنہا مسجد کی صفائی میں مشغول تھے۔

گاؤں کے تمام ہی بڑے بوڑھے، بچے، مسلم، غیر مسلم سب مولانا کی بہت عزت کرتے۔ راستے سے گزرتے وقت سبھی مولانا کو سلام کرتے اور بچوں پر شفقت کی نظر ڈالتے ہوئے مولانا گزر جاتے۔ میرے علم کے مطابق مولانا نے اپنی زندگی میں ایک بھی روزہ نہیں چھوڑا۔ پچھلے رمضان میں مولانا بیانوے سال (۹۲) سال کی عمر اور کم زور حالت میں مکمل روزہ رکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ تراویح بھی بیٹھ کر پڑھتے، جب کہ کم زور اس قدر ہو گئے تھے کہ اپنے پوتوں کے سہارے مسجد آتے۔

مولانا گاؤں میں خود کو ہمیشہ اختلافی مسائل سے بچاتے رہے۔ کبھی ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو ہمیشہ تمام رایوں کو سامنے رکھ دیتے اور کہتے کہ آپ جس پر مطمئن ہوں اس پر عمل کریں۔

ہم نے مولانا کو ہمیشہ بہت ہی سادہ زندگی گزارتے دیکھا۔ کبھی تکبر کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں پایا۔ بلکہ اس کی جگہ انکساری اور تواضع ان کی فطرت کا حصہ تھا۔ ہمیشہ سادہ لباس زیب تن کرتے۔ عیدین یا کسی خاص موقع پر شیروانی ضرور پہنتے۔ مولانا اکثر بلریا گنج یا بندول یا آس پاس کا سفر پیدل ہی کرتے۔ اگر کوئی بائک یا کسی اور سواری سے گزرتا تو وہ مولانا کے لیے اپنی سواری ضرور روکتا۔ مولانا خاطر میں پہلے منع کرتے لیکن جب سامنے والا ضد کرتا تو راضی ہو جاتے۔ مجھے بھی متعدد بار بلریا گنج سے علاؤالدین پٹی یا علاؤالدین پٹی سے بلریا گنج تک بائک پر سوار کر کے مولانا کی خدمت کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ میں گھر سے فلاح جا رہا تھا، مولانا سے میری ملاقات شہاب الدین پور میں ہوئی۔ مجھے بھی دیر ہو رہی تھی، لیکن مولانا کو چھڑی کے سہارے اکیلے آتا دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے مولانا سے علاؤالدین پٹی تک چھوڑنے کے لیے اپنی بائک موڑ لی۔ پہلے مولانا راضی نہ ہوئے، کہا آپ کلاس کرنے جائیں۔ میں نے کافی ضد کی تو خیر سوار ہوئے۔

اللہ نے مولانا کو پانچ (۵) بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کیا۔ دو (۲) بیٹیوں کی وفات مولانا کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ مولانا کے ہمارے دادا مرحوم سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ جب

مولانا کے یہاں پہلے پوتے کی پیدائش ہوئی تو آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور سب سے پہلے فجر کی نماز کے بعد ہی یہ مبارک خوش خبری دادا جان کو سنائی۔ دادا جان نے کہا کہ مولانا کو اتنا خوش میں نے شاید پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔

مولانا سے میری آخری ملاقات وفات سے ایک ماہ قبل ہوئی۔ کم زوری اس قدر لاحق تھی کہ پہچان نہیں سکے۔ میں نے نام بتایا تو پہچان گئے اور پھر گھر، تعلیم اور دیگر احوال دریافت کرتے رہے۔ اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں مولانا کی خطاؤں کو درگزر فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور گاؤں والوں کو مولانا کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

●◘●

مولانا عبدالحسیبؒ اور مرکزی لائبریری

عبدالرحمٰن خالد فلاحی

مولانا عبدالحسیب صاحب ایک زمین دار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ذہنی لحاظ سے مطابقت بھی تھی۔ جو کہہ دیا وہ پورا بھی کر دیا، گاؤں کے افراد سے میل جول اور نشست و برخواست تھی۔ آپ کے پاس کھیت رقبے میں اتنا زیادہ تھا کہ مجبوراً چک بندی افسر کو کہنا پڑا کہ اتنے لمبے رقبے کا مالک کون ہے؟ جو ایک مرتبہ بھی ملنے نہیں آیا۔ یہ آپ کی بے نیازی کا ثبوت تھا۔

اس وقت زمین دار طبقہ علم سے نا آشنا ہوتا تھا تاہم آپ کا پورا گھرانہ علمی تھا۔ دادا عالم دین، والد محترم تعلیم یافتہ تھے اور خود بھی مدرسۃ الاصلاح سے فضیلت کی تکمیل کی تھی۔ عربی زبان و ادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ بوقت ضرورت عربی بولتے اور لکھتے بھی تھے۔ ان کی تین ترجمہ شدہ کتب ہیں: **احکام الحجاب فی القرآن، التفسیر الحقیقی للاسلام** اور **طرق الدعوۃ الدین**۔

ان کا ترجمہ فصیح، عربی قواعد و اصول کی پابندی کے ساتھ کی ہے۔ اسی طرح جامعہ میں آنے والے عرب مہمانان گرامی قدر کی بروقت ترجمانی اچھے لب و لہجہ میں کرتے تھے، جس کے لیے موجودہ دور میں ڈپلوما ہولڈر ہونا ضروری ہے، جب کہ آپ نے کہیں باہر سے تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔

آپ نے تدریس کی ابتدا **اسباق النحو** سے کی اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے منتہی درجات کے طلبہ کو قرآن، ادب اور بلاغت جیسے مضامین کا درس دینے لگے۔ دوران تدریس الفاظ و معنی کی تحقیق، مواقع کے لحاظ سے معنی کی تعیین و تطبیق، الفاظ معنی کا جاہلی اشعار سے استشہاد، باریک نکات، ہر اقوال سے استدلال، خاص طور پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے نوٹس کے حوالہ جات۔ بعد میں چل کر تدبر قرآن سے دلائل کی فراہمی تفسیر خازن پر بھرپور اعتماد کرتے تھے جو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں نظر آتی تھی۔ معجم البلدان، اقرب الموارد کا بار بار نام لیا کرتے۔ احادیث سے شاید ہی حوالہ دیا ہو، جب کہ مسلک اہل حدیث کے سخت عامل تھے۔

قرآن ، حماسہ، مقدمہ ابن خلدون، جمہرۃ خطب العرب اور جمہرۃ اشعار العرب پر گہری نظر تھی۔ کبھی عبارت میں پیچیدگی آجاتی تو کتب خانہ پہنچ جاتے۔ ان کے حل کے لیے کتابوں کے مختلف نسخے طلب کر کے عبارت کی تصحیح کرتے اور لغات کی مدد سے عبارت کا صحیح مفہوم کا تعین کر کے کلاس کا رخ کرتے۔

جامعۃ الفلاح میں ایک دور تھا کہ مراجع کی مجبوریاں اساتذہ کے مسائل کے حل میں مانع رہیں۔ بعض اوقات اساتذہ خود یا طلبہ کی مدد سے ان جگہوں کا رخ کرتے جہاں مراجع کا حصول ممکن ہوتا۔ تحقیق کرتے یا کراتے اور اپنی تشنگی دور کرتے۔ اب جامعہ اس باب میں خودکفیل ہوگیا ہے۔ جدید تحقیق شدہ کتب اور بنیادی مراجع کے حصول کے لیے اسکالر تشریف لاتے ہیں اور بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔

آپ کی شخصیت قابل رشک تھی، تواضع وانکساری، زہد و ورع، خوداعتمادی، قناعت پسندی، شائستگی، شیریں بیانی، مراتب کا خیال، بڑوں کا حددرجہ احترام، اپنا کام خود انجام دینے کی عادت، سادگی کے ساتھ سلیقہ مندی، نرمی کے ساتھ اصول پسندی، عجز وانکساری کے ساتھ انتظامی امور کی مضبوط ادائیگی، زیور علم وعمل سے آراستہ و پیراستہ ایک داعی، ذمہ دار اور عہدہ دار کو ان صفات عالیہ سے متصف ہونا ضروری ہوتا ہے جو آپ میں بطریق احسن موجود تھیں۔ ان صفات سے وابستہ چند واقعات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

دست خود دہان خویش کا معاملہ یوں ہے کہ استاد محترم اپنی چائے خود بناتے، پانی کا گھڑا خود لاتے، غرض ضروریات زندگی کی تکمیل خود انجام دینے کے عادی تھے۔ اگر کوئی طالب علم پانی کا گھڑا ان کے ہاتھ سے لینا چاہتا تو منع کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ طلبہ کو بھی خدمت کا موقع دیں تو کہا کہ ان کے احسان وخدمت کے صلہ میں ان سے اصول وضوابط میں مروت ومداہنت برتنی پڑے گی۔ رہا چپراسی کا مسئلہ تو یہ مدرسہ کا خدمت گار ہے، میں اس سے ذاتی کام لے کر کہاں حساب دوں گا۔

نرمی کے ساتھ اصول پسندی

ایک طالب علم کی بیماری کے سبب فیصد حاضری کم ہوگئی۔ سالانہ امتحان دینا ممکن نہ ہو رہا تھا۔ اس نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ مجھے امتحان میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ اگر ۹۰ فیصد سے کم نمبرات آئے تو میں اسی کلاس میں بیٹھوں گا، آپ نے ضامن طلب کیا۔ طالب علم نے میرا نام پیش کر دیا۔ مولانا نے میری ضمانت پر اجازت مرحمت فرمائی۔ طالب علم اسی دن سے مسجد میں معتکف ہوگیا اور اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ مولانا کو خوشی ہوئی کہ عزت رکھ لی۔ آپ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

انتظامی امور کی ادائیگی

جامعہ کے اندر چہار دیواری نہ تھی لیکن طلبہ بغیر اجازت باہر نہیں جاسکتے تھے۔شہاب الدین پور میں کسی غیر مسلم کے گھر میں آگ لگ گئی۔طلبہ جذبۂ ہمدردی سے آگ بجھانے چلے گئے۔اس پر مولانا کی ناراضی دیکھنے کے قابل تھی۔مولانا نے پچھّم کے راستہ پر مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب کو کھڑا کردیا اور پورب کے راستہ پر مجھے لے کر خود کھڑے ہوگئے۔تاکہ طلبہ اندر جانے نہ پائیں۔گویا ہوئے کہ تمہارے ماں باپ نے مجھے امانت سونپی ہے۔اگر کوئی جل گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔(نگراں کے منتظر نہیں رہے) نیکی کرنے کے لیے بھی اجازت لازمی ہے۔چنانچہ استادمحترم کا حکم ہوا کہ ہر چھوٹے کو دو چھڑی اور بڑے کو چار چھڑی مارو۔ ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور سر پر تلوار مرتا کیا نہ کرتا،حکم کی بجاآوری کرنی پڑی، ہر چھوٹے بڑے کی تادیب کرنی پڑی۔

ایک دوسرا واقعہ اسی سے وابستہ ہے۔ہاسٹل کی نگرانی کی کمی کے باعث کبھی کبھی پورے ہاسٹل میں صرف ایک نگراں رہ جاتا ہے۔ایسا ہی ایک واقعہ ہوا۔میں تحریکی پروگرام میں شریک تھا۔لڑکے آپس میں لڑ گئے۔ مولانا اپنے کمرے میں موجود تھے،طلب کرلیا اور کہا کہ آپ کی ذمہ داری طلبہ کی تربیت ونگرانی ہے نہ کہ تربیت لینے کی۔فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔اس کی جواب دہی اللہ کے پاس کرنی ہے۔

شیریں بیانی اور حکمت عملی

مسجد تعمیر کے وقت مسجد کی بنیاد میں مٹی کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے مولانا محمد عمران فلاحی کے والد محترم محمد کامل صاحب سے درخواست کی کہ اگر آپ کے کھیت سے مٹی نکال کر مسجد کی بنیاد پاٹ دی جائے تو دو فائدے ہوں گے۔ایک آپ کو مسجد پاٹنے کا ثواب ملے گا اور دوسرے بغیر محنت ومزدوری کے تالاب تیار ہوجائے گا۔انھوں نے اجازت مرحمت فرمائی۔مسجد کی بنیاد بھردی گئی اور تالاب تیار ہوگیا۔اس میں تجارتی نقطۂ نظر سے مچھلیاں پالی گئیں،جس سے صاحب معاملہ کا معاشی مسئلہ حل ہوگیا،ثواب بھی مل گیا،طلبۂ جامعہ کو بھی مطبخ میں مچھلی ملنے لگی۔

ہاسٹل کی تربیت پر مولانا کی گہری نظر تھی۔نگراں حضرات کی کارگردگی اور رپورٹوں پر نظر رکھتے تھے۔ کلاس،عمر،مقام وزبان کا خیال رکھتے ہوئے طلبہ کے کمروں کی تبدیلی ہوا کرتی تھی،تاکہ طلبہ کے درمیان دیہاتی اور مقامی زبان رائج نہ ہونے پائے اور ہر ایک اردو زبان استعمال کرے۔ایک سال تو اس حد تک

تحدید وحد بندی کردی کہ جہاں سے طلبہ سائیکل چلا کر آ سکتے ہیں، ان کو ہاسٹل میں جگہ نہ دی جائے، تا کہ باہر کے طلبہ کو ہاسٹل میں جگہ مل جائے اور تربیت بھی آسانی سے ہو۔ ان کی اپنی زبان اتنی فصیح و بلیغ تھی کہ گاؤں کے لوگوں کے سمجھ سے باہر تھی۔ بلکہ کچھ طلبہ کے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔ خاص طور پر جب بلاغت کی گھنٹی لیتے تو استعارہ، کنایہ اور تشبیہات کی مثالیں اسی انداز میں پڑھاتے اور اشعار کی زبان میں مثال دیا کرتے تھے۔

قطرہ قطرہ دریا می شود

۸۲/۸/۲۳ھ بمطابق ۱۹۶۳/۶/۲۵ء میں چند مخیّر حضرات کے عطیات کتب سے جامعہ کی لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے پہلے لائبریرین عبدالرؤف صاحب تھے۔ اس وقت یہ لائبریری عطیات وخیرات کردہ ۶۰۶ کتب پر مشتمل تھی۔ ایک دو کتاب دینے والوں کی فہرست لمبی ہے۔ لیکن وہ کتب جو بنیادی مراجع کا کام دیتی ہیں ان کا تذکرہ ضروری ہے:

۱۔ حافظ شبیر احمد صاحب محمد پور	۱۰/ کتب
۲۔ امداد احمد خاں صاحب خالص پور	۱۰/ کتب
۳۔ منظور احمد صاحب مدرس جامعۃ الفلاح	۱۰/ کتب
۴۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بلریا گنج	۱۲/ کتب
۵۔ حاجی عبدالاعلیٰ صاحب	۱۵/ کتب
۶۔ مولانا عبیداللہ مبارک پوری صاحب	۵/ کتب
۷۔ محمد انوار اصلاحی سکندر پوری صاحب	۱۵/ کتب
۸۔ ناظمہ خاتون خالص پور	۱۲/ کتب
۹۔ احمد محمود کوثر اعظمی صاحب طوئی	۲/ کتب
۱۰۔ حکیم صلاح الدین صاحب جیراج پور	۳۸/ کتب
۱۱۔ حکیم عبدالحی صاحب جیراج پور	۶/ کتب
۱۲۔ حکیم محمد ایوب ندوی صاحب	۱۷۰/ کتب
۱۳۔ مولانا محمد اسحٰق صاحب چاند پٹی	۱۳/ کتب

۱۴۔صغیراحمد شمس الزماں صاحب ۱۶/کتب

۱۵۔ابراراحمد فلاحی صاحب چاند پٹی ۱۲/کتب

۱۶۔منشی محمد انور صاحب ۱۵/کتب

۱۷۔ بدرالاسلام عثمانی ندوی صاحب ۱۳/کتب

عطیہ، ہدیہ وخرید کردہ کتب کی مجموعی تعداد ۶۰۶ ہوتی ہے، جس کا اندراج دفتر عمومی برائے اندراج کتب میں ہوا۔اوراسی میں فن تقسیم کر کےفن وارترتیب سے نام کا اندراج کر دیا گیا۔

یہ لائبریری صرف تعلیمی اوقات میں اساتذہ کے ذریعہ کتابیں نکالنےاور جمع کرنے کے لیےکھلا کرتی تھی۔ اس کے پہلے لائبریرین مفتی عبدالرؤف صاحب (۶۴۔۱۹۶۳ء)،دوسرے لائبریرین مولانا اقبال احمد ندوی (۶۸۔۱۹۶۴)،تیسرے لائبریرین مولانا رحمت اللہ الاثری (۷۱۔۱۹۶۸ء)،چوتھے لائبریرین مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب (۷۵۔۱۹۷۱ء)، پانچویں لائبریرین مولانا رحمت اللہ الاثری صاحب (۷۷۔۱۹۷۵)، چھٹے لائبریرین مولانا جبرئیل امین صدیقی (۷۸۔۱۹۷۷)،ساتویں لائبریرین مفتی عبدالرؤف صاحب (۸۰۔۱۹۷۸)، آٹھواں لائبریرین راقم الحروف عبدالرحمٰن خالد(۹۹۔۱۹۸۰)،نویں لائبریرین محمد راشد علیگ(۲۰۰۰۔۱۹۹۹)،دسویں لائبریرین عبدالرحمٰن خالد(۲۰۰۰۔۲۰۰۸)اور گیارہویں لائبریرین عرفان احمد فلاحی (۲۰۰۸ءتاحال) ہیں۔

۷۰۔۱۹۶۹ءکا دور تقریباً مسجد کی بنیاد رکھنے کا دور تھا۔اس مقصد سے مولانا کوکویت کا سفر کرنا پڑا۔اس کے لیے آپ نے کویت کا متعدد بار سفر کیا۔کویت میں آپ عبداللہ عقیل کے مہمان خصوصی ہوا کرتے تھے۔پھر سعودیہ سے شاہ فیصل کا تعاون حاصل ہوا جہاں آپ نے مسجد کی تعمیر کا مسئلہ حل کیا اور تکمیل مسجد کے ساتھ آپ نے جنت الفردوس میں اپنا گھر بنالیا۔ وہیں وزارۃ اوقاف الشوؤن الاسلامیہ کویت سے لائبریری کے لیے کتابوں کا تحفہ حاصل کیا۔ نیز افراد واشخاص سے خصوصیت سے ہدیہ لیااور کتابوں کی خریداری کی۔اور وزارۃ اوقاف کے توسط سے ارسال کیا۔۱۹۸۰ءمیں میری تقرری کے چندسال بعد ماہ رمضان میں مجھے ضلع بلیا سے مولانا نے طلب کرلیا کہ آپ کی لائبریری کی چھ کارٹون کتب آ چکی ہیں۔آ کر اندراج کرلیں،تا کہ مدرسہ کھلتے ہی اساتذہ کو استفادہ کے لیے دی جاسکیں۔راقم نے حکم کی تکمیل کی اور مودودی ہال میں اندراج مکمل کیا۔مولانا کے دوکام تاریخی ہیں: (۱)ایک مسجد کی تعمیر (۲) لائبریری کے ذخیرہ میں کتابوں کا اضافہ۔

فارغین جامعہ کی کوششیں وکاوشیں

مراجع کتب ولغات کی تنگی کا احساس فارغین جامعہ کو پہلے سے تھا۔ فارغین کے پہلے گروپ (مولانا ابوالمکارم، مولانا حبیب احمد اور مولانا عبدالوحید) نے لسان العرب (۱۵ جلد) کا ہدیہ بھیج کر اس کمی کی تکمیل کی۔ جس کو افادۂ عام کے لیے مودودی ہال میں رکھ دیا گیا کہ اساتذہ وطلبہ اس سے استفادہ کریں۔ یہیں سے عطیات وہدایا کتب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس پر ایک سرسری نظر ضروری ہے کیوں کہ یہاں سے عطیات کتب کے ساتھ لائبریریوں کے ضم ہونے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

مولانا سلامت اللہ اصلاحی صاحب اور مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے مدینہ میں دوران طالب علمی منصوبہ بند طریقہ سے اداروں اور افراد سے قرآنیات کے موضوع پر کتابیں حاصل کر کے یا ان سے رقم لے کر کتابیں خرید کر بھیجنا شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں قرآنی موضوعات وتفاسیر کا اہم ذخیرہ یکجا ہوگیا۔ درخواستوں کے ذریعہ وزارۃ اوقاف والشؤن الاسلامیہ کویت، قطر اور سعودیہ سے اہم مراجع ودرسی کتب حاصل کیں، تاکہ تشنگیٔ علم کی تکمیل ہوسکے۔ ان کی واپسی کے بعد ایک لمبا خلا محسوس ہوا لیکن مولانا محمد طاہر مدنی اور ان کے صاحب زادے عبیداللہ طاہر، سعود عالم سنبھلی اور جاوید سلطان نے اس خلاء کو پر کیا۔ اور کتابوں کی خریداری اور لائبریریوں کے ہدیہ کے ذریعہ اس کی تکمیل کی۔

عطیہ کنندگان لائبریری وکتب

۱۔ جناب مولانا جلیل احسن ندویؒ، ۲۔ جناب مولانا شبیر احمد مفتاحیؒ، ۳۔ جناب مولانا امین الہدی فلاحی، ۴۔ جناب مولانا قاری عرفان احمد شمسی فلاحی، ۵۔ جناب مولانا جاوید احسن مجاہد فلاحی، ۶۔ جناب مولانا زبیر احمد دربھنگہ مقیم ریاض مرحوم، ۷۔ جناب مولانا قمر سنبھلی، ۸۔ جناب مولانا سعید اختر، ۹۔ جناب مولانا ابوحاتم علیان الصحی، ۱۰۔ جناب مولانا محمد بن صالح المحسن، ۱۱۔ جناب نعیم الحامد مکہ مکرمہ، ۱۲۔ جناب ام، ۱۳۔ جناب مولانا صدرالدین اصلاحی، ۱۴۔ جناب مولانا ابوبکر اصلاحی، ۱۵۔ جناب مولانا صغیر احسن اصلاحی، ۱۶۔ جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب کے والد محترم، ۱۷۔ جناب ماسٹر (بھگت پور)، ۱۸۔ جناب مولانا عمیر منظر فلاحی، ۱۹۔ جناب مولانا عبیداللہ فہد فلاحی، ۲۰۔ جناب مولانا توقیر عالم فلاحی، ۲۱۔ جناب مولانا عبدالبر الاثری فلاحی، ۲۲۔ جناب مولانا ضیاء الدین ملک فلاحی، ۲۳۔ معرفت مولانا سلامت اللہ اصلاحی، ۲۴۔ معرفت جناب مولانا رحمت اللہ الاثری فلاحی، ۲۵۔ قومی کونسل فروغ اردو دہلی، ۲۶۔ ادارۂ ادب اسلامی، نئی دہلی، ۲۷۔ وزارۃ

الاوقاف والشوؤن الاسلامیۃ کویت، ۲۸۔وزارۃ الاوقاف والشوؤن الاسلامیۃ قطر، ۲۹۔وزارۃ الاوقاف والشوؤن الاسلامیۃ سعودیہ، ۳۰۔مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق، ۳۱۔جامعۃ الملک سعود ریاض، ۳۲۔جامعۃ ام القریٰ مکہ مکرمہ۔

اس وقت جامعۃ الفلاح کی لائبریری میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۳۲۱۵۷ تک پہنچ چکی ہے۔

کتابوں کی تنظیم وترتیب

ذخائر کتب سے اسی وقت استفادہ ممکن ہے، جب اس کی صحیح ترتیب وتنظیم ہو۔اور قاری کو کتاب سہولت سے مل جائے اور کتاب اپنی جگہ چلی جائے۔

ابتدا میں کتابیں کم تھیں۔کتابوں کے رجسٹریشن نمبر۔جلد نمبر اور نسخہ کی تعداد سے کام چلالیا گیا۔کتاب نمبر/ جلد نمبر۔نسخہ نمبر لیکن ایک بڑی لائبریری کے لیے مشکل تھا۔اس کے لیے میں نے ڈیوی ڈسمل درجہ بندی کے عربی ورژن کا استعمال کیا۔اس ضابطہ کے عمومی نسخہ میں اسلامیات کے لیے ۲۹۷ ہے لیکن عربی ورزن میں اس کے لیے ۲۰۰ ادیان نمبر مختص کردیا ہے بلکہ ہر فروع میں پہلا نمبر مشرقی علوم کا ہوگا۔اس طرح لائبریری میں داخل ہوتے ہی مشرقی علوم کی کتب نظر آنے لگے گی۔

چنانچہ ۲۰۰ سے ۲۶۰ تک کا نمبر اسلامی علوم ومصادر کے لیے مختص کردیا ہے اور ۲۷۰ اور ۲۸۰ مسیحی علوم کے لیے جب کہ ۲۹۰ دیگر ادیان و مذاہب کے لیے مختص ہے۔اس میں مزید وسعت وگنجائش کے لیے سماجی ومعاشرتی علوم کو بنیادی نمبر ۲۱۴ ثقافت میں جوڑ دیں گے اسی طرح شریعت، احکام، حکومت، عدالت، سیاست، اقتصادیات، طب وجدید علوم کو ۲۵۰ تا ۲۵۹ سے جوڑ کر درجہ بندی کی جائے گی۔

جامعۃ الفلاح کی لائبریری انہیں اصولوں پر ترتیب دی گئی ہے۔جیسے تفہیم القرآن۔ابوالاعلیٰ مودودی ۲۲۷/م۔ابو۔ت تفسیر۔

اس بنیاد پر ایک مصنف ایک نام کی کتب، سلف پر ایک ساتھ ملیں گی۔بروقت لائبریری کتب کا اندراج کمپیوٹر پر جاری ہے، تاکہ کارڈ اور کیبنٹ سے چھٹکارا ملے اور طلبہ کمپیوٹر سے سرچ کرسکیں۔

لائبریری کی تجدید کاری

۱۔صرف پانچ المارریاں تھیں، اکثر درسی کتب پر مشتمل تھیں۔

۲۔اندراج نمبر اور جلدوں اور نسخوں کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب تھی۔

۳۔فنی تقسیم کی گئی تھی لیکن ناقص رہی۔

۴۔اندراج رجسٹر،فن رجسٹر،اور اجراء کتب رجسٹر غیر منظّم تھے۔

۵۔کتابوں کا نئے رجسٹر پراندراج کیا۔فنون وار رجسٹر مرتب کیا۔

۶۔اجراء کتب کے لیے اجراء فارم جاری کیا۔نیز اجراء کتب رسید عمل میں لایا۔

۷۔رسائل وجرائد کے حصول یابی کے لیے ملک وبیرون ملک خطوط ارسال کیے اور ان سے کافی رسائل وجرائد آنے لگے۔

۸۔درسی کتب کی خریداری کومحدود کر کے مصادر ومراجع کتب کی فراہمی کوممکن بنایا۔

۹۔درسی کتب سے بچوں کوخود کفیل کیا۔حماسہ،اصول فقہ،عقیدہ،معاشیات دیگر درسی کتب کی فوٹو کاپی طلبہ کے درمیان صرف لاگت پرفراہم کیا۔

۱۰۔طلبہ کوریڈنگ روم کی سہولیات فراہم کیں۔پہلے آؤ پہلے پاؤ کے اصول پر کتابوں کی فراہمی ممکن بنایا۔

۱۱۔خالی اوقات کے استعمال کے لیے اخبار ورسائل وجرائد کوریڈنگ روم میں جگہ دی۔تاکہ طلبہ اس سے واقف ہوں اور ان کومضامین لکھنے کا حوصلہ ملے۔

۱۲۔شعبۂ جات میں لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا۔تاکہ طلبہ، طالبات اور اساتذہ خالی گھنٹوں میں استفادہ کرسکیں۔

۱۳۔ریفرنس بکس کی خدمات دیں۔تاکہ طلبہ اپنے مقالے لکھ سکیں۔

۱۴۔کلیۃ البنات کی لائبریری کو طالبات کے استفادہ کے لیے کلاس کے اوقات میں کھولنے کی راہ ہموار کی اور اس کو مرکزی لائبریری کے طرز پر طالبات کے لیے لائبریری بنانے کی کوشش جاری ہے۔

نصاب تعلیم وتربیت کی تعمیر اور ترقی میں

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا حصہ

مولانا ظفر احمد اثری فلاحی

کوئی بھی نصاب کسی تعلیم گاہ کے لیے ایسا پیمانہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ ناپا جاسکتا ہے کہ وہاں کی تعلیم و تربیت کا کیا معیار ہے، اور نصاب تعلیم ہی کے ذریعہ طلبہ کی علمی ترقی اور ان کے تزکیۂ نفس کو معیار بنایا جاسکتا ہے۔ جامعہ کے نصاب کا ایک جائزہ اس بات کے ذریعہ لیا جائے گا کہ اس کا نصاب تعلیم دوسرے مروجہ تعلیم سے کتنا مختلف ہے اور دوسرے نصاب تعلیم کے نفاذ کا طریقہ کیا رہا ہے اور جامعۃ الفلاح دوسرے نصابوں سے کتنا مختلف ہے اور کیوں؟ اور دوسرے نصابوں سے کیا بنیادی فرق ہے؟ ماضی قریب اور ماضی بعید کے نصابوں کا ایک مختصراً جائزہ لیکر جامعہ کے نصاب پر گفتگو ہوگی۔

یہ مضمون ۱۹۶۴ء۔۱۹۷۹ء کے زمانے تک محیط ہے اور یہ بھی ذکر کردوں کہ میرے نزدیک اس زمانہ تک جامعہ کے نصاب تعلیم اور تعلیم وتربیت کے میدان میں چار اہم کردار رہے ہیں: مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز ہندی اصلاحیؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اور مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ ہیں۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ان میں سب سے اہم کردار رہے ہیں، وہ اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جامعہ کی سرگرمیوں سے اپنے کو الگ نہیں کر سکے۔ ہر موقع پر اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار رہے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے اور عظیم خدمات انجام دے کر ہم سے رخصت ہو گئے اور اپنے لیے جامعۃ الفلاح کی شکل میں ایک 'صدقہ جاریہ' چھوڑ گئے۔

بقیہ اساتذہ کرام کا ضرور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں اہم کردار رہا ہے لیکن یہ چاروں اس وقت اپنے اپنے زمانوں میں جامعہ کی صدارت کے اہم منصب پر فائز تھے اور اپنی ذمہ داریوں کا فریضہ ادا کر رہے تھے اور دوسرے ذمہ داروں کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ بھی تھے اور اس وقت جامعہ کی صدارت ایک کلیدی ذمہ داری تھی اور جامعہ کی تمام قسم کی ذمہ داریاں اسی پر مرکوز تھیں اور اِس وقت تو مختلف تعلیمی اور

تدریسی شعبے قائم ہوکر ذمہ داریاں تقسیم ہوگئی ہیں۔آغاز کار میں صدارت کی ذمہ داری جامعہ کی تمام اندرونی، تنظیمی، تعلیمی اور تربیتی امور پر مرکوز ہوتی تھیں۔ اس وقت کوئی بھی ذیلی شعبہ یا عہدہ نامزد نہیں ہوتا تھا جو صدارت کی ذمہ داریوں کو سلب کرلے۔

دوسری اہم بات یہ کہ میں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درس نظامی کا براہ راست قرآن فہمی سے کوئی حصہ نہیں رہا ہے اور یہ شرف مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح کے نصاب تعلیم کو جاتا ہے۔

نصاب تعلیم کا ماخذ اور اس کا مقصد

نصاب تعلیم کی بنیاد دراصل قرآن مجید کی تعلیمات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے اقوال افعال سے عبارت ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ کی بعثت کا مقصد یہ بتلایا گیا: رَبَّنَـا وَابْعَـثْ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ العَزِيْزُ الحَكِيْم (سورہ:البقرہ۱۲۹) آپ کی بعثت کا مقصد آیات کی تلاوت کرنا اور کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا اور تزکیہ کرنا تھا۔ نبی کی ذات تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور صحابہ تعلیم وتربیت کے اصول اور ماخذ سے مستفید ہوتے تھے۔قرآن جستہ جستہ اتر رہا تھا اور اس قدر اترتا تھا کہ ان کی صحیح تربیت ہوتی رہے۔ ایسا اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہوگیا تھا، اس سے ان کی تربیت کا سامان ہو رہا تھا۔صحابہ تربیت کے اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھتے تھے اور انھیں اپنی زندگیوں میں نافذ کرکے فوراً دوسروں تک پہنچاتے تھے۔

مسجد نبوی میں صفہ دنیا کی پہلی یونی ورسٹی تھی، جہاں طلبہ اپنے معلم اور استاد سے قرآن وحدیث کی تعلیمات حاصل کرتے تھے۔ یہاں کا نصاب تعلیم کا ماخذ آخری نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم تھے۔ یہ مرکز تھا جہاں امت مسلمہ کا تعلیم وتربیت کا نصاب تیار ہو رہا تھا۔اور اسی نصاب کی بدولت دنیا کی عظیم یونی ورسیٹوں نے نافذ کیا۔آپ کی ارشادات کے مطابق تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کے اصول اخذ کیے گئے اور انہی ارشادات کے مطابق نصاب تعلیم بدلتے ہوئے حالات کے تحت تیار ہوتے رہے۔

خلافت راشدہ کے دور میں دین اسلام کے مختلف مراکز قائم ہوئے۔جن میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن شامل ہیں۔ یہ وہ مراکز ہیں جہاں حدیث کے مراکز تھے اور ان مراکز میں احادیث کی تعلیم ہوتی تھی۔اور قرآن وحدیث سے متعلق جن فنون نے جنم لیے وہ یہی مراکز تھے۔اور تعلیمات رسول کو ایک فن کی حیثیت سے پڑھنا شروع کیا گیا اور یہ علوم وفنون مدارس کے نصاب کا حصہ بنتے چلے گئے۔

آغاز اسلام میں تعلیم کا طریقۂ کار

''ظہور اسلام کے بعد اسلام علم وعمل کا مجموعہ ہے اور دین کے علم کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی، اس لیے قرآن مجید میں تکرار اس کی تحصیل کی ترغیب دلائی گئی ہے اور حدیثوں میں تو اس کو فرض قرار دیا گیا ہے، اس لیے ظہور اسلام کے بعد ہی تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں گو علم کا مرجع آپؐ ہی کی ذات تھی، لیکن آپ کی زندگی بلکہ اسلام کے ابتدائی دور میں آپؐ کے فیض یافتہ صحابہ کرام تعلیمی خدمت انجام دینے لگے تھے، چنانچہ ہجرت سے قبل آپؐ حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابن مکتومؓ کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا اور مدینہ آنے کے بعد تو تعلیم کا پورا نظام قائم ہوگیا تھا۔ اصحاب صفہ کی مستقل درس گاہ تھی، جس میں دین کی تعلیم ہوتی تھی اور کبھی رسول اللہ ﷺ بھی اس میں شرکت فرماتے تھے۔ باہر کے نومسلم اشخاص اور قبائل مدینہ آکر تعلیم حاصل کرتے تھے اور ضروری تعلیم کے بعد اپنے وطن لوٹ جاتے تھے۔ حدیث وسیر کی کتابوں میں وفود کے ذکر میں اس کی تفصیل مذکور ہے۔''(۱)

بیرونی اشخاص اور قبائل کی درخواست پر ان کی تعلیم کے لیے مدینہ سے معلمین بھیجے جاتے تھے۔ آپ کے زمانے میں کتابت کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس وقت دوسروں سے معاملات ہوتے تھے تو عبرانی زبان کی ضرورت تھی، تو آپ نے اس زبان کو سیکھنے کا زید بن ثابت کو حکم دیا۔

تعلیمات رسول کو فن کی حیثیت دی گئی۔

آپؐ کے وصال کے بعد صحابہ کرام تو دین کی اشاعت میں لگ گئے تھے اس کے ساتھ ہی تعلیمات رسول کو اور آپ کے اسوہ کو عام کرنے کے لیے تعلیم کے طریقہ کو بہت ہی علمی انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا کام آغاز ہوا۔ صحابہ کے زمانے میں آپ کے اقوال اور سنن کا ایک فن کی حیثیت سے فروغ ہوا۔ ان میں حضرت عمرؓ کا کردار بہت ہی نمایاں ہے۔ تعلیمات رسول کو ایک فن کی حیثیت سے پڑھا جانے کا آغاز خلافت راشدہ میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ پہلے قرآن کی اشاعت اور اس کی تعلیم پر توجہ: ''خلفائے راشدین کے مقدس دور تک تعلیم کا مفہوم ومقصد صرف مذہبی تعلیم تھا، حضرت عمرؓ نے ان کی بڑی اشاعت کی، مذہب اسلام کی بنیاد کلام اللہ پر ہے اس لیے اس کی حفاظت، تعلیم واشاعت کا بڑا اہتمام کیا، عہد صدیقی میں آپ ہی کے اصرار پر کلام اللہ کی تدوین ہوئی، اپنے زمانہ میں تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کئے اور ان کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر کئے، ان مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی ہوتی تھی''۔(۲)

حفاظ قرآن کو درس قرآن کے لیے صحابہ کو حمص ،فلسطین اور شام بھیجا۔اسی طرح بدوؤں میں تعلیم بالغان کا م شروع کیا اور امتحان کا سسٹم ایجاد کیا اور جن کو یاد نہ ہوا ان کو سزا دی جائے۔(۳)

اسی طرح حضرت عمرؓ نے حدیث کی تعلیم پر توجہ دی اور اس وقت جو مسائل اور احکام آپ کے سامنے آتے احادیث کی روشنی میں حل کرتے تھے اور اگر آپ کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا تو اپنے اصحاب سے معلوم کرتے۔اور آپ کے ان ہی پیش آمد مسائل پر جو فتویٰ صادر فرماتے تھے وہ فتاویٰ کی شکل میں نصاب تعلیم کا حصہ بن گئے جو آج نصاب تعلیم میں وہ کتابیں داخل نصاب ہیں۔ابن قیم الجوزیہ [۶۹۱ھ۔۷۵۱ھ۔۱۲۹۲ء۔ ۱۳۴۹ء] کی معرکہ آرا کتاب 'اعلام الموقعین' جو سنت رسول اور صحابۂ کرام کے فتاویٰ پر مبنی کتاب ہے اور اول نمبر میں حضرت عمرؓ کے فتاویٰ کی بنیاد پر ہے،اس کے ساتھ ہی فقہ،اصول فقہ،مقاصد شریعت،تاریخ شریعت اور سیاست شریعت پر گفتگو کی گئی ہے''اعلام الموقعین''میں آپ کے فتاویٰ کو بنیادی طور پر اہمیت دی گئی ہے اور ایک معروف کتاب ہے جو تمام بڑی یونیورسیٹوں میں داخل نصاب ہے۔اس کتاب سے فتاویٰ کے اصول بھی مرتب ہوتے ہیں۔

اسی طرح جرح وتعدیل کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی جو نصاب تعلیم کا بڑا حصہ ہے اور اس کے بغیر صحیح و ضعیف حدیث کی چھان بین نہیں کی جاسکتی ہے۔اس سلسلے میں حضرت ابوموسی اشعریؓ کا قصہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بہت مشہور ہے۔(۴)

آپ خود لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے تھے،خطبوں اور تقریروں میں بیان کرتے تھے،صحابہ کے مجمع میں ان کو پیش کر کے طے کراتے تھے،اضلاع کے حکام اور افسروں کو فقہی احکام لکھ کر بھیجتے تھے۔یہ احکام آج بھی تاریخوں میں موجود ہیں۔اسلامی حکام انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ مذہبی معلم بھی ہوتے تھے اس لیے حضرت عمرؓ ان کے تقرر میں ثقہ کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔آپ فرماتے تھے کہ:''میں نے افسروں کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو مسائل اور احکام بتائیں۔''(۵) مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تمام ممالک میں مستقل فقہا اور معلم مقرر کیے،اس طرح فاروقی عہد میں مذہبی تعلیم کا مکمل انتظام تھا۔

اس طرح بالکل کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھوں فقہ کی تدوین کا آغاز ہوگیا تھا،جس طرح قرآن ایک جلد میں آپ کے اصرار پر جمع ہوا۔حضرت زید بن ثابتؓ،جو آپ ﷺ کی دائمی صحبت کے باعث کاتبین وحی کے سرخیل تھے،کو بلایا اور انھیں قرآن کی مسلسل کتابت اور اسے ایک جلد میں مرتب کر دینے کا حکم دیا۔(۶)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں وحی نازل ہو رہی تھی اور پیش آمدہ مسائل کا حل اللہ کی طرف سے آجاتا تھا اور یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دینی بصیرت سے ان مسائل کا فیصلہ فرماتے تھے۔لیکن غیر منصوص مسائل کے استنباط کا فن خلفائے راشدین کے دور میں ہوا۔''حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور دوسرے انداز سے قرآن کی تعلیم میں مختلف طریقے اپنائے گئے، سورتوں کو سیکھنا، اور قرآن کو صحت تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس کے لیے حضرت عمرؓ نے تاکیدی احکام بھیجے اور قرآن مجید کو صحت اعراب کے ساتھ تعلیم دی جائے، جو لوگ علم بلاغت سے ناواقف ہیں انھیں قرآن پڑھانے کی اجازت نہیں تھی۔اس کے بعد بھی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں یہی تعلیم کا طریقہ رائج رہا۔''(۷)

اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانہ میں دوسرے فنون میں توسع ہوا اور مفتوحہ مما لک میں ان فنون کی تعلیم اپنی پوری آن بان کے ساتھ ہوتی رہی اور اس میں دن بدن ہر پہلو سے ایجادات ہوتے رہے۔

عہد اموی وعباسی میں تعلیم وتربیت کی ترقی نئے انداز سے

خلافت راشدہ میں جو طریقہ کار تھا اس میں توسع آیا اور نصاب تعلیم کا باضابطہ کورس متعین ہوا اور مختلف فنون کی کتابیں لکھی گئیں اور نصاب کا حصہ بنیں اور جو فنون خلافت راشدہ میں نشو ونما ہوئے تھے وہ ان دونوں عہدوں میں منتقل ہوتے چلے گئے اور استفادہ کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔یہ اسلوب نصاب تعلیم میں داخل ہوتا چلا گیا۔ایک تسلسل تھا جو رکنے کا نام نہیں لیا اور کتاب وسنت کی اشاعت کے ساتھ ان کی مختلف شاخیں زمانے اور حالات کے اعتبار سے نکلتی چلی گئیں۔

عہد اموی کا عہد تابعین اور تبع کا دور تھا اور اسلام روم، فارس اور دوسرے ملکوں میں پھیل چکا تھا، اور مساجد مدارس تعلیم گاہیں بنتی گئیں، بہت ہی اہم بات یہ ہوئی کہ تعلیم کی تقسیم دو حصوں میں بٹ گئی اور وہ تھی عقلی علوم اور نقلی علوم۔نقلی علوم میں علوم حدیث، علوم تفسیر، تشریع اسلامی، لغت، نحو اور ادب وغیرہ شامل تھے اور عقلی علوم میں ایسے علوم شامل تھے جن سے معاش کمایا جائے اور وہ علوم یہ تھے: تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، علم ہیئت وفلکیات، علم نباتات، علم حیوانات، علم الارض، کیمیا، طب، طب، وغیرہ۔(۸)

تعلیم کا طریقہ اور نصاب تعلیم

تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ مساجد میں اپنا کورس پورا کرتے تھے۔جن میں علوم قران، حدیث اور فقہ کی

تعلیم ہوتی تھی اور طریقہ یہ تھا کہ وقت کے حدیث اور فقہ کے ماہر اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ کوئی کتاب سامنے نہیں ہوتی، استاد قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے اور طلبہ اسے اعادہ کرتے تھے، پھر اساتذہ ان آیتوں کی تشریح کرتے۔ اسی طرح احادیث رسول، اساتذہ احادیث پڑھتے تھے اور ان کی فقہی تشریح کرتے تھے۔ نصاب تعلیم اساتذہ کے ذہن میں ہوتا تھا اور اس دور میں مدون احادیث کی کتابیں تصنیف نہیں ہوئی تھیں۔

دس سال کی عمر ہی سے اس دور میں قرآن وسنت کی تعلیم شروع ہو جاتی تھی، قرآن کی تعلیم کا اسلوب ''عرض'' کا ہوتا تھا۔ کوئی طالب علم قرآن کو ایک مرتبہ پڑھ کر سناتا تھا یا اسے کئی مرتبہ دہراتا تھا۔ استاد اس کی قراءت کو سنتا تھا۔ حدیث کی تعلیم کا اسلوب ''سماع'' تھا۔ استاد احادیث پڑھ کر سناتا تھا اور طلبہ ان سے سنتے تھے اور یاد کر لیتے تھے۔

فقہ کی تعلیم کا اسلوب یہ ہوتا تھا کہ ایک حدیث یا دو حدیث پڑھ کر ان کی تشریح کر دیتے تھے۔ کتاب سے پڑھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے اس سے ذہن ادھر ادھر بھٹکنے کا اندیشہ ہوتا تھا اور قوت اخذ میں کمی آتی تھی۔

یہ دروس روزانہ مساجد میں ہوتے تھے اور فجر بعد سے شروع ہوتے اور دوپہر کو ختم ہو جاتے تھے اور عصر کے بعد شروع ہوتے تھے اور غروب شمس تک جاری رہتے تھے اور طریقہ یہ تھا کہ ایک مکمل دن میں فقہ کی تعلیم ہوتی تھی دوسرے دن تفسیر ہوتی تھی کسی دن مغازی کی تعلیم ہوتی تھی کسی دن ادب وشعر کی تعلیم ہوتی تھی اور کسی دن تاریخ عرب کی تعلیم ہوتی تھی۔

ایک فن کے حصول میں آٹھ سال کا عرصہ لگتا تھا۔ محمد شہاب زہری کہتے ہیں کہ میں نے فقہ کی تعلیم میں سعید بن المسیب سے مدینہ میں آٹھ (۸) سال کا عرصہ گزارا۔ اسی طرح وہ 'الرصافۃ' (شام میں) منتقل ہو گئے تو وہاں دوسرے طلبہ کے ساتھ حدیث کا علم محمد بن الولید الزبیدی سے دس (۱۰) سال تک سیکھا۔ ایک ایک فن کے حصول میں دس سے بیس سال کا عرصہ لگتا تھا۔ جب کہ اس وقت حالیہ زمانہ میں نصاب تعلیم میں مختلف علوم و فنون شامل ہوتے ہیں اور بیک وقت سارے علوم وفنون پڑھانے کا طریقۂ کار ڈیولپ ہو گیا ہے۔ ایک ہی فن میں درک حاصل کرنے کے لیے درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد ہی کسی علوم شرعیہ کے کسی برانچ میں دسترس حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ مدارس میں تخصص کے نام سے اور یونیورسٹیز میں پی ایچ ڈی کا نام دیا جاتا ہے، اس موضوع پر ایک تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

اموی دور اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں علمی اور تعلیمی خدمات بہت انجام پائیں، اسی دور میں

بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے، احادیث کی کتابیں مدون ہوئیں۔ جن میں یہ خلفاء قابل ذکر ہیں: حضرت امیر معاویہؓ، خلیفۂ ہارون رشید اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ اس دور میں سب سے اہم کام یہ ہوا کہ منظّم طریقے سے مدارس کھولے گئے۔ ایک نصاب تعلیم تیار ہوا اور یہ سہرا سلجوقی حکومت کو جاتا ہے۔ اس وقت کے وزیر تعلیم نظام الملک طوسی نے 'درس نظامیہ' کے نام سے ایک جدید قسم کا نصاب تیار کیا جس کی اتباع آج تک کی جاتی ہے اور اس کے اثرات بہت دور تک مرتب ہوئے اور اس کی شعاعیں پورے عالم اسلام میں پھیل گئیں۔ سلجوقیوں کے شروع کے حکمراں اسلام پسند اور اسلام سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ سلجوقی اصلاً ترک تھے اور ان کی حکومت گیارھویں تا چودھویں صدی عیسوی کے درمیان تک رہی۔ مسلم تاریخ میں ان کو ان کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ دولت عباسیہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کو ایک مرکز پر جمع کرنے والی آخری سلطنت تھی۔

''نظام الملک طوسی کا اصلی نام حسن بن علی تھا۔ ۴۰۸ ہجری میں پیدا ہوا، سلجوقی عہد (الپ ارسلان کے زمانہ میں) میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور تیس سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ عالموں، فاضلوں، ادباء اور دانش ور کا قدرداں تھے۔ انھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے نظامیہ کے انداز سے ملک بھر میں درس گاہوں کا جال بچھا دیا۔ خراسان، شام اور عراق میں بڑے بڑے علمی مراکز قائم کیے اور انھوں نے ۱۰۶۶ء میں نیشاپور میں اسلامی دنیا کی پہلی عظیم یونی ورسٹی قائم کی (۴۵۷ھ۔ ۱۰۶۵ء)۔ جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ، دانش ور، ماہرین فنون درس وتدریس پر مامور تھے۔ امام غزالی اس یونیورسٹی کے پرنسپل تھے۔ اور امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی [۴۱۹۔ ۴۷۸ھ] یہاں درس دیتے تھے، اور مذہب شافعی کے فقیہ تھے۔ اور مشہور شاعر، ماہر ارضیات وجغرافیہ اور دوست اور اس کی حکومت کے ایک اہم رکن عمر خیام کے تعاون سے'' جلالی کیلنڈر کا اجرا کیا۔ (۹) انھوں نے ساری عمر اسلام اور فروغ تعلیم میں گزار دی۔ انھیں اسماعیلیوں نے ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴ اکتوبر ۱۰۹۲ء میں شہید کر دیا گیا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ سے اس وقت کے ان کی تعلیمی مہم جوئی کے حیرت انگیز واقعات آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں 'سیاست نامہ' (سیر الملوک) کتاب لکھی ہے، جس میں انھوں نے حکومت کرنے کے طریقہ کار اور قیام عدل کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس کی بنیادی فکر اس بات پر ہے کہ حکومتیں عدل وانصاف کے اصولوں پر قائم ہوتی ہیں۔

نظام الملک طوسیؒ کے نصاب تعلیم کی خصوصیات

اس کے تیار کردہ نصاب میں فقہ اور حدیث کی تعلیم ہوتی تھی، اور اس وقت مذہبی ومسلکی تنازعات اور خطے

میں بدعات وخرافات پھیلے ہوئے تھے،ان کوختم کرنے میں اس نصاب تعلیم کا اہم رول تھا۔

اس میں چار سال کی تعلیم ہوتی تھی۔فقہ،اصول فقہ،اور بعض دوسرے علوم پڑھائے جاتے تھے۔نحو،ادب کے فنون،تفسیر اور حدیث اور اس کے دوسرے علوم شرعیہ کی تعلیم ہوتی تھی۔طلبہ کو اسکالرشپ دیا جاتا تھا،اوران کے رہنے سہنے کا انتظام تھا۔چھ ہزار طلبہ روزانہ اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔اساتذہ کے لیے ہر طرح کے انتظامات تھےاور بہت اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں اوراس کے احاطے میں شاندار لائبریری تھی جس سے طلبہ اوراساتذہ مستفیض ہوتے تھے۔اس یونیورسیٹی کی کامیابی کو دیکھ کر علامہ عساکر جوشام کے مؤرخ ہیں دمشق چھوڑ کر بغداد آگئے تاکہ جامعہ نظامیہ کے دروس سے مستفید ہوں۔یہاں تعلیم دینا کسی استاد کے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔ہراستاد یہاں آکر مدرس بننے کا شیعیت خواہش مند ہوتا تھا۔یہاں استاد کی تعیین کا معیار وہی ہوتا تھا جوآجکل موجودہ یونیورسیٹیوں میں ہوتا ہے۔

دراصل اس یونیورسیٹی کا قیام اس لئے ہوا تھا تاکہ بڑھتی ہوئی شیعیت کے سیلاب کوروکا جاسکےاور ایسا ہی ہوااور یہاں سے ایسے فارغین پیدا کیے،جنھوں نے اس سیلاب کے سامنے بندھ باندھ دیے۔

’’اس کے اولین مقاصد میں ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو بدعات اور خرافات اس وقت پھیل چکے تھے انکو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا تھااورعوام کے سامنے صحیح دین کو پیش کرنا تھا اور صوفیوں کے غلط خیالات کورد کرنا تھااور امر بالمعروف اورنہی عن المنکر کا فریضہ کوبحسن خوبی انجام دینا تھااور دوسرے عصری علوم کی تعلیم بھی مقصد میں شامل تھااور صحیح دین کی تعلیم کورواج دینا تھا تاکہ’’ شیعیت کے وہ افکار جو بہائیوں نے عراق وایران میں پھیلائے تھےاور فاطمیوں نے مصر میں پھیلا رکھے تھےاور جن کی حکومتیں ان جگہوں پر تھیں ان کے سامنے بند باندھ سکیں اور ایسی تعلیم دینی تھی جس سے شافعی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوسکےاور تاکہ سلجوقیوں اور عباسیوں کا اثر ورسوخ اور نفوذ ان جگہوں پر بڑھ سکے‘‘۔(۱۰)

اس نظامی مدرسہ نے ایک عظیم تحریک پیدا کی،تدریسی نظام کوکوفروغ دیااور ایک تحریک کی شکل دی،مدارس کے پرشکوہ عمارات اور دارالاقامے قائم کیے،بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے،اس سے قبل کہیں بھی یہ نظام رائج نہیں تھا،جہاں طلبہ کے لیے بورڈنگ ہو،ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو،اسکالرشپ ملتا ہواور مطالعہ کے لیے لائبریری ہو۔پھر اس نہج پراس علاقے میں اور مدارس قائم کئے گئے۔اس لیے یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اس تحریک نے عالم اسلام میں مدارس کے نظام میں تبدیلی پیدا کردی۔شروع میں تعلیم وتدریس کا نظام

مساجد میں ہوتا تھا۔ طوسی نظام کی فکری تحریک نے مدارس کے نظام میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا اور یہیں سے یونی ورسٹی کا تصور جنم لیا اور علوم وفنون کے دروازے کھلے اور مغرب نے بھی یہیں سے استفادہ کیا اور وہ ہم سے آج آگے نکل گئے ہیں۔

ہندوستان میں نصاب تعلیم اور درس نظامی کا آغاز

یہی تصور ہندوستان میں آیا اور درس نظامی کے نام سے ایک کورس تیار ہوا، جس کے بانی اور مؤسس ملا نظام الدین سہالوی ابن ملا قطب الدین سہالوی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۹۸۸ھ بمطابق ۲۷ مارچ ۱۶۷۷ء میں سہالی میں ہوئی جو ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش ضلع بارہ بنکی کا ایک قصبہ ہے۔ اور ملا نظام الدین سہالوی نے اپنا نصاب بنایا جس کا ملا نظام الدین طوسی کے نصاب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن

''برصغیر میں مدارس کا نظام غزنی سے آئے ہوئے ترکوں کی وساطت سے پہنچا۔ غزنی جو محمود کے زمانے میں اسلامی عجم کا سب بڑا مرکز تھا، دینی علوم کا گہوارہ بن گیا، پنجاب جب سلطنت غزنی میں شامل ہوا تو دارالحکومت کے ماحول سے اس کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ عہد سلاطین میں کم وبیش غزنوی دور کا نصاب تعلیم ہی ہندوستان کے مدارس میں رائج رہا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں نصاب تعلیم میں منقولات کا غلبہ رہا۔ اکبر کے دور میں حدیث کی تدریس کو اہمیت دی گئی، تاہم دینی مدارس میں ''درس نظامی'' کے نام سے ایک نئے نصاب تعلیم کا آغاز ہوا۔ ''درس نظامی میں تیرہ موضوعات کی تقریباً چالیس کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، فقہ، اور اصول فقہ کے ساتھ تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیث میں مشکوۃ المصابیح داخل تھی اور مزید ریاضی اور فلکیات، ہندسہ، طب، تصوف، منطق وفلسفہ کی کتابیں داخل نصاب تھیں۔'' (۱۱)

''سلطان محمود غزنوی تعلیم سے محبت کرنے والے حکمراں تھے، آپ ۳۴۷ھ ۹۹۷ء میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور ایک عظیم اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جو مختلف مراحل اور خاندانوں سے گزرتی ہوئی ۱۸۵۷ء تک باقی رہی اور اس برصغیر کے نظام تعلیم وتربیت میں مسلمان حکمرانوں جیسے خاندان غلامان، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی، خاندان تغلق، لودھی خاندان اور مغلیہ خاندان نے اہم کردار ادا کیا، تعلیمی نظام کو چلانے کے لیے حکومت صرف مالی امداد مہیا کرتی تھی، حکومت طلبہ اور اساتذہ کی مالی ضروریات کا خیال رکھتی تھی، جب کہ اساتذہ تعلیمی تدریسی طریقے اور تعلیمی نصاب اپنی مرضی سے منتخب کرتے تھے۔ حکومت مدارس کے تعلیمی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر تک تمام بادشاہوں نے برصغیر میں علم کی ترقی میں اہم

کردار ادا کیا۔ سلاطین دہلی اور مغلیہ دور میں نظام تعلیم چلانے کے لیے صدر الصدور کے نام سے ایک عہدہ مقرر تھا۔'' (۱۲) ''اور سلطان سکندر لودھی کے دور حکومت میں [۱۴۸۹۔۱۵۵۰ء] تجدیدی کوشش کی گئی اور مذہبی علوم کے مقابلے میں عقلیات کا اضافہ ہوا'' (درس نظامی کا تاریخی پس منظر) ''اکبر [م:۱۶۰۵ء] کے زمانہ میں مذہبی آزادی میں نمایاں ترقی ہوئی اور اس پس منظر میں اس وقت کے مدارس میں شہریت،، معاشیات، فلکیات،، طبعیات، حساب اور طب کے علاوہ موسیقی تک نصاب کا حصہ بنادیا گیا۔ اور اسی دور میں ہندوستان کے مشہور مسلم صوفی اور شاعر حضرت امیر خسرو بھی موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔'' لیکن درس نظامی میں ادب کی کوئی کوئی کتاب شامل نہیں تھی۔

لیکن ''مغل حکمراں اورنگ زیب [م: فروری ۱۷۰۷ء] کے دور میں یوٹرن کی صورت نظر آتی ہے، جب اس بادشاہ کی معاونت سے ملا نظام الدین سہالوی [م: مئی ۱۷۴۸ء] نے لکھنو میں ''فرنگی محل نامی'' جگہ پر اپنا مدرسہ قائم کیا جو فرنگی محل کی نسبت سے تاریخ میں مدرسہ فرنگی محل مشہور رہا۔ اس مدرسہ کے لیے انھوں نے ایک نصاب بنایا۔ جو ان کے نام کی مناسبت سے ''درس نظامی'' کے عنوان سے مشہور ہوا۔'' (۱۳) یہ دراصل مغلوں کے نظام تعلیم میں تبدیلی کی طرف ایک قدم تھا۔

شاہ ولی اللہ کا نصاب تعلیم اور قرآن فہمی

شاہ ولی اللہؒ [پیدائش ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء وفات، ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء] جدید فکر کے بانی ہیں اور ان کے نصاب میں قرآن اور سیرت النبی ﷺ کو بنیادی اہمیت دی گئی اور انھوں نے یونانیوں کی نام نہاد معقولات، فلسفہ، ومنطق کو مسترد کردیا اور حقیقی علوم کے لیے ایک جامع اسکیم تیار کی، جس میں دنیاوی امامت وقیادت بھی ضروری تھی، اس میں نصاب عربی قرآن فہمی اور سیرت النبی سے فیض حاصل کرنے کی کلید ہے، المیہ یہ ہے کہ درس نظامی کی شکل میں نہ صرف ملا نظام الدین اور شاہ ولی اللہؒ کی فکر سے متضاد نصاب مروج ہوگیا بلکہ اس میں عربی زبان کی اہمیت ختم ہوگئی۔'' (۱۴) شاہ ولی اللہ نے اس کام کو آگے بڑھایا جو اصلاح کا کام مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے شروع کیا تھا چونکہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ [۱۵۶۴ء۔۱۶۲۵ء] مسلمانوں کے عروج میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی توجہ مسلمانوں کی خرابیوں کی طرف رہی، اور شاہ ولی اللہ مسلمانوں کے زوال میں پیدا ہوئے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے زوال کے اعتبار سے کیا اور اسی لحاظ سے غور وفکر کیا اور نصاب کی تجدید کی اور کمزوریوں کی نشان دہی کی۔ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کے ترجمے اور اس کی اشاعت اور اس کی

تفہیم کی طرف توجہ دی، جوصدیوں سے نصاب تعلیم سے عنقا ہو چکا تھا اور اس صدی میں اس کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔

جس طرح طوسی نظام تعلیم نے ایک اہم کردار کیا تھا اسی طرح اس درس نظامی نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اور اس کے نفاذ سے علمی وعقلی انقلاب پیدا ہوا اور اس نصاب کو پڑھ کر افراد عہد مغلیہ کو قابل فخر افراد ملے، اسی نصاب کے تعلیم یافتہ اعلیٰ قیادتوں کے مناصب پر فائز ہوئے، اس کا نصاب آٹھ سال پر مشتمل تھا۔ ''ڈاکٹر محمود غازیؒ کہتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں کی بدولت اس نظام تعلیم یا نصاب تعلیم دین و دنیا دونوں کی جامعیت کا آئین دار تھا۔ اس نظام تعلیم نے مجدد الف ثانی جیسے بزرگ بھی پیدا کیے''۔ (۱۵) اور اس نظام تعلیم نے تاج محل کا انجینئر بنایا۔ لیکن ''درس نظامی میں شامل یونانی فلسفہ ومنطق کے بارے میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کی رائے بھی قابل توجہ ہے ''علم کلام وفقہ کا استاذ صرف ونحو کے استاد سے بہتر ہے اور صرف ونحو کا استاد فلسفے کے علوم کے استاد سے بہتر ہے اور کیونکہ فلسفے کے علوم سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے اکثر مسائل بے مقصد لا حاصل بلکہ باطل ہیں۔ اس کے پڑھنے والے جہل مرکب کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' (۱۶)

مغلوں کے زوال کے بعد کی تحریک اور نصاب تعلیم

''استعماری طاقتوں نے ہندوستان میں اپنا پنجہ جمانے کے لیے جہاں سیاسی قوت کو مضبوط کیا وہیں اس نے یہ بات پوری طرح محسوس کرلیا کہ اپنے مقاصد وعزائم کو نافذ کرنے کے لیے ایسا تعلیم نظام نافذ کیا جائے کہ پوری طرح مسلمانوں کو مغلوب اور مقہور بنا کر رکھ دیا جائے چنانچہ لارڈ میکاولے [۲۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء ۲۸ دسمبر ۱۸۵۹ء] نے اپنا نظام تعلیم نافذ کیا اور تعلیمی مقاصد کے لیے تعلیم کا ذریعہ انگریزی کو بنایا۔ دوسرا مقصد یہ تھا حقیقی اسلام کو مسخ کرنا تھا۔ ان کا مقصد تھا ایسی نسل تیار کرنا جو ہمارے نظریات وافکار کے ترجمان ہوں۔'' لارڈ میکاولے ۱۸۳۴ء ہندوستان آیا، گورنر جنرل کی کونسل میں پہلا رکن برائے قانونی امور بنا۔ ۱۸۳۵ء میں ''انگلش ایجوکیشن ایکٹ'' بنایا۔

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر جو آخری مغل بادشاہ تھے اس آخری جنگ میں ان کی شکست کے بعد مسلمانوں کے فکر وعمل میں ایک بھونچال پیدا ہوا اور اس اندھیرے میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ کی تحریک چلائی، سرسید کو یہ تباہی نہیں دیکھی گئی اور انھوں نے قوم کو اتحاد کی دعوت دی اور انھوں نے انگریزوں اور

مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی اور ملت اسلامیہ کو سنوارنے کا بیڑا اٹھایا اور قدیم و جدید کی تعلیم کی باہمی مطابقت کے ساتھ ایک تحریک چلائی اور علامہ شبلیؒ علی گڑھ تحریک کے اولین معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور سرسید کی تعریف کی لیکن سیاسی اعتبار سے مخالف تھے اور تاحیات کانگریس کے حمایت کرتے رہے۔ (۱۷)

علی گڑھ کا قیام

سرسید احمد خان نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی جسے ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی کا درجہ ملا۔ سرسید نے علی گڑھ کی تحریک پیش کر کے اس طبقہ کی نمائندگی کی جو جدید تعلیم کا علمبردار تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ سقوط دہلی کے بعد مسلمانوں کے اندر جدید تعلیم کو روشناس کر کے ان کی ترقی کی راہیں استوار کی جاسکتی ہیں۔'' رشید احمد صدیقیؒ لکھتے ہیں کہ اس تحریک کے مقاصد میں مذہب، اور ہندو مسلم تعلقات، انگریز اور انگریزی حکومت، انگریزی زبان، مغرب کا اثر اور تقاضے وغیرہ چند پہلو شامل تھے۔'' (۱۸) سرسید کے الفاظ میں '' میں ہندوستانیوں کی ایسی تعلیم چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے حقوق حاصل ہونے کی قدرت ہو جائے۔ اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً وکرھاً ہم کو دلائے گی۔'' (۱۹)

دیوبند کا قیام اور اس کے محرکات

سرسید کی اس تحریک کے ساتھ ساتھ لارڈ میکاولے نے اپنا نصاب تیار کر کے انگریزی تعلیم کو فروغ دیا اور اس نے دینی نصاب اور دینی تعلیم کا مذاق اڑایا، اس انگریزی فکر نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کی اور اور مغربی اور مشرقی کی تعلیم پر ایک بحث شروع ہوگئی۔ اور ہر فریق اپنے موقف پر جما رہا۔ جس کے نتیجہ میں تعلیم اور نصاب تعلیم کے سلسلے میں واضح طور پر تقسیم پیدا ہوگئی۔ اور مسلمانوں کو اسلامی احکامات کی اصل روح سے باخبر رکھا جائے، اور شاہ ولی اللہ کی تحریک سے متاثر لوگوں برطانوی ہند میں دینی مراکز قائم کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء مطابق ۱۵ محرالحرام ۱۲۸۳ھ کو ایک قصبے نانوتہ کے حضرت قاسم نانوتوی نے مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ کا آغاز مسجد چھتہ دیوبند کے انار کے درخت کے نیچے ایک معلم اور ایک استاذ سے شروع ہوا، استاذ محمود اور شاگرد محمود تھے۔ (۲۱)

ندوۃ العلماء کا قیام

’’دیوبند کے نصاب میں درس نظامی کا اتباع کرتے ہوئے زمانہ کے لحاظ سے دوسرے مضامین کا اضافہ کیا، ان میں جلالین اور بیضاوی اور حدیث میں مشکاۃ المصابیح کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ ریاضی ، ہندسہ، اور علم ہیئت کو شامل کیا۔مولانا نانوتوی ؒ نے حالات کے لحاظ سے درس نظامی میں یہ اضافہ کیا۔‘‘ (۲۲)اس طرح ملک میں دوفکری دھاراؤں کی تحریک چل پڑی اوران دونوں تحریکوں کا ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں تبدیلی کے اثرات نمایاں ہونا شروع ہوگئے۔بات یہاں پرختم نہیں ہوجاتی ہے ان دونوں تحریکوں کے صاحب فکرافراد ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کا سلسلہ رہتا تھا اور دیوبند کے نصاب حالات کے لحاظ سے دوسرے عصری علوم کو داخل نصاب کیا گیا۔(۲۳الف) لیکن قدیم وجدید کی تحریکوں میں خلیج بڑھتی گئی۔جدت پسند اور قدامت پسند کے درمیاں مسلکی اختلافات نے طول پکڑ لیا اس لیے اب موجودہ صورت حال میں اصلاح اوراس میں تبدیلی اور آپسی نزاع کا خاتمہ اور جدید قدیم طبقوں میں اعتماد کو قائم کیا جائے اور آپس کے مسلکی جھگڑے کو ختم کیا جائے۔صرف ایک نئی درس گاہ کے قیام سے آگے بات نہیں بن سکتی تھی اس لیے نئے نصاب کے مطابق تعلیم کی بھی ضرورت تھی۔چنانچہ نے ایک تحریک نے جنم لیا اوراس تحریک کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا اور علامہ شبلی ؒ نے دستور العمل پیش کیا اوراس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی۔(۲۳ب)’’نئے نصاب کے مطابق ۱۸۹۶ء میں درس گاہ قائم ہوگئی،مگر اس کے قیام کے آٹھ سال کے بعد یعنی ۱۹۰۴ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جا تا رہا جو عام درس گاہوں میں پڑھایا جا تا تھا۔جب علامہ شبلیؒ ۱۹۰۴ء میں معتمد تعلیم (ندوہ میں) ہوئے تو انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ ہوا اور عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجراء ہوا،شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود ان کو نافذ کیا۔‘‘(۲۳ج) ندوہ کے قیام کے دو بنیادی مقاصد تھے: موجودہ نصاب تعلیم میں تبدیلی اور باہمی نزاع کا خاتمہ۔اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلیؒ درس نظامی سے مطمئن نہیں تھے اور ایک اہم تبدیلی چاہتے تھے۔’’مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں’’امرتسر میں علماء کی مجلس خاص میں نصاب کے مسئلہ پر نہایت طول طویل بحثیں ہوئیں اور بالآخر مولانا کی جیت ہوئی اور کثرت رائے سے درس نظامی میں ترمیم منظور ہوئی۔‘‘((۲۳د) اسی طرح وہ جہاں درس نظامی میں تبدیلی چاہتے تھے قرآن کی تعلیم پر مطمئن نہیں تھے، اسی لیے قرآن اور علوم القرآن کو داخل نصاب کرانا چاہتے تھے۔’’مولانا کی یہ کوشش ان کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نصاب میں قرآن پاک اور علوم

القرآن کو درس میں مستقل طور پر داخل کرنا چاہتے تھے اسی لیے امام باقلانی کی اعجاز القرآن جب مصر میں چھپ کر آئی تو اس کو فوراً درس میں داخل کر دیا۔ اور قرآن پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخل نصاب کیا۔''(۲۳ھ) اس طرح وہ چاہتے تھے کی قرآن فہمی کا دروازہ طلبہ کے لیے کھلے۔ یہ درس نظامی میں ایک زبردست تبدیلی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کسی منصوبہ بند مہم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے سیاسی اور اصولی محرکات تھے جو علی گڑھ کالج کے سیاسی اور نظریاتی موقف سے اختلاف کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔(۲۴) اس کے قیام کا پس منظر یہ ہے'' سرسید نے علی گڑھ میں اسکول کی بنیاد رکھ دی تھی، اسی دوران قومی افق پر قومی تعلیم کے نظریے نے زور پکڑا۔ تحریک خلافت کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی علامتی شناخت کا تحفظ و شناخت برقرار رکھا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، حکیم اجمل خان، اور مختار انصاری اس تحریک کے روح رواں تھے، دوسری اہم تحریک عدم تعاون تھی جس کی رہ نمائی گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی اور اس کا مقصد برطانیہ سے عدم تعاون تھا۔ مسلمان اور ہندوؤں نے باہمی تعاون کا فیصلہ کیا تا کہ دونوں تحریکیں بھر پور انداز میں کام کر سکیں۔ گاندھی نے تحریک خلافت کی حمایت کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا اور تحریک خلافت کے رہ نما تحریک عدم کے حامی بن گئے۔ تحریک عدم تعاون میں ہندوستانیوں سے کہا گیا کہ وہ حکومتی نوکریاں، ادارے اور عہدے چھوڑ دیں اور بدیسی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں۔ تعلیمی حوالے سے اس اپیل کا مطلب یہ تھا کہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جو قومی تعلیم کو فروغ دیں۔ اس اپیل کے نتیجے میں قوم پرست جمع ہو گئے، ان کی ساری توجہ تعلیمی ادارے قائم کرنے پر مرکوز ہوگئی۔ ان اداروں کا نمایاں وصف یہ تھا کہ حکومت سے کسی بھی قسم کی امداد نہیں لیں گے۔

تحریک عدم تعاون کے اعلان کے بعد علی گڑھ کالج کیمپس میں ایک طرح کی بے چینی پائی جاتی تھی، جہاں انقلابی قوم پرست طلبہ کا ایک گروہ جس کی قیادت محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ چاہتا تھا کہ علی گڑھ بھی انقلابی اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف اپنا کردار ادا کرے۔ انھوں نے علی گڑھ کے ٹرسٹیز سے مطالبہ کیا کہ وہ برطانوی حکومت سے فنڈ لینا بند کر دیں۔ اس تجویز کو علی گڑھ انتظامیہ کی اکثریت نے رد کر دیا کیونکہ حکومتی امداد ادارے کو چلانے کے لیے نہایت اہم تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم پرست طلباء اپنی مادر علمی سے الگ ہو گئے اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسلم نیشنل یونی ورسیٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے قیام کا اعلان کیا۔ جامعہ کے سرخیلوں میں محمد علی

جوہر، حکیم اجمل خان۔ ڈاکٹر مختار انصاری اور عبدالمجید خواجہ تھے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان حالات میں مختلف عقائد کے گروہ قوم پرستی کے جھنڈے تلے اکھٹے ہوگئے تھے۔ اس میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ جامعہ کی بنیاد میں اپنی بیماری کے باوجود شریک تھے اور ان کی تقریر مولانا شبیر عثمانیؒ نے پڑھی۔ گاندھی جی نے بھی جامعہ کی اعانت کی۔ یہاں کا نصاب حقیقی زندگی کی مہارتوں سے مربوط تھا جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ طلبہ مذہبی افکار سے بھی آ گاہی حاصل کرتے تھے‘ (۲۵)

ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے ’’مسلمان حکمراں نے عوام کی تعلیم وتربیت کو ریاستی ذمہ داری سمجھا اور بھر پور طریقے سے سرکاری خزانے سے فروغ علم کے لیے روپیہ صرف کیا، مدرسین کے لیے تنخواہیں، انعامات اور پنشن کے سلسلے کو یقینی بنایا اور مدارس اور مکاتب کے طالب علموں کے لئے اسکالرشپس جاری کیے۔‘‘ (۲۶) لیکن انگریزوں کے داخلے کے بعد آہستہ آہستہ تعلیم کے میدان میں گراوٹ آتی گئی اور ایک خاص طبقہ نے انگریزوں کے تعلیمی پروگرام سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اشرافیہ کا طبقہ ہی ان کے اداروں سے مستفید ہوکر ان کی خدمت میں لگ گیا۔ مسلمان حکمرانوں کے نظامِ تعلیم کے لیے سب کے لیے درروازے کھلے ہوئے تھے لیکن ان کی حکمرانی شروع ہوتے ہی عام مسلمانوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند ہوگئے۔

ملا نظام الدین کے تعلیمی نظام اور مغلوں کے لیے نظام میں فرق

محمود غزنوی [متوفی ۱۰۳۰] کے زمانہ میں ہندوستان میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس میں مذہبی تعلیم کا زیادہ حصہ تھا۔ (اس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف، کلام، عربی ادب، نحو، اور منطق کے مضامین شامل تھے) لیکن سکندر لودھی [۱۷ جولائی ۱۴۵۸ء۔ ۲۱ نومبر ۱۵۱۷ء] کے دور میں تجدیدی کوشش کی گئی اور مذہبی علوم کے مقابلے میں عقلیات کا اضافہ کیا گیا۔ اکبر [م: ۱۶۰۵] کے زمانہ میں زبردست مذہبی آزادی دی گئی اور طب اور موسیقی کو نصاب تعلیم کا حصہ قرار دیا گیا۔ اس تعلیم نصاب میں دین و دنیا دونوں کی تعلیم تھی۔ اسی جامعیت کی وجہ سے مجدد الف ثانی جیسے بزرگ پیدا ہوئے اور اکبر کے دور میں میر فتح اللہ شیراز (ایران) سے [۲۵ اپریل ۱۸۱۴ء۔ ۲۰ فروری ۱۸۹۵ء] ہندوستان آئے، اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا۔ انھوں نے سابق نصاب میں کچھ معقولی کتابوں کے اضافے کئے لیکن اکبر کے برخلاف اورنگ زیب عالمگیر [م: فروری ۱۷۰۷م] کے دور میں ملا نظام الدین سہالوی [م: ۱۷۴۸م] نے لکھنو میں فرنگی محل نامی جگہ قائم کیا اور اس مدرسہ کے لیے نصاب تعلیم بنایا جو درس نظامی کے نام سے مشہور ہوا اس طرح پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں

رائج نصاب سے بالکل مختلف تھا۔ ان کا مرتب کردہ نصاب یہ تھا:تفسیر جلالین سیوطی،جلال الدین محلی، بیضاوی۔ حدیث؛مشکاۃ المصابیح۔فقہ:ہدایہ،شرح وقایہ(ثانی)۔ اصول فقہ؛ توضیح وتلویح۔نور الانوار،مسلم الثبوت۔نحو:نحومیر،شرح ماۃ عامل،ہدایۃ النحو ، کافیہ،شرح جامی۔صرف: میزان،صرف میر،پنج گنج،شافیہ۔ بلاغت:مختصر المعانی۔مطول۔کلام:شرح عقائد نسفی، شرحمواقف۔رسالہ میر زاہد۔منطق:قطبی،میر قطبی، جرجانی، کبری،ایساغوجی،تفتازانی،شرح تھذیب۔فلسفہ،حکمت: شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ میذی، صدرا،شمس بازغہ۔ریاضی: خلاصہ الحساب،تحریر الاقدس،تشریح الافلاک،رسالہ قوشجیہ،شرح چغمینی۔(۲۷)اس سے یہ بات کھل سامنے آتی ہے کہ درس نظامی نے قرآن فہمی کے لیے قرآن کی تفاسیر کو داخل نصاب کیا لیکن اس سے پہلے اس بات کی آزادی تھی کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے کوئی متعین تفسیر کی کتاب داخل نصاب نہیں تھی۔شاہ ولی اللہؒ کے مرتب کردہ نصاب میں قرآن اور سیرت النبی کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی اور یونانیوں کی نام نہاد معقولات، فلسفہ ومنطق کو مسترد کرکے حقیقی دینی علوم کے فروغ کی ایک جامع اسکیم تیار کی تھی۔(۲۸)

مزید یہ کہ ملا نظام الدین سہالوی کے مرتب کردہ نصاب سے عہد مغلیہ میں سول سروس کا نظام کہلاتا تھا اس نصاب سے مسلمانوں میں عقلی ونظریاتی شعور پیدا ہوا۔اس نصاب کا مقصد ہی تھا کہ مسلمانوں کے اندر علمی اور عقلی انقلاب پیدا ہو۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھنوی ناظم ندوۃ العلماء نے ہندوستان کے قدیم نصاب کے بارے میں مضمون لکھا ہے جسے انھوں نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔(۲۹)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا درس نظامی پر تبصرہ(۳۰)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ [یکم اکتوبر۱۸۹۲ء۔۵ جون ۱۹۵۶ء] ضلع نالندہ کے ایک چھوٹے گاؤں گیلانی میں پیدا ہوئے۔گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ خلیلیہ ٹونک راجستھان میں داخل ہوئے، یہاں انھوں نے منطق، فقہ، ادب، فلکیات اور ریاضی کا علم حاصل کیا۔اس کے بعد دارالعلوم دیوبند پہنچے اور مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، علامہ سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثانیؒ جیسے جید علماء سے استفادہ کا موقع ملا۔دارالعلوم سے فراغت کے بعد بطور استاذ آپ کی بحالی ہوگئی۔آپ تحقیق کے میدان میں علوم قرآن، علوم حدیث، سیرت، سوانح، تعلیم، تاریخ، معاشیات اور بعض دیگر موضوعات کو اپنا موضوع بنایا۔وہ ایک محقق اور مصنف تھے۔۱۳۳۸ھ کو عثمانیہ یونیورسیٹی حیدرآباد میں شعبہ دینیات کے استاد مقرر ہوئے

اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبے کے صدر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ درس نظامی کے بارے میں رقم طراز ہیں: ''مسلمانوں کے چند اہم کارناموں میں ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی وحدت کو بھی سمجھتا ہوں، تیرہ سو سال کی تاریخ ان کی گواہ ہے کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ تھے جو علماء کہلاتے تھے اور وہی علماء تھے جنہیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، فلسفی بھی پیدا ہو رہے تھے اور ریاضی داں بھی، حکیم بھی، مہندس بھی، مفسر بھی، طبیب بھی، فقیہ بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، صوفی بھی، لیکن یہ کیسی عجیب بات تھی کہ تعلیم کا ایک نظام تھا جس سے یہ ساری مختلف پیداوار یں نکل رہی تھیں۔'' (۳۱)

قدیم نظامی نصاب میں عربی ادب کی کمی پر کہ ''اس کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا'' (۳۲) اس اعتراض کا جواب دیا ہے مولاناؒ عربی زبان کے مسئلہ کو چھیڑا ہے اور عربی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''عربی زبان اسلام کے بعد دو مستقل حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک حصہ اس کا وہ ہے جس میں قرآن، حدیث اور اسلامی ادبیات محفوظ ہیں، اور دوسرا وہ ہے جس میں جاہلی شعراء یا عہد اسلامی کے انشا پردازوں یا شعر کہنے والوں کا کلام ہے۔ (۳۳) اور یہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی عربی کو مشق اور مزاولت سے طلبہ اس پر دسترس حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پر قابو پانے کے بعد دوسرے جاہلی دواوین اور کلام اور ادب پر اس کے مقابلہ میں دسترس حاصل ہو اس لئے کہ اس حصہ میں غیر معروف تراکیب استعمال ہوئی ہیں، محض قرآن وحدیث، فقہ وکلام وتصوف والی عربی سے اس جاہلی عربی کو قابو میں لانا تقریباً ناممکن ہے۔'' (۳۴) انھوں نے جاہلی ادب کو یہ کہہ کر خارج کر دیا ہے کہ ''ایک شخص جاہلیت کے اشعار میں سے کسی ایک شعر کا مطلب بھی آپ سے نہ بیان کر سکے لیکن اسی پر قرآن کی جس آیت، حدیث کے جس ٹکڑے، فقہ کی جس عبارت کو آپ پیش کریں گے بغیر کسی دقت کے اس کے معانی ومطالب کو آپ کے سامنے بیان کرتا چلا جائے گا۔'' (۳۵) اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جاہلی ادب قرآن فہمی کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن وہ قرآن فہمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ '' قرآن فہمی کی جو یہ دوسری صورت ہے درس کے ذریعہ اس کا احاطہ ناممکن اور سیدھے سادے مطلب کے لیے کوئی چھوٹی موٹی سی تفسیر جلالین، مدارک، بیضاوی کافی ہے۔ (۳۶) گویا ان کے نزدیک قرآن کو سمجھنے کے لیے یہی دو تین کتابیں کافی ہیں بلکہ اس کے دفاع میں یہ بات بھی لکھتے ہیں ''کہا جاتا ہے کہ قرآن کے متعلق اس نصاب میں صرف یہی ایک کتاب داخل ہے جس کے الفاظ قریب قرآنی الفاظ کے ہم عدد ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی اور جملوں کا

سادہ مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو اس کے لیے جلالین کیا میرے نزدیک تو صرف قرآن کا سادہ ترجمہ بھی کافی ہے، بلکہ جلالین دراصل قرآن کے عربی ترجمہ ہی کی ایک شکل ہے، مشکل الفاظ مشکل ترکیبوں کو اس میں حل کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں قصہ طلب بات ہوتی ہے تو اجمالاً اس کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے اس حد تک یقیناً جلالین کافی ہے۔'' (۳۷)

قرآن فہمی کے لیے ایک نئے اسکول کی بنیاد

اس تاریخی جائزہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد قرآن کی تعلیم اور اس پر تدبر اور قرآن فہمی اور براہ راست قرآن کو سمجھنے کو بنیاد بنا کر کوئی نصاب تیار نہیں کیا جاسکا اور قرآن کو کسی بھی تفسیر کی کتاب سے سمجھا جاسکتا ہے براہِ راست قرآن کو سمجھنے کے راستہ کو بہت آسانی سے بند کر دیا گیا۔ اس بات کا اعتراف مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب میں کرتے ہیں کہ قرآن کو کسی بھی ترجمہ سے سمجھا جاسکتا ہے اور جلالین بھی ترجمہ کی ایک شکل ہے اور قرآن کو اس سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جو مولانا حمیدالدین فراہیؒ [۱۸ نومبر ۱۸۶۳ء۔۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء] کے شاگردوں میں سے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے جاہلی ادب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ بیضاوی اور جلالین اس بات کے لیے کافی ہے۔ حالاں کہ قرآن کا نزول اور اس کی زبان کا نزول کلام عرب کے اسلوب میں اترا ہے اور عرب کی زبان میں اترا ہے، اس لیے اس زبان کو سمجھنے کے لیے اس زبان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔'' ابن ابناری کہتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین قرآن کے غریب الفاظ اور مشکل الفاظ کو سمجھنے کے لئے اشعار عرب کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہیں سے سمجھتے تھے۔'' ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کے ایسے الفاظ جو نہ سمجھ میں آئے تو اشعار عرب کی طرف رجوع کرو اور وہاں تلاش کرو۔ درس نظامی میں اس کمی کو علامہ شبلیؒ اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں اپنی کوشش کے ذریعہ ندوہ میں جب تک رہے اس منہج کو جاری رہنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہا اور وہی درس نظامی کی طرح تفسیری کتاب پڑھانے کا رواج چل پڑا۔ پھر اس کے بعد امام حمیدالدین فراہی نے قرآن فہمی کے راستوں کو ہموار کیا اور اس میدان میں تجدیدی کارنامے انجام دیئے اور قرآن فہمی کی بنیاد رکھی اور انھوں نے ایک نئے نصاب تعلیم بنیاد رکھی جو درس نظامی سے بالکل مختلف تھا۔ نحو وصرف اور علم بلاغت کو ایک تجدیدی شکل دینے کی کوشش کی۔ قرآن فہمی کے اصول بتائے اور عام روایات سے ہٹ کر قرآن کی تعلیم کے لیے اپنا منہج متعین کیا اور عملی طور پر اس پر عمل کر کے دکھایا۔ وہ اپنا عظیم الشان کارنامہ قرآن فہمی اور تعلیم کے

سلسلہ میں پورا کر کے امت کے حوالہ کر کے چلے گئے۔

اس کے ساتھ ہی انھوں قرآن فہمی کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک ٹیم بنائی اور ایک جماعت کی تشکیل دی۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ میں ایک ٹیم تیار کی اور ایک نئی نسل کی تیاری میں لگ گئے اور قرآن فہمی کی تحریک جس کا آغاز ہوا تھا ہنوز اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس کے فروغ میں اس کے فارغ شدہ نو نہالوں نے فکرِ فراہی کے قرآن فہمی کی تحریک کو زندہ جاوید بنا دیا ہے لیکن ابھی امام فراہیؒ کی کتابوں پر ریسرچ کا کام ابھی تک نامکمل ہے بلکہ اس کا سلسلہ جاری ہے ان کے مسودات تو تقریباً منظر پر آ گئے ہیں لیکن ان کے مسودات پر قابل قدر تحقیق کا کام باقی ہے۔ بہت سی بحثیں ایسی ہیں جو تشنہ ہیں، جن کو تشنہ بام کرنے کی ضرورت ہے اور عالمی پیمانہ پر اس کی تشہیر کی ذمہ داری ان کے فکری حاملین پر عائد ہوتی ہے۔

اسی طرح امام فراہی نے اپنا نصاب تیار کیا جو درس نظامی کے نصاب سے یکسر مختلف تھا۔ اس تعلیم میں براہ راست قرآن فہمی کے اصول وضابطے پر مبنی نصاب تیار ہوا۔ امام فراہیؒ نے اپنی مجتہدانہ فکر پر مبنی نصاب تعلیم تیار کیا۔ ''مولانا فراہیؒ نے قرآن فہمی کے لیے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور وہ قرآن فہمی کے لیے تدبر وتفکر کو بنیاد قرار دیا۔ اور تدبر وتفکر کے نتیجہ میں قرآن کا نظم اخذ ہوتا ہے اور نظمِ قرآن میں دین کی ساری حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کے نظم ہی سے تفسیر کی ساری گرہیں کھل سکتی ہیں۔ قرآن کی تدریس کا طریقہ بھی انھوں نے اسی طرح متعین کیا کہ کسی تفسیر کو سامنے رکھے بغیر براہ راست قرآن کا مطالعہ کیا جائے اس سے قرآن کی حکمتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ نظم قرآن پر ایک مستقل کتاب ''نظام القرآن'' کے نام سے لکھی۔

مولانا فراہیؒ نے تدریس قرآن کے اس مروجہ طریقہ کو بدل دیا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا، اس طریقہ تعلیم اور قرآن پر تدبر اور تفکر کے منہج کو علامہ شبلیؒ نے سراہا اور ندوۃ العلماء میں اس نہج پر طلبہ واساتذہ کو درس دینے کے لیے بلایا تھا تاکہ قرآن کا درس تحقیق کے ساتھ ہو اور سرسری نہ ہو۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''اس عظیم المرتبت کام کے لیے اپنے بھائی حمید الدین فراہیؒ کو قرآن پڑھانے کے لیے بلایا، چنانچہ دو سال تک اپنی تعطیل میں آ کر قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔'' (۳۸)

اس فکر نے ایسی تحریک پیدا کی جو فہم قرآن اور تدبر قرآن کے راستہ میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ اور تحقیق وتدبر کی راہ میں ایک زبردست مہمیز کام کر گئی۔ مولانا فراہیؒ نے ایسے طریقۂ تدریس کی ترویج کا کام کیا جس سے عربی سکھانے کا راستہ جو مشکل تھا، وہ سائنٹفک اور سہل ترین ہو گیا، جبکہ اس سے قبل عربی سیکھنے میں سالہا

سال لگتے تھے، اب صرف دو سال کی تعلیم سے نحو وصرف کی تعلیم از بر ہو جاتی ہے، اور انھوں نے اسباق النحو کے نام سے نحو وصرف کی دو کتابیں لکھیں جن کی تعلیم کے بعد نحو وصرف کے سارے عقدے کھل جاتے ہیں مروجہ نحو صرف کی ضخیم کتابوں پر یہ کتابیں اس اعتبار سے حاوی، آسان اور سائنٹفک ہیں کہ عربی زبان سیکھنے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔(۳۹)

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اپنے نصاب کی بنیاد ان الفاظ پر رکھی ہے:''اصل مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔

انتظام تعلیم میں یہ مدرسہ (الف) قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتنا (ب) اصل علم وقابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کتب کو الاقرآن مجید ومتون حدیث (ج) درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع وروحانیت اسلام (د) آسان نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت۔(ہ) کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ''۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے مولانا فراہیؒ کے ان افکار کی روشنی میں یہ تشریح کی:

''مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ غریبانہ و مذہبی زندگی بسر کریں، اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں۔ کفایت پر اکتفا کریں۔(۲) اس مدرسہ کو غرباء مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے، سرکاری اثر سے دور رکھا جائے۔ (۳) قرآن مجید کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث وفقہ پر زور دیا جائے۔ منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں۔ ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے، حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو۔ فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو۔ تکفیر و تفسیق کا ولولہ نہ ابھرے۔ نحو کی تعلیم ہو، فنون کی تعلیم میں امہات فن پیش نظر رہیں اور لکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ حصول معاش کے لیے صنعت کی تعلیم دی جائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔(۴) یہ مدرسہ اہل السنّت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو۔ یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں۔ ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر شیر وشکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں۔''(۴۰)

مولانا مودودیؒ اور نصاب تعلیم

چوں کہ جامعۃ الفلاح کا نصاب تعلیم فکر فراہیؒ اور مولانا مودودیؒ کے پیش کردہ نصاب تعلیم سے مرکب ہے اس لیے مولانا مودودیؒ کی تعلیمی فکر کو سمجھنا اور اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے بعد مسلمان نئی نسل کے اندر تعلیمی بیداری پیدا ہوئی اور اس تحریک کی بنیاد مادیت اور ترقی پر تھی، اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ کی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی جس کا خمیازہ ہندوستانی مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا نقصان معاشی نقصان تھا، سرسید نے اس معاشی نقصان کا حل یہ سوچا کہ مسلمانوں کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت ہے اس کو ختم کیا جائے اور ان کے شانہ بہ شانہ مل کر علم کے میدان میں اس معاشی جنگ کا مقابلہ کیا جائے۔ اس طرح قوم کے اندر خوشحالی آئے گی۔ اور وہ ہے تعلیم کا حصول۔

اور دوسری اہم بات یہ کہ علی گڑھ کی بنیاد فکری طور پر عقلیت پر تھی اور روایتی تعلیم کو انھوں نے رد کر دیا۔ اور قرآن پاک کی تشریح عقلی دلائل کی روشنی میں کی۔ ڈاکٹر ابوسلیمان شاہ جہاں پوری (اصل نام تصدق حسین خان)[۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء۔] کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے، ۱۵۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی، فکر، فلسفے، سیاست اور ادب پر اتنا وقیع کام کیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ وہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ ''انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات کو اپنی تحریروں میں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ صدی کی بے دینی مذہبی بے راہ روی، بدعقیدگی اور مذہب بیزاری کی اصل سرسید احمد خان کے نظریات تھے۔ سرسید کے دو دشمن تھے، ایک انگریز کے دشمن، اور برصغیر کی آزادی کے خواہش منداور دوسرے علمائے دین۔ دراصل علمائے دین ہی انگریزی حکومت کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث میں، ادب کے سنجیدہ مضامین میں، تمثیلوں اور تجربوں میں انھوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔'' (۴۱) اسی طرح مولانا حالی بھی سرسید کے بڑے خیر خواہ تھے لیکن انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات پر نکتہ چینی کی ہے خصوصاً قرآن مجید کی تفسیر پر۔ اور اسی طرح علامہ شبلیؒ بھی ان کے خیالات اور نظریات کی کھل کر مخالفت کی، گرچہ وہ ان کے قریبی ساتھی تھے۔ (۴۲) سرسید عربی زبان کی تعلیم کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور کہا کرتے تھے عربی ہماری مذہبی زبان نہیں ہے۔ یہ قرآن کی زبان ہے اور قرآن پڑھ لینا کافی ہے۔ اس پر علامہ شبلیؒ نے سخت نقطہ چینی کی ہے۔

مولانا مودودیؒ اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہوئے اور بہت ہی قلق ہوا اور وہ اپنے جذبات کا

اظہار اس طرح کرتے ہیں: ’’علی گڑھ سے اٹھنے والی نسل اسلامی روایات سے دور نکل رہی تھے اور صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے فارغین میں بے راہ روی پیدا ہوئی اور الحاد کی طرف رجحان بڑھتا گیا اور قیام کے دن یہ نہیں سوچا گیا کہ کس قسم کی یونی ورسٹی ہو یہاں کے طلبہ اور عام طلبہ اور سرکاری یونی ورسٹی کے طلبہ میں کوئی فرق نہیں تھا، اسلامی ذہنیت مفقود تھا، اسلامی اسپرٹ، اسلامی طرز عمل مفقود تھا، یہ لوگ اسلامی روح سے ناواقف تھے، ان کے اندر مذہب کی طرف سرد مہری ہی نہیں نفرت تھی اور تشکیک کی حد سے نکل کر انکار کے مقام تک پہنچ گئے۔‘‘

مولانا مودودیؒ نے ایک ہمہ گیر اور فکر انگیز تعلیم کا مسودہ پیش کیا اور جدید وقدیم کو ایک سنگم بنا کر پیش کیا۔ اور قرآن فہمی کو نصاب تعلیم سے جوڑ کر بتایا کہ تمام علوم کو چاہے دینی ہو یا دنیوی ہو تمام کا رشتہ قرآن کی تعلیمات سے جوڑ کر پڑھایا جائے۔ یہ ایسا فکر انگیز خاکہ تھا جو کسی بھی نصب العین میں موجود نہیں تھا۔ وہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اہمیت پر اور اس کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ موجودہ تعلیم پر سخت تنقید کرتے ہیں کہ یہ ناخدا شناس تعلیم کی کوکھ سے جو معاشرہ بنتا ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں جو اثرات چھوڑتا ہے وہ دراصل انسانی تمدن پر اور اس ناخدا شناس تہذیب وتمدن کے انسانی زندگی میں جو اثرات ڈالتا ہے وہ سب پر واضح ہے۔

نصاب جو امامت کا ضامن ہو

نصاب تعلیم کا رشتہ امامت سے جوڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ’’امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا، انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔‘‘ (۴۴) اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ ’’اسے سمع، بصر اور فواد تین چیزیں ایسی دی گئیں ہیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی بہ نسبت کم تر دی گئی ہیں اس لیے وہ اس بات کا اہل ہوا جو دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے۔ (۴۵) پھر مولانا کہتے ہیں کہ کلام الٰہی کے مطابق سمع، بصر اور فواد کا مفہوم یہ ہوتا ہے ان تینوں سے معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور تینوں سے مل کر علم بنتا ہے۔ اور ان سے اتنی قابلیت اور قوت ملتی ہے کہ مخلوقات ارضی پر خلافت کرتا ہے جو ان سے زیادہ کام لیتا ہے وہ ان کے تابع ہو جاتے ہیں اور جو انھیں کام نہیں لیتے ہیں وہ امامت سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جب ان تینوں قوتوں سے معلومات اور مشاہدات اخذ کرتا رہتا ہے وہ دنیا کی امامت کرتا ہے اور جوں ہی ان قوتوں کے استعمال میں کوتاہی برتتا ہے وہ قیادت کے منصب سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ دراصل اکتساب علم کا مادہ اور نتائج اخذ کرنے کا مادہ موجود ہوتا ہے وہ قیادت کے منصب

پر فائز رہتا ہے۔(۴۶)مزید وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی سنت ہے کوئی بھی گروہ ہو خدا شناس یا نا خدا شناس دونوں ہی گروہ اللہ کے یہاں اس بات کی کوئی رو رعایت نہیں ہوتی ہے جو بھی جتنا ان قوتوں کو استعمال میں آگے ہوگا اسے قیادت کی رسی ملے گی، اور مغرب اسی لیے ہم سے تعلیمی میدان میں آگے ہے کہ اس نے ان تینوں کو قوتوں کو ہر طریقے سے استعمال کیا ہے۔پھر وہ کہتے ہیں:

ناخدا شناسی کے گروہ کی امامت کے نتائج جو ہوں گے یا سامنے آئیں گے اور انسانیت کا جو بہاؤ ہوگا وہ اپنی حکمت عملی سے دنیا کے افکار، اخلاق اور تمدن پر چھائیں گے، خدا نا شناسی کے نقطۂ نظر پر مبنی ہو تو سارے اخلاق کے اصول میں ان کے مطابق ہوں گے اور زندگی کی کنجی ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور زندگی کی گاڑی ان کے اصولوں پر چلے گی، رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں۔حاکمانہ اختیارات ان کے پاس ہوں گے۔(۴۷)

موجودہ نصاب میں تبدیلی کی ضرورت

اس لیے اس امامت کو تبدیل کرنے کے لیے انقلاب تعلیم کی ضرورت ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ''خدا شناسی کی امامت کو ختم کرنے کے لیے خدا شناسی کی امامت کو قائم کرنے کے لیے جد وجہد کرنی ہوگی۔دوسرا اہم قدم یہ کہ اس پرانے نصاب تعلیم کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ امامت کا انقلاب برپا کر سکے۔اور یہ ناخدا شناس نصاب میں اسلامیات کی تعلیم سے ایسے افراد کی تیاری ہوگی جو ناخدا ناشناس کی ہی ٹیم بنے گی، چاہے ان اداروں کا مسلم ادارے ہی کیوں نہ ہوں۔یہ بھی کہ اصلاحِ تعلیم کے نام سے اسلامی علوم کے ساتھ نئے علوم کا اضافہ بھی امامت میں تبدیلی کا راستہ نہیں ہوسکتا ہے اس لئے اس وقت جو عصری علوم مدون ہیں وہ ناخدا شناس نظریات پر مبنی اصولوں پر تیار کردہ ہیں۔

پھر وہ کہتے ہیں:'' نئے نظام میں دینیات کے لیے الگ کورس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ سارے کورس کو دینیات میں تبدیل کر دینا چاہیے۔''(۴۸)

''ہر طالب علم کو علم کا مجموعہ بنانے اور تکمیل کے بعد اور جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جواب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اختصاص کے لئے تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سال بہ سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔''

اور تمام آٹھ سال یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچہ کو دنیا، انسان اور زندگی کے متعلق جتنی

معلومات کم از کم حاصل ہونی چاہیے وہ اسے خالص اسلامی نقطہ نظر سے دی جائیں۔'' (۴۹)

علوم کے تمام شعبوں میں قرآن سے استفادہ کیا جائے

نصاب تعلیم میں اصل محور قرآن فہمی کو بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں:

یہ کورس آٹھ سال یا دس سال کا ہو۔ اور ایک بچہ کو خالص دینی نقطۂ نظر سے تعلیم دی جائے۔ مزید سائنس کے شاخوں کے لیے قرآن کی رہنمائی حاصل کی جائے، اور آثار فطرت کا مزید مشاہدہ اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی ان ہی خطوط پر کیا جائے، جو قرآن نے بھیجا ہے۔ اور جو علوم دینی کہلاتے ہیں ان کے لیے الگ الگ شعبے قائم کئے جائیں، اور تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ یہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی، جو آجکل دی جارہی ہے بلکہ تعلیم حاصل کرنے والوں اور دینے والوں کے سامنے ایک واضح مقصد زندگی ہوگا۔ اور وہ مسلک خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لیے جہاد کبیر کرنا ہے۔ (۵۰)

اس نصاب کے لیے کتابوں کی تیاری اور اساتذہ کی ضرورت

مولانا مودودیؒ نے جو تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے اس کے لیے کتابوں کی تیاری اور معلمین کی تیاری کی ضرورت پر زور دیا۔ اس خاص تعلیمی نصاب کے لیے اور اس نقطہ نظر کو اور اس مقصد زندگی کو طلبہ کے ذہن میں ڈالنے از سر نو اس کے مطابق کتابوں کی تیار کیے بغیر اس نظام تعلیم کو نافذ نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی اور اس کے لیے خصوصی تیاری کرنی پڑے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسے معلمین کی فراہمی پر زور دیا ہے جو اس نظام تعلیم کے مطابق تعلیم دینے کے اہل ہوں۔

تعلیم کا یہ خاکہ ابتدائی تعلیم، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم تک تھا اور تینوں کے معیارات کو بھی طے کیا ہے۔ اور ابتدائی مرحلہ کے لیے آٹھ سال طے کیا ہے اور ثانوی مرحلہ کے لیے دو سال طے کیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے چار سال طے کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے نصاب اور درسیات کے لیے کمیٹی بنائی اور ایک خاکہ بنا کر اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ ثانوی اور اور اعلی تعلیم کے لئے بھی عارضی انتظام کیا ہے۔

مولانا نے تحریک کے ساتھ تعلیم کے نظام کو مرتب کیا اس کے لیے نیا نصاب تعلیم بنایا۔ تحریک اسلامی کی آبیاری کے لئے ایک ایسے نظام تعلیم سے ہوسکتی تھی جس کے اندر ایسی نسل کی تیاری تھی جو اس تحریک کے نصب العین کو قدم بہ قدم رہنمائی کر سکے۔

نصابِ تعلیم میں اصل محور قرآن فہمی

مولانا مودودی کے نصاب تعلیم میں بنیادی طور پر قرآن فہمی کو تمام علوم کا اس کا محور بنایا گیا ہے۔اس کی تیاری کے لیے ایسے افراد کا انتخاب کیا جو اس میدان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔مولانا مودودیؒ نے نصاب تعلیم کے لیے جو بھی کمیٹیاں بنائیں اس میں جدید اور قدیم تعلیم یافتہ تھے اور قرآن فہمی کے بارے میں اپنے زمانے کے یکتا تھے۔

نصاب تعلیم کی اصلاح کے بارے میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ ''جہاں تک ہوسکے عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذ اصلی یعنی قرآن اسی زبان میں ہے اور اسے جب تک آپ اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھیں گے اسلام کا نظام فکر کبھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح نہ آسکے گا۔عربی زبان کی تعلیم کا پرانا طریقہ اب غیر ضروری ہوگیا ہے۔''(۵۱)

مولانا مودودیؒ نے نصاب تعلیم کے جو بھی کمیٹیاں بنائیں اس میں جدید اور قدیم کے تعلیم یافتہ تھے اور قرآن فہمی کے بارے میں اپنے اور قرآن فہمی کے بارے میں اپنے زمانے کے یکتائے روزگار تھے۔

نصاب اور درسیات کی ترتیب کا کام ان حضرات کے ذمہ ہوا۔

۱۔غازی عبد الجبار صاحب ۲۔مولانا امین احسن اصلاحی صاحب۔ ۳۔قاضی حمید اللہ صاحب (سیالکوٹ)۔۴۔نعیم صدیقی صاحب۔۵۔خواجہ محمد صدیق صاحب (دہلی)

انتظامی امور کے لیے یہ حضرات مقرر کیے گئے:

۱۔سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔۲۔مولانا امین احسن اصلاحی صاحب۔۳۔غازی عبدالجبار صاحب۔ ۴۔چوہدری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ)۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے جو تعلیمی اور انتظامی کمیٹی بنائی گئی اس میں یہ حضرات تھے اور اس کے انچارج مولانا امین احسن اصلاحی بنائے گئے:

۱۔مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ۲۔مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب۔۳۔مولانا مسعود عالم ندوی صاحب۔۴۔مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب۔(۵۲)

''۱۴ اگست ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں نئے نظام تعلیم کی تشکیل کے لیے باقاعدہ مجلس تعلیمی کا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں مولانا مرحوم نے اس نئے نظام تعلیم کا پورا خاکہ پیش کیا جو اعلیٰ، ثانوی اور ابتدائی

تعلیم کے معیارات مطلوبہ پر مشتمل تھا۔ مجلس تعلیمی نے اس ضمن میں ابتدائی قدم بھی اٹھایا اور اساسی تعلیم کی درس گاہ بھی قائم کردی۔ دارالسلام میں جو کارکن اپنے کنبوں کے ساتھ آبسے تھے، ان کے بچے اس درس گاہ کے ابتدائی طالب علم تھے۔'' (۵۳) اور اس درس گاہ کی ابتدا جولائی ۱۹۴۶ء میں ہو چکی تھی اور مولانا مرحوم کے جدید خطوط پر تعلیم وتدریس کا یہ اولین تجربہ تھا'' سید نقوی علیؒ اس تجربہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جو اس درس گاہ میں معلم تھے۔'' درسگاہ کی ابتدا جولائی ۱۹۴۶ء میں باقاعدہ ہو چکی تھی۔ میں اور محمد حامد صاحب اس ابتدائی درس گاہ کے مدرس تھے۔ غازی صاحب عمومی ناظم بھی تھے اور ناظم درسگاہ بھی۔ غازی صاحب اور مولانا مودودی صاحب کے مشورے سے نظام الاوقات، نصاب تعلیم زائد از نصاب مصروفیات، کھیل اور تفریح کے سلسلے شروع کئے گئے تھے۔ بچوں میں ابتدائی ادبی تحریریں لکھنے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے'' نور'' کے نام سے ایک دیواری اخبار بھی جاری کیا گیا تھا۔'' (۵۴)

یہ نظام چل ہی رہا تھا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور ہندوستان میں جماعت کی تشکیل جدید ۲۰ اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ جماعت اسلامی ہند نے اول روز سے تعلیم وتربیت کو اپنا مقصود بنایا چنانچہ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نو تشکیل شدہ نصاب کمیٹی کا اجلاس رام پور میں ہوا جس میں ابتدائی تعلیم کا خاکہ مرتب ہوا اور یکم ربیع الاول ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) کو ۲۱ طلبہ سے نئے نصاب تعلیم کے تحت ایک ماڈل درس گاہ کے طور پر مرکزی درس گاہ جماعت اسلامی ہند کا افتتاح عمل میں آیا۔ جناب افضل حسین صاحب جو اس وقت ضلع جھانسی (یوپی) کے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے کام کررہے تھے اور جلد ہی پرنسپل کے عہدے پر فائز ہونے والے تھے، اس ابتدائی مرکزی درس گاہ کے ناظم مقرر کئے گئے۔'' (۵۵)

اس کے بعد جماعت درسی کتابوں کی تیاری میں لگ گئی۔ برطانوی اور استعماری غلبہ سے ہندوستان آزاد ہونے بعد جو خدا بےزار نصاب تیار ہوا تھا، جس میں خدا اور مذہب کا اجتماعی زندگی میں کوئی کردار نہیں تھا ان حالات میں جماعت نے درسی کتابوں کی بھرپور انداز میں تیاری کی۔

پرائمری سطح پر تمام مضامین (اردو، اسلامیات، ہندی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، عربی، اور انگریزی مضامین) کی درسی کتابوں کی تیاری کا سلسلہ جناب افضل حسین صاحب کی نگرانی میں شروع ہوا، جن کی تعداد پچاسی کے قریب ہے۔ (۵۶) مزید تفصیل کے لیے جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات (۱۹۴۸ تا ۲۰۰۹ء) کا مطالعہ مفید ہوگا اور اس ضمن میں نصاب تعلیم مرکزی درس گاہ اسلامی بھی معلومات میں اضافہ کرے گا، جو ۱۹۶۰ء میں مرتب ہوا تھا پھر ۱۹ سال کے بعد ۱۹۷۷ء میں اسے اپ ڈیٹ کرکے شائع کیا گیا۔

پھر جماعت کے افراد نے اس ماڈل کو ملک کے دوسرے حصوں میں قائم کرنا شروع کیا اور اس نصاب کو متعارف کرایا اور پورے ہندوستان میں جال بچھتا چلا گیا۔ جماعت کی ثانوی درس گاہ کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل آیا جو چار سالہ نصاب کے تحت عربی اور دینی تعلیم کی تدریس کا انتظام تھا، اس میں دو برسوں میں عربی زبان و ادب پر دی گئی اور بعد دو برسوں میں قرآن مجید پھر حدیث پر اور پھر فقہ پر۔ اور علوم جدیدہ بھی۔ اس نصاب کی نوعیت مطالعاتی تھی، طلبہ خود اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس کے اساتذہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ تھے۔ جو علوم قرآن میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن یہ ادارہ اپنی تمام افادیت کے باوجود طلبہ کی عدم دست یابی اور دوسرے موانع کی وجہ سے بند ہوگیا اور اسی سلسلے کی ایک کڑی 'اسلامی اکیڈمی' کا آغاز ہوا۔ جس طرح نظام طوسی کے نصاب اور درس نظامی کے نصاب نے ایک ہمہ گیر اور فکری تحریک پیدا کی اسی طرح مولانا مودودیؒ کے پیش کردہ نصاب نے بیسویں صدی میں اس جمود کو توڑا جو ایک صدی سے دین اسلام کو ایک صرف ایک مذہب کے طور پر سمجھا جاتا تھا اور اسلام ایک پرائیویٹ مذہب بن گیا ہے اور اسلام کے سیاسی، معاشی، اخلاقی پہلوؤں پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اس نصاب تعلیم نے اس جمود توڑ کر اس صدی میں ایک انقلاب برپا کر کے دین اسلام کا ایک جامع تصور پیش کیا۔

دوسرا پہلو جو سب سے اہم ہے قرآن فہمی کی تحریک کو جنم دیا۔ کتاب اللہ صدیوں سے ایک تبرک کی کتاب سمجھی جاتی تھی اور بغیر سمجھے پڑھنے کا عام تصور عام تھا اور اسے بغیر سمجھے پڑھنا نیکی سمجھی جاتی تھی اس فکر پر ضرب لگی اور دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تشریح کی گئی۔ اور عام لوگوں کے لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو بہت ہی آسان زبان میں ہے اور عام فہم ہے اور قرآن جس مقصد کے لیے اترا ہے اس کو اردو زبان میں منتقل کر کے ایک عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔

اعظم گڑھ میں تعلیم گاہ کے قیام کی کوشش

جماعت اسلامی ہند نے ہندوستان کے طول وعرض میں تعلیمی اداروں کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کرنے کی پوری جدو جہد کی۔ جماعت کا نصاب ان کے اپنے اداروں میں نافذ تو ہوا ہی، دوسرے اداروں نے بھی اس نصاب کو اپنے اداروں میں بعض مضامین یا کلی مضامین کو اپنے یہاں جگہ دی۔ 'بعض جگہ جہاں جماعت کے متوسلین اس موقف میں تھے کہ وہ خود تعلیمی ادارے قائم کرسکیں وہاں انھوں نے خود قائم کیے، بعض جگہ ملت کے اصحاب خیر کے تعاون سے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ مختلف ریاستوں میں وہاں کی اپنی ضروریات کے

مطابق نصاب میں جزوی تبدیلی کر کے بعض مضامین من وعن قائم رکھے گئے اور بعض تبدیل کر دیے گئے۔'' گویا اس نصاب کو ایک عوامی مقبولیت حاصل ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ تو پرائمری سے دسویں تک کا نصاب تھا جس کی مقبولیت کا یہ حال تھا۔

پھر جماعت احیاء دین اور تحریکی افراد کی تیاری کے لیے ایسے مدارس کے قیام کے بارے میں کوشاں رہی جہاں سے تحریک اسلامی کے لیے ایسے لائق و فائق اور باصلاحیت افراد تیار کئے جائیں جن میں بیشتر اسلام اور تحریک اسلامی کے مختلف میدانوں میں قابل قدر خدمات انجام دے سکیں۔ چنانچہ ۱۵ تا ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء میں جماعت کے شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب استاد تفسیر جامعۃ الفلاح نے عربی دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اپریل ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں بہت غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس اسکیم کی جان پڑتال مشرقی یوپی کی جماعت اسلامی کے امیر حلقہ اور تجویز دہندہ کریں گے، چنانچہ تحقیق کے بعد شوری اس کو نامنظور کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر کچھ لوگ اپنی مرضی سے اسے جماعت کا ادارہ بنانا چاہتے ہیں تو انھیں مرکز سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ''مجلس شوریٰ منعقدہ اپریل ۱۹۶۱ء میں عربی دارالعلوم کے قیام کی تجویز زیرغور آئی تھی جس کے متعلق طے کیا گیا تھا کہ درس گاہ کی پوری اسکیم مع تفصیلات امیر حلقہ مشرقی یوپی اور مجوز سے معلوم کی جائے، چنانچہ یہ اسکیم اب شوریٰ کے سامنے رکھی گئی اور طے کیا گیا کہ جماعت کی طرف سے جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ کچھ لوگ اپنے طور سے ایسی درسگاہ قائم کرنا چاہیں تو ان کو مرکز سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''(۵۷) چنانچہ جماعت اسلامی ہند اعظم گڑھ کے درج ممبران مولانا ملک حبیب اللہ صاحب امیر حلقہ جماعت اسلامی مشرقی یوپی، مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب ناظم علاقہ اور مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب نے ضلعی میٹنگ میں ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۳ شوال ۱۳۸۱ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء سے ان حضرات کی کوششوں سے اعظم گڑھ میں جامعۃ الرشاد نے کام کرنا شروع کردیا۔ اور مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اس کے پہلے ناظم ہوئے۔(۵۸)

مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب جامعۃ الرشاد کے قیام کے پس منظر پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: ''۱۹۶۰ء میں مدرسۃ الاصلاح میں فضا پرسکون نہ رہی اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ان لوگوں نے سبک دوش کردیا، جنہوں نے انھیں بلایا تھا، اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ضرورت کی تکمیل

کے لیے ایک دارالعلوم کا انتظام کیا جائے، مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب، مولانا ملک حبیب اللہ قاسمی اور بشمول راقم ایک نشست میں جس میں مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب ندوی بھی شریک رہے، ایک درس گاہ جامعۃ الرشاد کے نام سے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا، مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی اس وقت جماعت اسلامی کے رکن تھے، ادارہ چل پڑا''۔ مزید لکھتے ہیں''مگر جلدی ہی مولانا مجیب اللہ صاحب جماعت اسلامی سے دور ہونے لگےاور آہستہ آہستہ پھر رکنیت سے ہی مستعفی ہوگئے اب مذکورہ دونوں ذمہ داران اور دیگر رفقاء نے یہ محسوس کیا کہ اب ہم اس درس گاہ کو اپنی مرضی سے نہیں چلاسکیں گے، اس لیے اس سے ارکان جماعت بے تعلق ہوگئے اور بلریا گنج کے ایک پرائمری اردو مکتب کی طرف رخ کیا گیا، مولانا عبدالحسیب اصلاحی رکن جماعت جامعۃ الرشاد سے منتقل کر کے اسی مکتب میں بھیج دیے گئے۔ پھر دھیرے دھیرے تحریک سے متعلق لوگ مسند تدریس پر فائز کئے جاتے رہے۔ مولانا ابوبکر صاحب اور امیر حلقہ مولانا حبیب اللہ صاحب برابر اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہے۔ قصبہ کے لوگوں کا بھر پور تعاون رہا اور آہستہ آہستہ یہ پرائمری مکتب وہ جامعۃ الفلاح بنا جو دنیا کے سامنے موجود ہے۔'' (۵۹) اس تحریر سے بیک وقت جامعۃ الرشاد اور جامعۃ الفلاح دونوں کے قیام پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ لیکن بلریا گنج کے اندر کا مکتب مدرسہ سے جامعۃ الفلاح کیسے بنا اس کی تفصیل یوں ہے۔

دوسری طرف بلریا گنج میں ۱۹۱۴ء میں ایک مکتب اسلامیہ یا مکتب امدادیہ (دونوں ہی نام لکھا جاتا تھا) کے نام سے اس کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں درجہ دوم تک تعلیم ہوتی تھی اس کے بعد یہاں سے بچے سرکاری اسکول میں داخلہ لے لیتے تھے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء میں ایک تاریخی اجلاس عام ہوا جس میں انتظامیہ اور تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور یہ طے پایا کہ درجہ سوم کھول دیا جائے۔ پھر اس کے بعد سال بہ سال ۱۹۵۷ء میں درجہ چہارم اور ۱۹۵۸ء میں درجہ پنجم قائم ہوا اور درجہ ہفتم تک کے درجات کھل گئے۔ اس کے بعد درجہ ہشتم عربی اول کھل گیا۔ اور درجہ ہشتم یعنی عربی اول کی تعلیم شروع ہوگئی تھی۔ اس عرصہ میں جماعت اسلامی کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اور جماعت کے متوسلین نے اس بات کے لیے تگ ودو شروع کر دی کہ یہاں ایک عربی درس گاہ کا قیام عمل میں آجائے۔

۱۹۶۰ء میں مدرستہ الاصلاح کے وہ افراد جو جماعت اسلامی کے رکن تھے انھیں فارغ کر دیا گیا۔ ان میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب تھے۔ ان دونوں مدرسہ کے منتظمین (جامعۃ الرشاد اور جامعۃ الفلاح) کی یہی خواہش تھی کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ہمارے یہاں آجائیں اور تعلیم وتربیت کی باگ ڈور سنبھال لیں۔

مولانا عمران احمد فلاحی مدرسہ کے ابتدائی دور سے جامعۃ الفلاح بننے تک کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نے مکتب کا آخری درجہ سوم پاس کرلیا اور مکتب اسلامی کا یہی آخری درجہ تھا لیکن اس کے ذمہ داروں نے چہارم اور پنجم کا بھی انتظام کر دیا اس لیے مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑی اور چونکہ مکتب اسلامی کا الحاق سرکاری ایجوکیشن بورڈ سے تھا ہم لوگوں نے انجان شہید جا کر امتحان دیا۔اس کے بعد مکتب اسلامی کے ذمہ داروں نے درجہ ششم کھولنے کا فیصلہ کیا۔اس کے بعد درجہ ہفتم کھل گیا اور ہفتم پاس کرنے کے بعد بغیر کسی درجہ بندی کے مفتی عبدالرؤف مبارکپوری صاحب اور دیگر اساتذہ کے ساتھ ابتدائی عربی اور دیگر مضامین کی تعلیم حاصل کیا پھر ۱۹۶۲ء میں جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی مدظلہ العالی بحیثیت معلم اس جامعہ میں تشریف لائے اور اسباق النحو اول دوم وغیرہ پڑھانا شروع کیا۔لیکن چندمہینوں کے بعد حسب وعدہ آپ جامعۃ الرشاد چلے گئے جن کا ہم طلبہ کو بڑا قلق رہا۔

موصوف کے چلے جانے کے بعد ہم لوگوں کا تعلیمی سلسلہ ایک طرح سے مفلوج ہوگیا،مگر چندمہینوں کے بعد عربی تعلیم کے لیے جناب مولانا شبیر احمد مرحوم کا تقرر ۱۹۶۲ء ہی میں عمل میں آ گیا۔انھوں نے درجہ بندی کی اور باقاعدہ عربی تعلیم شروع کردی اور اس مکتب اسلامی کا نام بدل کر جامعہ اسلامیہ رکھا۔(۶۰) لیکن ۱۹۶۲ء کے آخر میں اس جامعہ اسلامیہ کا نام بدل کر جامعۃ الفلاح رکھ دیا گیا۔(۶۱) اب آ یئے دونوں جگہ کے منتظمین کی کوششوں کا حال سنیں جو مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کیا ہے۔ پہلے وہ عارضی طور پر جامعۃ الفلاح آئے پھر وعدہ کے مطابق جامعۃ الرشاد چلے گئے لیکن وہاں بھی حالات میں تبدیلی ہوئی تو دوبارہ جامعۃ الفلاح آ گئے۔

مولانا مدرسۃ الاصلاح سے جواب ملنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں حج کے لیے روانہ ہوئے،جب حج سے واپس آئے اور اعظم گڑھ پہونچے تو ان سے ملاقات کے لیے مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اور جناب عبدالعزیز خان صاحب بھی موجود تھے۔مولانا اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ''اس وقت مولانا مجیب اللہ ندویؒ صاحب نے مجھے پکڑ لیا اور تھوڑا الگ لے جا کر کہا کہ دیکھئے ہم لوگ شہر میں ایک مدرسہ کھولنے جارہے ہیں اور آپ اس کے مدرس،صدر مدرس سب کچھ رہیں گے۔ بتایئے آپ آئیں گے نا! ہاں کہتے ہیں نا! ان کے شدید اصرار پر میں نے کہہ دیا: ٹھیک ہے آجاؤں گا۔بلریا گنج کے لوگوں کو مجیب اللہ ندویؒ سے میرے وعدے کا علم ہوا تو ان لوگوں نے کہا: ارے! ہم لوگ تو منتظر تھے کہ آپ بلریا گنج کے مدرسے کو بڑھائیں گے اور آگے لے کر چلیں گے۔

میں نے کہا: ارے بھئی! میں نے تو اب زبان دے دی ہے۔ لوگوں نے کہا: چھوڑ یئے، آپ یہیں رہیے۔ میں نے کہا: نہیں! زبان دے دی ہے تو دے دی ہے۔ (۶۲)

مولانا اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: ''شوال سے مجھے جامعۃ الرشاد جانا تھا۔ اس سے پہلے چند ماہ کے لیے میں بلریا گنج ہی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگا۔ اس وقت بلریا گنج کے مکتب میں مولانا عمران فلاحی صاحب وغیرہ درجہ ششم میں تھے۔ یہ لوگ منہاج العربیہ پڑھتے تھے۔ مجھ سے یہ کتاب پڑھانے کے لیے کہا گیا۔ اس کتاب کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے کتاب تبدیل کرائی اور پھر اعزازی طور پر شعبان تک میں نے اس کی جگہ علامہ فراہیؒ کی اسباق النحو پڑھائی۔ (۶۳) اس کے بعد مولاناؒ جامعۃ الرشاد چلے جاتے ہیں۔

جامعۃ الرشاد میں

دو سال تک مولاناؒ جامعۃ الرشاد میں تعلیم کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ مولاناؒ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں: ''شوال آیا تو حسب وعدہ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے یہاں چلا گیا۔ وہیں مسجد میں جامعۃ الرشاد کی بنیاد پڑی۔ وہیں پڑھائی شروع ہوگئی اور حسب وعدہ میں دو سال تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد بھی وہاں تدریسی سلسلہ جاری رکھتا، لیکن اس دوران ڈاکٹر خلیل احمد صاحب جب بھی اعظم گڑھ جایا کرتے تھے، وہ میرے یہاں ضرور آیا کرتے تھے اور مجھ سے بلریا گنج چلنے کے لیے اصرار کیا کرتے تھے۔ اور پھر دو سال پورے ہوئے تھے کہ ایک روز حکیم صاحب دس پندرہ لوگوں کو لے کر صبح صبح میرے گھر آ گئے۔ میں دیکھ کر خوش ہوا کہ میرے اتنے دوست احباب حکیم جی کے ساتھ بلریا گنج سے مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا تو حکیم جی نے کہا: ''پہلے ای کہا تو ایہا بلریا گنج؟'' ان کا یہی انداز تھا بولنے کا۔ میں نے کہا: کیسے آؤنگا، میں وہاں وعدہ کر چکا ہوں، اصلاح کی طرح وہ بھی جواب دے دیں، تب ہی آ سکتا ہوں نہیں تو نہیں۔ اس پر حکیم جی نے کہا: اے امانت! اٹھا اٹھا، ان کی چائے نہ پی جائی۔ اب میرے چچا مجھے ڈانٹنے لگے کہ کہہ دو حسیب 'ہاں'۔ میں نے کہا: چچا میں یہ ایسے کیسے کہہ دوں، البتہ یہ ہوسکتا ہے صبح میں جامعۃ الرشاد جاؤں، مجیب اللہ صاحب اجازت دے دیں تو آؤں، نہ تو نہ آؤں، حکیم جی نے کہا: ایسی بات، تو چلا بیٹھا ہو، تب پی لا چائے، اس طرح وہ لوگ چائے پی کر اور کچھ باتیں وغیرہ کر کے چلے گئے۔'' (۶۴/الف)

ان تمام باتوں سے یہ بات سامنے آگئی کہ بلریا گنج کے جماعت کی ذمہ دار مدرسہ کو ایک عربی تعلیم گاہ

کو بنانے کے لیے ایسے فرد کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو اس صلاحیت کا حامل ہو کہ جماعت کے مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ علاقے میں دعوت دین کا مرکز بن جائے اور یہاں سے علما اور فضلا نکل کر دین کی تبلیغ کر سکیں۔ دو سال گزارنے کے بعد جامعۃ الرشاد کے حالات میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی وضاحت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی یوں کرتے ہیں۔

مولانا رحمت اثری فلاحی صاحب پہلے مدرسۃ الاصلاح ۱۹۶۲ء میں گئے اور عربی اول میں داخلہ ہوا اور اس کے آخری سال میں تھے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اور جماعت کے ہم خیال طلبہ کا رہنا ناممکن ہو گیا تھا اور پورا سال مکمل نہیں کر سکے اور جامعۃ الرشاد آ گئے اور عربی دوم میں داخلہ ہوا اور سال مکمل کیا۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں حالات بگڑنے کی وجہ سے جامعۃ الرشاد آ گئے۔ چوں کہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اور جماعت کے ارکان کے بچے مدرسۃ الاصلاح سے یہیں آ گئے تھے اور مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب جماعت کے رکن تھے اور چاہتے بھی تھے کہ جماعت کے افراد کے ساتھ ہمارا تعاون رہے۔ چنانچہ جماعت کے ارکان نے شوریٰ کے اس فیصلے کے بعد کہ مقامی طور پر جامعۃ الرشاد کو اپنے طور پر چلا سکتے ہیں اور اس کی حمایت کر سکتے ہیں تو مولانا مجیب اللہ ندویؒ کو اس کا Approval مل گیا، اس طرح جماعت کی حمایت کے ساتھ جامعۃ الرشاد کا نظم ونسق مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی نظامت میں اور ان کی خواہش کے مطابق جامعۃ الرشاد جماعت کی درسگاہ بن جائے، تعلیم وتربیت کا عمل شروع ہو گیا، لیکن انہی دنوں ان کے تعلقات مولانا وحیدالدین خان جو رکن جماعت تھے اور جو اعظم گڑھ میں تھے ان سے گہرے روابط تھے اور وہ ''تعبیر کی غلطی'' (۶۴ب) لکھ رہے تھے اور مولانا وحیدالدین خان صاحب گویا جماعت سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے اور جو کچھ بھی لکھتے تھے مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب سے آ کر ڈسکشن کرتے تھے اور دونوں میں بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ مولانا وحیدالدین خان کے خیالات مولانا مجیب اللہ ندویؒ پر واضح طور پر نمایاں ہو گئے تھے اور مدرسۃ الاصلاح سے جو اساتذہ وطلبہ یہاں آئے تھے، ان کی جماعتی کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھنے لگے اور کھل کر منع کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہاں آپ لوگ پڑھنے آئے ہیں اور جماعت کی سرگرمیوں کے لیے نہیں آئے ہیں اور موقع بہ موقع کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے۔ مولانا رحمت اثری صاحب ایسے متعدد واقعات بتلاتے ہیں کہ انھوں نے اس بات سے سختی سے روکا کہ آپ لوگ جماعت کی سرگرمیوں میں قطعاً حصہ نہ لیں۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی سرکردگی میں جامعۃ الرشاد

کا چلنا مشکل ہے۔ ہم لوگ غلط جگہ آ گئے ہیں اور غلط جگہ کا انتخاب ہو گیا ہے اور طلبہ سال کے اخیر میں امتحان دے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور اس دوران جامعۃ الفلاح میں ایک تحریکی انقلاب آ گیا۔ وہاں ایک عرصہ سے جامعۃ الفلاح کے ذمہ داران ان حالات کو بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ جن لوگوں نے جامعۃ الرشاد کو ایک تحریکی درس گاہ کا Approval دیا تھا اپنی حمایت کا ہاتھ ان سے اٹھا لیا اور یہی افراد جامعہ جہاں عربی اول تک کی کلاس چل رہی تھی اب انھیں اس بات کا موقع مل گیا کہ اسے ایک عظیم الشان جامعہ بنانے کا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

چنانچہ تمام جامعۃ الرشاد کے طلبہ کو جو چھٹیوں پر گھر گئے ہوئے تھے، جامعۃ الفلاح کی طرف سے یہ خط پہنچ گیا کہ آپ لوگ جامعۃ الفلاح آ جائیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ جن میں حبیب جمالی صاحب امریکا، عربی چہارم میں عبدالوحید صاحب مالیگاؤں عربی چہارم میں رحمت اللہ اثری صاحب جامعۃ الفلاح (عربی سوم میں) ابرار احمد صاحب زمیندر سول پور اعظم گڑھ، (عربی سوم میں،) مطیع اللہ صاحب جامعۃ الفلاح (عربی دوم میں) اور اشتیاق احمدؒ بلریا گنج (عربی سوم میں) آ گئے۔

اس طرح ڈاکٹر خلیل احمد اور حکیم محمد ایوب صاحب کی وہ تمام کوششیں بر آئیں جس کے لیے وہ بار بار مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو جامعۃ الفلاح میں آنے کی دعوت دے رہے تھے تا کہ آپ کی قیادت اور سربراہی میں جماعت اسلامی کی ایک عظیم الشان درس گاہ بن کر تحریک اسلامی کی خدمت انجام دے سکے، تحریک اسلامی کا ایک مرکز بن جائے اور ہندوستان میں دعوت اسلامی کی اشاعت کا کام عام ہو سکے۔

ایک باصلاحیت ٹیم کا اجتماع

جامعہ کو سب سے اہم ضرورت اس بات کی تھی کہ جو نصاب جدید قدیم کا تیار ہوا تھا اسے تنفیذ کے لیے باصلاحیت افراد کی ضرورت تھی، چنانچہ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے اس کے لیے بھر پور کوشش کہ کی اس نصاب تعلیم سے ہم آہنگ افراد کو جمع کر لیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا پہلے سے مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ موجود تھے۔ اس کے بعد دو ایسے افراد کو بلانے میں کامیاب ہو گئے جو مدرسہ کی تاریخ میں ایک نمایاں تبدیلی کے لیے راہنما ثابت ہوں گے۔ ان میں مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا شہباز ہندی اصلاحی تھے۔

آپ لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ چھوٹا ناگ پور کمشنری (اس وقت جھارکھنڈ) میں ایک پر فضا جگہ چتر پور قصبہ میں انیس الدین مرحوم امیر حلقہ بہار کی نگرانی میں ایک اقامتی درس گاہ تھی، وہاں کی خوش قسمتی تھی کہ

ایسے حالات رونما ہوئے کہ مولانا جلیل احسن ندوی، مدرسۃ الاصلاح کو خیر باد کہہ کر ان کی دعوت پر چتر پور تدریس کا فریضہ انجام دینے آ گئے اور مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا اقبال احمد اصلاحی اور مولانا محمود عالم اصلاحی بھی یہاں آ گئے اور عربی کے درجات کھل گئے۔ لیکن بدقسمتی ہوئی کہ دو سال کے بعد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا، اس وقت درس گاہ کا نام جامعہ کاشف العلوم رکھا گیا تھا۔ جامعۃ الفلاح کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ جامعہ کے منتظمین کو جب اس کا علم ہوا تو فوراً انھوں نے مولانا جلیل احسن ندوی سے ربط قائم کیا اور اس پلان کو پورا کرنے کے لیے بلا لیا۔ یہاں سے مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا اقبال احمد اصلاحی جامعہ آ گئے اور ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب بعد میں جامعہ مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی دعوت پر تشریف لائے۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب چتر پورر سے سیدھے رامپور چلے گئے اور دورہ حدیث مکمل کر کے جامعۃ الفلاح میں تدریس کا فریضہ انجام دینے کے لیے آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی زمین رسول پور سے مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ تشریف لے آئے جو مدرسۃ الاصلاح سے فارغ کئے جانے کے بعد اپنی بستی میں ایک اسلامی درس گاہ کے استاد تھے اور اس کی ادارت بھی کر رہے تھے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی ان تمام مؤقر حضرات کی آمد کے بعد سے جامعہ کی ترقی اور اس پلان کو پورا کرنے کا پروگرام شروع کر دیتے ہیں۔

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا شہباز ہندی اصلاحیؒ جیسی عظیم شخصیات کی آمد سے جامعہ کو جو افرادی قوت ملنی تھی، وہ ملنی شروع ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے اپنی کوششوں سے انیس الدین مرحوم کو خط لکھ کر مولانا شہباز صاحب کو بلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب براہ راست ان سے واقف نہیں تھے، سب سے اہم مسئلہ مولانا شہباز ہندی اصلاحی کو جامعہ کاشف العلوم سے فارغ کر کے یہاں بلانا تھا۔ اس سلسلے میں امیر حلقہ ڈاکٹر خلیل احمد کی کوششوں کو نہیں بھلایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اس وقت کے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ سے ربط قائم کر کے مولانا شہباز ہندی اصلاحیؒ کو جامعہ بلانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت مولانا جلیل احسن صاحب، مولانا عبدالحسیب صاحب اور مولانا شبیر صاحب سے براہ راست واقفیت کی بنیاد پر اور ان لوگوں کے مشورے ہی سے یہ مشکل کا انجام پایا ہوگا۔ مشکل اس لیے تھا کہ چتر پور سے ان کو بلانا یہ معنی رکھتا تھا کہ چتر پور کی درس گاہ کو یتیم بنانا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ان کے آ جانے کے بعد وہ درس گاہ اجڑ گئی۔ چنانچہ مولانا شہباز اصلاحی صاحب چتر پور سے جامعہ تشریف لے آئے اور ان کی آمد سے یہاں علم وفکر کی دنیا

میں چار چاند لگ گئے، مدرسہ کی ہر گتھی کو سلجھانے اور تعلیم وتربیت میں لگ گئے۔ڈاکٹر خلیل احمد کی نظامت میں مولانا جلیل احسن ندوی نے تعلیم وتربیت کا م شروع کر دیا اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی کی صدارت میں جامعہ کا نظم ونسق بام عروج تک پہنچا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نظم ونسق قائم کرنے اور انتظامی امور میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔فوری طور پر ایک ہاسٹل کی تعمیر ہوئی جو بعد میں حسن البنا کے نام سے موسوم ہوا اور اس کے بعد مسجد کی تعمیر ہوئی جو وقت کی بہت اہم ضرورت تھی۔ایک سنہرا دور شروع ہو گیا اور اس ٹیم میں اس وقت کے تمام اساتذہ شامل ہو گئے۔

اس طرح ایک اجتماعی قوت بنا کر جامعہ کو اپنی صحیح سمت کی طرف رواں دواں کر دیا۔اس لیے عربی چہارم کے بعد پنجم، ششم کھلنے میں دیر نہیں تھی اور جامعہ کے ہمہ گیر نصاب کی تدریس اور تعلیم کے لیے جن جن مضامین کی تعلیم کا مسئلہ تھا، ان کی تکمیل کے لیے ان افراد کی ضرورت تھی اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اس میں مکمل طور پر کامیاب ہو گئے۔اسی طرح اس وقت جدید کی تعلیم دینے کے لیے ماسٹر افضال اللہ مشہدیؒ، ماسٹر آفاق احمد، ماسٹر عبداللہ صاحب، ماسٹر مناظر الاحسنؒ، ماسٹر عبدالحکیمؒ اور ماسٹر اکرام الدینؒ اس ٹیم میں شامل ہو گئے اور جامعہ کے مقاصد کے حصول میں اپنی پوری توانائی جھونک دی۔یہ تمام لوگ اپنے وقت کے یکتائے روزگار تھے۔

اس طرح جامعۃ الفلاح میں عربی اول تو ۱۹۶۳ء میں شروع ہو چکا تھا،۱۹۶۴ء سے فوری طور پر عربی دوم سے عربی چہارم تک کے درجات کھل گئے۔اس لیے کہ جامعۃ الرشاد سے جو طلبہ آئے وہ عربی دوم، سوم اور چہارم میں داخلے کے امیدوار تھے۔چترپور سے جو طلبہ آئے عربی چہارم (مولانا ابوالمکارم فلاحی دہلی) اور عربی دوم کے امیدوار (ظفر احمد اثری فلاحی لندن) تھے۔"(۶۵) اور بقیہ طلبہ دارالعوم ندوۃ العلماء اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے چلے گئے۔

"اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کی ایک پوری ٹیم ایک مختصر عرصہ میں جمع ہو گئی اور جامعہ کے اس خاکے کو پورا کرنے میں لگ گئی جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔جس بے سروسامانی کے عالم میں ۱۹۶۴ء میں اسکی ابتدا ہوئی اس کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طلبہ کے لیے باقاعدہ نہ بورڈ ینگ ہاؤس، نہ مطبخ، نہ لائبریری، نہ کلاس کے لیے جگہ۔"لیکن مولانا جلیل احسن ندویؒ کے تبحر علمی، مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب کے حسن انتظام اور حسن تعلیم وتربیت اور مولانا شہباز اصلاحیؒ کی ذہانت اور فطانت اور معاملہ فہمی مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ کے اخلاص وللّٰہیت، مولانا شبیر احمد اصلاحی کے اخلاص ولگن، مولانا

عنایت اللہ سبحانی کی تعلیم وتدریس کی مہارت اور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی حکمت وتدبر کی وجہ سے جامعہ کی شہرت چند سالوں میں اتنی ہوئی کہ ہندوستان کے کونے کونے سے طلبہ آنے لگے۔ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ ملک کے مختلف حصوں میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور جماعت اسلامی کے اہم ذمہ داروں میں سے تھے اور سب اہم بات یہ کہ انھیں مولانا مودودیؒ کے ساتھ پٹھان کوٹ دارالسلام (پٹھان کورٹ کے نزدیک امرتسر) میں رہنے کا شرف حاصل تھا، جہاں دارالعروبہ میں مولانا مسعود عالم ندویؒ کے ساتھ رہ کرکئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے تھے ان سب وجوہات سے ان کی ملک گیر شہرت نے تحریک اسلامی کے حلقے میں جامعۃ الفلاح کو ایک معتبر اور قابل اطمینان ادارہ بنادیا اور اسے شہرت حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا''۔(٦٦)

یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اگر جامعہ کاشف العلوم اور جامعہ الرشاد سے اساتذہ اور طلبہ نہ آتے تو ۱۹۶۱ء کا پلان اور خاکہ پائے تکمیل تک نہیں پہنچتا۔اس لیے ۱۹۶۴ء جامعہ کی تاریخ کا ایک اہم باب اور Turning point ہے۔موجودہ تاریخ میں اس باب کو سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ تاریخ کے ساتھ بےانصافی ہوگی۔

آیئے ان بنیادی اساتذہ کا تدریسی زندگی کا جائزہ لیں، تاکہ جامعہ کی ترقی اور خاص طور سے جامعہ کے نصاب تعلیم کو پروان چڑھانے میں کتنا حصہ تھا۔اور کیسے ایک دوسرے کے تعاون سے جامعہ کے مقاصد اور طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت میں جانگسل حالات میں انھوں نے بڑی قربانیاں دیں۔اپنی اعلی صلاحیتوں اور اپنی اعلی قابلیتوں کو اس جامعہ ہی میں رہ کر کفاف ہی کو پاکر اپنی زندگی تج دیں۔

مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ

مولانا عمران احمد فلاحی لکھتے ہیں: ''۱۹۶۲ء کے وسط میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی تشریف لائے مگر چند ہی مہینوں کے بعد موصوف اپنے وعدہ کے ایفاء کے لئے جامعۃ الرشاد چلے گئے، مولانا کی جدائی کا ہم طلبہ کو بہت قلق رہا۔آپ کے چلے جانے بعد ہم لوگوں کی اکثر گھنٹیاں خالی رہنے لگیں، فوری طور پر کوئی نظم نہیں ہوسکا، چند مہینوں کے بعد خوش قسمتی سے مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب مرحوم موضع اشرف پور میں منعقد ہونے والے جماعت اسلامی ہند کے ضلعی اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور اپنے استاد مولانا ابوبکر صاحب کے مشورہ پر بلریا گنج آ گئے۔اس طرح مولانا مرحوم نے ۱۹۶۲ء سے ہی خود کو جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے وقف کر

دیا اور رات دن ایک کر کے کام کیا۔ آپ کی محنت رنگ لائی اور آپ کی کوششوں نے ادارہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ بلریا گنج ہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے لوگ بھی جامعہ کی تعمیر وترقی میں گہری دلچسپی لینے لگے، آپ کی یہ لگن دیکھ کر ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء کو انتظامیہ نے آپ کو جامعہ کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔ اہل قریہ کا اعتماد دیکھ کر مولانا شبیر احمد صاحب کا حوصلہ بڑھا، آپ نے درجہ بندی کی اور باقاعدہ عربی تعلیم شروع کر دی'' (۶۷)

مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ [پ ۵ محرم الحرام ۱۳۵۰ھ و ۲۸ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ بمطابق دسمبر ۲۰۱۰ء] مدرسہ میں قدم رکھتے ہی تعمیر وترقی میں لگ گئے اور ابتدائی دو سالوں میں اپنے طور پر تعلیم وتربیت کے تیار شدہ نقشہ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ''مولاناؒ عربی زبان خصوصاً علم نحو کے استاذ تھے، سراجی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ تمام مضامین پر دسترس حاصل تھی، بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور حسن انتظام اور نظم و تربیت کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ ان کی کچھ متفرق تحریریں ہیں، کچھ تو غائب ہیں۔ میراث اور ترکہ پر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں باوجود تلاش کے اب تک نہیں مل سکی ہیں۔ علم نحو پر بھی ایک کتابچہ 'معلم النحو' کے نام سے ہے۔ ان کے ہاتھوں منتخب کیا ہوا احادیث کا ایک مجموعہ ''منتخبات الحدیث'' کے نام سے ہے جس کو کتابی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ ایک تحریر کتابی شکل میں ان کے تجربات کی روشنی میں 'اصول تعلیم' کے نام سے ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ: بچوں کی نفسیات اور ان کی تربیت سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ: انتظام مدرسہ سے متعلق ہے۔ تیسرا حصہ: اصول تدریس سے متعلق ہے۔

۱۔ جب مولاناؒ ۱۹۶۲ء میں یہاں تشریف لائے تو جامعہ کی منتظمہ کمیٹی کے ساتھ مل کر ایک نصاب تعلیم درس نظامی کی بنیاد پر بنایا۔ ''اس نصاب کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے اس میں عالمیت وفضیلت کے سات سالہ کورس کے لیے سیکولر اور عصری علوم کو شامل کیا گیا۔ مثلاً انگریزی زبان و ادب، معاشیات، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ''۔ (۶۸ الف) ''سیکولر'' کا لفظ کم از کم جامعہ کے نصاب کے لیے مناسب نہیں کسی بھی مفہوم میں، ''عصری علوم'' کا لفظ ہی کافی تھا۔ اور جامعہ کا یہ پہلا مکمل نصاب تعلیم تھا۔

۲۔ مولاناؒ کئی مرتبہ جامعہ کے صدر منتخب ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک، دوسری مرتبہ ۱۹۷۳ء سے ۱۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء تک اور آخری مرتبہ ۶ فروری ۱۹۸۱ء سے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء تک۔ (۶۸ ب)

ایک روایت کے مطابق ''جامعۃ الفلاح'' کا نام آپ نے رکھا ہے۔ پہلے یہ آپ نے انتظامیہ کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کو پسند کیا اور اس کے بعد مکتب اسلامیہ کا جامعۃ الفلاح نام ہو گیا۔ (۶۹)

۳۔آپ کے زمانہ میں بورڈنگ کا انتظام شروع ہوگیا تھا، جب آپ ضلع پورنیہ سے تشریف لائے تو آپ کے ساتھ چند بچے بھی ساتھ آئے تھے اس طرح بہار سے پہلی مرتبہ بچے یہاں داخلے کے لیے آئے اور بورڈنگ کا انتظام اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا۔

۴۔مولاناؒ کی ایک بہت خوبی یہ تھی کہ ثانوی کے ابتدائی طلبہ کو نحو وصرف پڑھانے کا بڑا ہی ملکہ حاصل تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کی تعلیم وتربیت میں بہت بڑا حصہ ہے۔اور انتظامی امور کو بہت عمدہ طریقے سے نباہتے تھے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ

اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ مولانا مولانا جلیل احسن ندویؒ [۲۵ جنوری ۱۹۱۴ء۔۸ جولائی ۱۹۸۱ء] کے تعلیمی کیریر کا آغاز درس نظامیہ کے نصاب تعلیم سے ہوا تھا اور ان کی تعلیم وتربیت کے اساتذہ سب ہی دیوبندی مکتب فکر کے حامل تھے۔لیکن جماعت سے وابستگی کے بعد جہاں اس بات میں یکسر تبدیلی آئی کہ جماعت کی فکر کے حامی اور اس کے مبلغ بن گئے اس کے ساتھ ہی درس نظامیہ کے ایک عظیم تبدیلی کے حامی بن گئے اور وہ اس بات سے مطمئن نہیں تھے کہ اس نظام میں جو تدریس کا طریقۂ تعلیم ہے اس میں نمایاں تبدیلی کی ضرورت کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ دوران تعلیم ہی اسلام کے مکمل نظام ہونے پر غور وتدبر کرنا شروع کر دیا تھا:

’’آپ کو معلوم ہے کہ میری ساری تعلیم مدارس نظامیہ میں ہوئی ہے، میرے تمام اساتذہ یا تو قاسمی ہیں یا مظاہری اور آخر میں چند ندوی۔ بیشتر انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ آزادی سے وابستہ تھے، جس کی قیادت انڈین نیشنل کانگریس کر رہی تھی، ہمارے یہ شیوخ ہم سے یہ کہتے تھے کہ یہ جنگ آزادی ایک مقدس اسلامی فریضہ ہے، پہلے انگریزی تسلط ختم کرو پھر اسلام کی حکومت قائم ہوگی۔اس کے قیام کا طریقہ کیا ہوگا، وہ فرماتے نقشہ بعد میں مرتب ہو جائے گا، پہلے انگریز تو ہٹے! میں اپنے دل میں خلش لیے خاموش ہو جاتا، ان سے بحث نہ کرتا۔میرے اندر خلش کا آغاز قدوری میں قضا کے باب سے معلوم ہوا کہ اسلام میں عدلیہ کا نظام موجود ہے، اگر اسلام کا نظام عدل قائم نہیں تو اس طرح کے ابواب کیوں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، پھر ہدایہ اور احادیث کی کتابوں میں امارت، امیر و مامور کے حقوق وفرائض اور حدود و وتعزیرات وغیرہ نے خلش بڑھا دی۔اپنے شیوخ سے بہت زیادہ محبت وعقیدت کے باوجود سمجھ میں نہ آتا کہ ان حضرات کی تمام تر جد

وجہد کا رخ تو ترکستان کی طرف ہے پھر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ان کا رخ اچانک کعبہ کی طرف کیوں کر ہو جائے گا۔(۷۰)

یہ تو زمانہ طالب علمی کی بات ہے۔ان اقتباسات سے واضح ہے کہ مولاناؒ نے دین کا جامع تصور دوران تعلیم ہی حاصل کر لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ دین ایک مکمل نظام کا نام ہے۔اس وقت انھوں نے مولانا مودودیؒ صاحب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، یہ مولاناؒ کو کریڈٹ جاتا ہے براہ راست خود ہی دین کا جو جامع تصور قرآن وحدیث میں ہے سمجھ لیا تھا، ہم آپ تو مولاناؒ کی کتابوں کو پڑھ کر دین کی تفہیم وافہام کرتے ہیں۔اور جماعت کے بڑے بڑے اکابرین اس اپروچ کو نہیں پا سکے۔البتہ جب مولانا مودودیؒ نے آواز دی تو انھوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

ہاں! البتہ جب وہ فراغت کے بعد ندوۃ العلماء گئے تو وہاں طلبہ کی لائبریری میں مولانا مودودیؒ کا آرگن ''ترجمان القرآن'' آتا تھا اس میں جو مضامین چھپتے تھے وہ مضامین ان کے دل کی آواز تھے۔یہ مولاناؒ کا بالواسطہ ربط ہوتا ہے اور دین کا جو مفہوم دوران تعلیم اخذ کیا تھا اور سمجھا تھا اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔یہ وضاحت میرے لیے ضروری ہے کہ جامعۃ لفلاح کے نصاب تعلیم کو جتنا بہتر طریقہ سے اسے بنانے اور سنوارنے میں ان کا حصہ ہے کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔کیوں کہ وہ درس نظامیہ کے اسرار سے بخوبی واقف تھے اور اس میں کیا کیا ترمیمات اور اصلاحات کی ضرورت ہے، اس سے بھی بخوبی واقف تھے۔

وہ لکھتے ہیں:'' آپ جانتے ہیں کہ مدارس نظامیہ میں ادبی کتابیں۔۔کچھ کچی، کچھ پکی، کچھ مفید اور کچھ مضر پڑھائی جاتی تھیں اور اب بھی ان مدارس میں اس پہلو سے کچھ زیادہ اصلاحات نہیں ہوئی ہیں، اب بھی یہ لوگ نفحۃ الیمن اور مقامات حریری سے چمٹے ہوئے ہیں جو''ادبی''نہیں مکمل طور پر''غیر ادبی'' ہیں۔خیر، عربی انشاو ترجمہ کا بالکل رواج نہ تھا اور اپنی اسی کمزوری کی تلافی کے لیے میں نے دارالعلوم ندوۃ العلما کا رخ کیا۔''(۷۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے مولاناؒ از خود ہی علم کی تمام بلندیوں کو چھوتے چلے گئے۔آج جس طرح ہمارے مدارس میں طلبہ کی تعلیم وتربیت کی رہنمائی ہوتی ہے انھیں میسر نہ تھی۔اپنی ذہانت اور فطانت کے نتیجے میں اپنے مقصد کو حاصل کرتے چلے گئے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ نے اپنے تمام تعلیمی مراحل سے گزر کر اپنے تدریسی کی زندگی کا آغاز مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے کیا۔مولانا سید حامد علی (سکریٹری جماعت اسلامی ہند) وہاں بہ حیثیت طالب علم

تھے اور مولانا نے مولانا مودودیؒ کے نظریات سے متعارف کرایا اور دونوں آگے پیچھے جماعت کے رکن بن گئے (۲۷) اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں مولانا مولانا مودودیؒ کی دعوت پر عربی بڑھانے کے لیے پٹھان کورٹ بلایا۔اس کے بعد جب دارالعروبہ قائم ہوا تو اس سے منسلک ہوگئے اور مولانا مودودیؒ کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہیں آئی ڈیڑھ سال کے بعد بریلی کی درس گاہ مدرسہ مصباح العلوم بریلی میں آ گئے۔ یہاں مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ بھی استاذ تھے۔جب ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح ایک شدید بحران کا شکار ہوا تو آپ کو بریلی سے بلاکر مدرس بنایا اس کے بعد پھر ثانوی درس گاہ رامپور تدریس کے لیے گئے۔اس کے بند ہونے کے بعد جماعت کے شعبۂ تصنیف سے وابستہ ہوئے، لیکن وہاں سے بھی جلد ہی استعفاد ینے پر مجبور ہو گئے۔اس کے بعد دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر گئے۔لیکن جب یہاں سے جماعت کے افراد کا اخراج ہوا تو آپ بھی یہاں ازخود چھوڑنے کا فیصلہ کیا،اور جامعہ کاشف العلوم، چتر پور، ہزاری باغ، چلے گئے۔ آخر میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج آ گئے۔ (اس دوران مولاناؒ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ اور جامعہ دارالہدی، آندھرا پردیش تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے تشریف لے گئے۔)

جماعت اسلامی کے ارکان کا مدرسۃ الاصلاح سے یہ اخراج اور یہ اقدام کا دراصل ایسی بنیادی تبدیلی کی طرف نقطۂ آغاز تھا جو جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، جامعہ کاشف العلوم چترپور اور جامعۃ الفلاح کے قیام پر منتج ہوا اور جماعت کی فکر پر اس عظیم یلغار نے مودودیؒ کی فکر کو چکنا چور کرنے کے بجائے جامعۃ الفلاح کی شکل میں جماعت اسلامی کے افراد بلریا گنج میں جمع ہوگئے تاکہ اپنے تعلیم وتربیت کے عظیم مشن کو جاری رکھ سکیں۔جس کی سربراہی مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کررہے تھے۔

اس بات کو یاد رکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ۱۹۶۴ء میں مولانا جلیل احسن ندوی کے آجانے سے تحریک اسلامی کے بچے جوق درجوق آنا شروع ہوگئے۔مولانا اس وقت پورے ہندوستان میں معروف اور مشہور تھے، والدین کو ان پر مکمل اعتماد تھا کہ جامعہ میں ان کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا عمدہ انتظام ہوگا، ایک ہی سال کے عرصہ میں یوپی کے دور دراز علاقوں سے اور اسی طرح اڑیسہ بہار بنگال اور آسام سے آنا شروع ہوگئے، ظاہر ہے مقامی لوگوں اور مقامی تحریک کے افراد کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ صرف ان کی شخصیت تھی جس کی وجہ سے جامعہ کے اندر اتنی تیزی کے ساتھ داخلے شروع ہوگئے کہ فوراً ایک بورڈنگ بنانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ میں خود جب چترپور عربی اول ختم ہونے کے بعد واپس گیا تو مولانا شہباز اصلاحی وہاں موجود تھے

انھوں نے کہا کہ یہاں تو عربی درجات ختم ہو گئے اب تم بلریا گنج جاؤ، وہاں مولانا جلیل احسن صاحب پہنچ گئے ہیں۔ظاہر ہے یہ بات ۱۹۶۴ء کی ہے۔

اس ضمن میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ مولانا جلیل احسن صاحب کی شخصیت اور ان کے درس وتدریس کا تجربہ، علوم القرآن کے ماہر، مولانا اختر احسن صاحب کے تربیت یافتہ اور فکر فراہی کے نمائندے اور ان کی بارعب شخصیت نے بلریا گنج کے مقامی لوگوں کو متاثر کیا، ابتدائی زمانوں میں مقامی لوگوں سے تعاون وتعلقات استوار کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ان کو بلریا گنج کی مقامی سیاست کا صحیح اندازہ تھا، ان کو لگام لگانے میں ان کا بڑا زبردست ہاتھ ہے۔ایک چھوٹے سے گاؤں میں اچانک، آنا فانا جامعہ کی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ان کے ساتھ پوری ٹیم تھی جن میں مولانا عبدالحسیب صاحب، مولانا شہباز اصلاحیؒ صاحب مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ صاحب مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ صاحب اور مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب اور سب ہی تعلیم وتربیت کے میدان میں اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا فکر فراہی کے تربیت یافتہ تھے، مولانا کو بچپن ہی سے قرآن کو سمجھنے کا شوق موجزن تھا اور اسی شوق وجستجو میں مدرسۃ الاصلاح گئے۔مولانا اپنی تعلیم کے دوران قرآن مجید کے علوم سے واقفیت کے لیے اس دور کے عظیم مفسر مولانا حمید الدین فراہیؒ سے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔وہ لکھتے ہیں: تمنا تھی کہ جب مجھے استفادہ کے لائق بنائے گا تو استاذ امام فراہیؒ سے قرآن مجید میں استفادہ کی سعادت حاصل کروں گا، لیکن کافیہ کے درس میں بجنور سے شائع ہونے والا سہ روزہ مدینہ استاذ کے پاس پہنچا۔ اس میں مولانا فراہی کی وفات کی خبر پڑھ کر فرمایا: لو تمہارے ضلع کا ایک نامور عالم قرآن چلا گیا، یہ خبر سن کر میرا کیا حال ہوا، اسکو اللہ کے سوا کون جا سکتا ہے۔اس طرح میری زندگی کی پہلی تمنا ناکام ہو گئی۔

ان کے اسباق میں بالکل سکھانے کا انداز اور طالب علم جیسے سوالات کر کے مسائل کو حل کرتے۔یہ حقیقت ہے ان کے جوہر اس کھل گئے جب انھوں نے مدرسۃ الاصلاح میں مولانا اختر احسن اصلاحی سے بھرپور استفادہ کیا۔

مولانا جلیل احسن ندوی تفسیر کے دوران مختلف تفسیروں سے استفادہ کرتے، بعض وقت مختلف مفسرین کے ترجمے کو سامنے رکھتے اور پسندیدہ ترجمہ کی نشان دہی کر دیتے۔لفظی ترجمہ پر توجہ دیتے، الفاظ کی تحقیق کے لیے مختلف لغات سے استفادہ کرتے۔المنجد، لسان العرب سے استفادہ کرتے، تفسیروں میں کشاف، تفہیم

القرآن اور مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ سے استفادہ کرتے۔

مشکل آیات حل کرنے اور سمجھانے کا فن حاصل تھا۔ وہ طلبہ کے ذہن کو اچھی طرح خوب سمجھتے تھے، عربی ادب پڑھانے کا فن انہیں خوب آتا تھا، وہ مشکل سے مشکل عبارت اور جملوں اور کلام کو آسانی سے طلبہ کے ذہن میں اتار دیتے تھے۔ نحوی تراکیب اور مشکلات کو حل کرتے مشکل عبارتوں کو حل کرنے میں انہیں کمال کی صلاحیت تھی۔ جب ایک مرتبہ کلام یا جملہ حل ہوگیا وہ ہمیشہ کے لیے طالب علم کے ذہن میں بیٹھ جاتا تھا۔ ان کی تعلیم کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ اسباق کی تیاری میں غایت درجہ کا اہتمام کرتے تھے اور بغیر مطالعہ کے کبھی درس نہ دیتے۔ جتنے بھی مراجع موجو ہوتے متعلقہ دروس کے لیے استعمال کرتے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے پاس اہم تفاسیر اور لغات اور احادیث اور شرح احادیث کی کتابیں موجود تھیں۔ اور اہم معاجم بھی تھے۔

بعض اوقات اگر درس مشکل ہوتا تو اس پر اعراب لگوا دیتے تاکہ طلبہ پہلے مطالعہ کرکے آجائیں، یہی وجہ ہے جب بھی درس میں کوئی مشکل امر ہوتا یا ایسا مسئلہ ہوتا جو طلبہ کو پہلے سے علم آجانا چاہیے تھا تو وہ ان امور طرف توجہ دلا دیتے۔ مثلاً اگر درس میں طباعت کی غلطی ہے تو ان کی نشان دہی کرکے ٹھیک ٹھاک کرا دیتے تھے۔ عربی ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ جدید اور قدیم دونوں ہی سے واقفیت تھی۔ انہیں اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمہ کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ عربی مجلّات اور عربی اخبارات پڑھنے کا معمول تھا اور اندرون اور بیرون سے شائع ہونے والے مجلّات و جرائد منگواتے تھے اور پابندی سے پڑھتے تھے، نئے الفاظ کی تحقیق کرتے تھے، جدید الفاظ کی چھان بین کرتے اور طلبہ کو ان الفاظ سے واقفیت بہم پہنچاتے۔ جدید اسلوب کو بتلاتے۔ عربی مجلّات و جرائد میں شائع ہونے والے مضامیں کو منتخب کرکے منتہی طلبہ کو ترجمے کرنے کے لیے دیتے۔ مولانا درس کے علاوہ ان طلبہ پر بھی توجہ دینے کی کوشش کرتے جو کسی اعتبار سے کم زور ہوتے اور اپنی خداد صلاحیتوں سے ان کی کم زوریوں کو دور کرنے میں اپنی کوشش میں دریغ نہ کرتے۔ جو طلبہ نحو صرف میں کمزور ہوتے ان کی رہنمائی فرماتے۔

مولانا کا درس اور تقریر سوز وگداز سے ڈوبا ہوتا تھا۔ جب وہ تقریر کرتے یا درس دیتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ذہن وقلب سامعین کو اتارتے جارہے ہیں۔ مختصر، جامع اور اپنے موضوع پر محیط ہوتا تھا۔

حالات حاضرہ سے واقفیت، عالم اسلام، تحریکات اسلامی کے بارے میں ان کا مطالعہ وسیع تھا، عربی جرائد ومجلّات سے کا مطالعہ غائر درجہ کرتے اور اخبارات پڑھنے کے ضروری اور معلوماتی حصوں کے تراشے

رکھتے تھے اور عالم اسلام اور ہندوستان میں ہونے حالات اور حوادث پر بڑی نگاہ رکھتے تھے اور اخبارات میں صحیح احوال نہ چھپتے یا نہ چھپنے کا امکان ہوتا تو وہ ریڈیو کے ذریعہ ان خبروں کو سنتے تھے۔

مولانا حالات حاضرہ سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور اس بات کے عادی تھے۔ عام مدارس کی روایت سے ہٹ کر ان کے اندر ملکی اور غیر ملکی حالات کے بارے میں جاننے کی جستجو اور کھوج ہوتی تھی۔

ملکی حالات سے باخبر رہتے اور خبریں جاننے کے ذرائع اس وقت زیادہ تر اخبارات ہی تھے۔ اس لیے ان کا مطالعہ روزانہ کرتے تھے۔ دعوت، صدق جدید، ہفتہ وار پرچے ماہنامے پرچے کا مطالعہ ان کی عادت ثانیہ تھی، وہ ذاتی طور پر بھی اپنے خرچ پر پرچے منگواتے تھے۔ اردو زبان کے علاوہ عربی زبان کے جرائد بھی پابندی سے مطالعہ کرتے تھے، جو ملک اور بیرون ملک سے آتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ ڈاک سب سے ان کے پاس آتی تھی پھر وہیں سے تقسیم ہوتی تھی، اخبارات پہلے وہ پڑھتے تھے پھر استاذ محترم مولانا عبدالحسیب کے پاس جاتی تھی، اس طرح دوسرے اساتذہ کے پاس منتقل ہوتی تھی، عصر کے بعد تمام اردو اخبارات اور عربی جرائد طلبہ کے لیے ہال میں رکھ دیے جاتے تھے۔ اس وقت تو ایک ہی بڑا سا ہال جو اس وقت کے نام سے ہے۔

مولانا پڑھنے ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے ایسی معلومات اور ایسی خبریں جو آئندہ رکھنے کے لئے ضرورت تھیں وہ ان کے تراشے رکھ لیتے تھے اور اہم اہم خبروں اور مضامین پر نشان لگا دیا کرتے تھے، اس وقت موجودہ طرز پر کوئی دفتری نظام نہ تھا، پورا نظام صدر مدرس کے گرد گھومتا تھا۔

عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات پر بے چین ہو جاتے تھے اور معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ نہ ہوتا تھا، ایسے موقع پر کسی طرح ریڈیو حاصل کر کے رات کو صحیح صورت حال سے آگاہی حاصل کرتے، چنانچہ اسرائیل اور مصر کی جنگ کے موقع پر ساری صورتِ حال جاننے کے لیے رات کو ریڈیو سنتے تھے۔

مولانا شہباز ہندی اصلاحی

جامعۃ الرشاد اور کاشف العلوم سے مولانا جلیل احسن ندویؒ اور ان کے اساتذہ اور طلبہ کے آجانے کے بعد کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اپنی کوششوں سے انیس الدین مرحوم کو خط لکھ کر مولانا شہباز صاحب کو بلانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مولانا شہباز ہندی اصلاحی [۱۹۲۷ء۔ ۹ نومبر ۲۰۰۲ء] ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھیں میں نے بڑی کوششوں سے مختلف لوگوں کی سفارش کے ذریعہ جامعۃ

الفلاح بلایا تھا۔ کبھی کسی مضمون کو پڑھانے سے انکار نہیں کیا، جب جو چیز دی گئی اسے بحسن وخوبی پڑھایا۔ نظم جامعہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ بڑے اچھے اور مربی تھے۔''(۷۳) جب کہ چترپور میں بھی ان کی شدید ضرورت تھی۔ وہاں کی درس گاہ ان ہی کے دم قدم سے آباد تھی، وہاں سے رخصت ہونے بعد سے وہ درس گاہ اجڑ گئی اور وہاں کی رونق اور تعلیم وتربیت کا معیار روز بروز گرتا چلا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب وہ درس گاہ بند ہو گئی ہے اور لڑکیوں کا اسکول قائم ہو گیا ہے۔

اس زمانہ میں مولانا شہباز اصلاحی درس گاہ کے صدر مدرس تھے۔ وہ معلم اور مربی کی حیثیت سے طلبہ کے ہر طرح کے ذمہ دار تھے۔ مولانا شہباز مرحوم چترپور کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھاتے اور بستی کے اندر مختلف پروگرام میں تقریر کر کے دعوت دین کے فرائض انجام دیتے۔ اس کی وجہ سے بستی میں دین کی اشاعت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا اور عوام الناس میں دینی بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میرا قیام ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک رہا۔ تین سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کی، جہاں جماعت اسلامی ہند کا نصاب روبہ عمل تھا، میرا داخلہ درجہ سوم میں ہوا اور درجہ پنجم کے اختتام تک ابتدائی تعلیم ہوئی۔ مولانا محترم تمام مضامین پڑھاتے تھے، مولانا ایک مربی کی حیثیت سے بچوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے اور زبردست مقرر تھے، انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ بچوں کی تعلیم وتربیت اس انداز سے ہو کہ دین حنیف سے صحیح معنوں میں وابستہ رہیں، وہ بچوں کو روزمرہ کی دعائیں یاد کراتے، سونے اور اٹھنے کی دعائیں یاد کراتے، مولانا مودودی کی فکر سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ دین کو خالص سیاسی رنگ میں نہ پیش کیا جائے یہی وجہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے نصاب اور پروگرام میں وہ بڑی گہری اور کڑی نظر رکھتے تھے اور جا بجا ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلایا کرتے تھے۔ انہیں اپنی بات کہنے میں کوئی باک نہیں تھا اور ان کی اصلاح کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر چیز کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے تھے اور بہت ہی مدلل انداز میں کہتے۔ قرآن وحدیث کا رشتہ کبھی بھی نہ ٹوٹا۔ سلوک ومعرفت میں انکا اپنا انفرادی معاملہ تھا۔ وہ تصوف وسلوک سے شروع سے متاثر تھے، تعلیم وتربیت میں اس کو بالکل الگ رکھتے، اور اس میں دخل نہ ہونے دیتے۔ اگر کسی نے اس موضوع کو چھیڑ دیا تو اپنے دلائل دیتے اور اپنی بات کو پیش کرتے۔

مولانا شہباز اصلاحی ایک تحریک تھے

مولانا مسلسل جدوجہد اور ایک تحریک سے عبارت تھے۔ وہ سرچشمہ تھے، دین کے پیاسوں کی پیاس

بجھاتے تھے، کسی لمحہ بھی اپنی ذمہ داری سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ اپنی تعلیم وتربیت کی تحریک مدرسۃ الاصلاح سرائمیر سے شروع کرتے ہوئے بھاگل پورشہر بہار گئے، چترپور ہزاری باغ آئے، چترپور سے جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ تشریف لائے، بھٹکل، کرناٹک گئے، بھٹکل سے ندوۃ العلماء لکھنو، یوپی گئے۔ ان کا سفر ایسا تابناک اور روشن تھا کہ کسی جگہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوئے، ہر جگہ دین کے چراغ کو روشن کرتے رہے، دین کے سپاہی تھے کبھی بھی تھکنے کا نام نہیں لیا۔ جو بھی محاذ ہوتا اس کو سرانجام دیتے، تدریس کا کونسا شعبہ تھا جس کو نہ انجام دیا ہو۔ نظم ونسق سے تعلیم وتربیت تک تمام شعبوں کو بہت خوبی سے انجام دیتے تھے، بےلوث انسان تھے، اخلاص کے مجسم تھے، ایسا انسان جسے ہر وقت اپنے منصب اور ذمہ داری کا احساس تھا۔

مولانا کا شاعرانہ ذوق

اللہ تعالیٰ نے جہاں انہیں تعلیم وتربیت کے میدان میں بے پناہ صلاحیت ودیعت کی تھی وہیں اللہ تعالیٰ نے شاعری کا بہت ہی عمدہ ذوق دیا تھا۔ وہ اقبال کو بہت پسند کرتے تھے، نعیم صدیقیؒ کے اشعار سے بے حد متاثر تھے۔ وہ کہتے تھے ان کے اندر دین کی بڑی حمیت تھی اور اپنے اشعار میں دین کے تقاضوں کے اظہار میں جو ملکہ حاصل تھا وہ علامہ اقبال کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ظاہر ان کی شاعری میں تحریک اسلامی کے لیے ''عزیمت اور اولوالعزمی'' کے سلسلہ میں جو بلندی پائی جاتی ہے وہ کہیں نہیں ہے اور عقلیت اور فلسفہ پسندی کو بالکل خارج کردیتے ہیں۔

مولاناؒ جو نظمیں کہتے تھے جو امنگوں سے بھری ہوتی تھیں اور جو دینی جذبات کو ابھارنے میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ ذہن کو صحیح رخ پر ڈالتی ہیں۔ ''نیکی کے جانباز سپاہی نیکی کو پھیلائیں گے۔'' یہ نظم ان کے اندرونی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے اور دوسری بات یہ کہ ایک عام اور سادہ زبان میں بچوں کے ذہن کو اسلامی خطوط پر رخ موڑنے کے لیے بہترین کوشش ہے۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قوت یادداشت بھی دے تھی، ہر موقع پر اور برمحل شعر کہنے کے عادی تھے، اردو، فارسی کے اشعار اور سنسکرت کے دوہے تو اپنی گفتگو کے دوران اس طرح سنا دیتے تھے کہ وہ اس سے بہتر موقع تھا ہی نہیں۔

مولاناؒ کی تحریکی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔ جب وہ مدرسۃ الاصلاح میں تھے اور یہ تحریکی زندگی کا سلسلہ شروع ہوکر ندوۃ العلماء جانے تک رہتا ہے اور وہاں جاکر وہ جماعت سے

مستعفی ہو جاتے ہیں۔ وہاں رہ کر تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے معذور ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی زندگی ایک نیا باب شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں رہ کر اپنی تصوف کی زندگی شروع کر دیتے ہیں اور یہ ان کی زندگی کا دوسرا باب ہے اس دور کی زندگی کو ''ذکر شہباز'' میں مرتب مولانا محمد اسماعیل فلاحی استاد تفسیر جامعۃ الفلاح نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے البتہ ان کی اصل تحریکی زندگی کا سنہرا حصہ جو طالب علمی سے شروع ہوتا ہے اور ندوۃ العلماء میں جا کر بحیثیت استاد کے ختم ہو جاتا ہے اس حصہ کو لکھنے اور جمع کرنے کی ضرورت ہے، ''ذکر شہباز'' میں کچھ نہ کچھ تحریکی زندگی کا مواد ضرور آیا ہے لیکن بہت معمولی اور مختصر اور ناکافی ہے۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت تحریکی اعتبار سے آغاز کار میں جماعت کے صف اول کے علماء میں ہوتا تھا اور ابھرتی ہوئی قیادت کے اہم رول ادا کرنے کی صلاحیت ان کی تحریکی زندگی میں نمایاں ہو چکی تھی۔ اور ان کی علمی صلاحیت اور تدریسی خدمات کو احاطہ میں لینا ہوگا۔

جامعۃ الفلاح میں دوران تعلیم اساتذہ میں ہمہ ہم آہنگ

''تعلیم کے دوران کسی مرحلہ میں اساتذہ کے درمیان ایسا اختلاف دیکھنے کو نہیں ملا جو مدرسہ کے لیے نقصان دہ ہو۔ سب ہی پوری یکجہتی کے ساتھ طلبہ کی تعلیم وتربیت میں لگے رہتے تھے اور آپس میں اتنا اتفاق تھا کہ جو کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ایک چھوٹی سی بستی میں ایک اسلامی معاشرہ کا نمونہ تھا، یہ ماحول اور یہ فضا طلبہ کی تعلیم کے حصول کے لئے بہت ہی صحت مند تھا، یہ بات تقریباً عام تھی قرآن وحدیث سے متعلق کسی قسم کا سوال جو کسی طالب علم کو نہیں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو وہ کسی استاد سے پوچھ کر حل کر سکتا تھا اسے کسی قسم کا حجاب نہیں ہوتا کس استاذ سے اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے طلبہ کے اندر اس طرح کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا وہ سیکھنے میں آزاد ہیں جس سے چاہیں اپنی تعلیمی مدد حاصل کر لیں۔

ان اساتذہ میں مولانا شہباز اصلاحی تو ہر اعتبار سے اس لائق تھے۔ طلبہ ان سے ہر فن کے بارے میں اپنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے کے حاضر ہو جاتے تھے۔ وہ طلبہ کی بھرپور مدد کرتے تھے اور وقت کی کوئی پابندی مانع نہیں ہوتی تھی۔ وہ طلبہ کے لیے ایک کھلی کتاب تھے اور طلبہ کے ایک صاف شفاف چشمہ تھے جن سے طلبہ ہر وقت سیراب ہوتے تھے۔ ایسا بھی تھا کہ ہر وقت طلبہ کی ہمت افزائی کرنے میں کوئی دریغ نہ کرتے اور طلبہ کی کم زوریوں کی طرف اشارہ کرتے رہتے تھے۔'' (۴۷)

جامعۃ الفلاح کا نصاب اور اس کا پس منظر

جامعہ کا نصاب دو اہم افکار کا مجموعہ ہے۔ ایک نصاب تعلیم کا وہ فکر ہے جو امام فراہیؒ نے تیار کیا جس

میں اس بات پر زور ہے کہ قرآن کو براہ راست سمجھا جائے اور دوسری فکر مولانا مودودیؒ کے پیش کردہ نصاب سے ماخوذ ہے، جس میں قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ جدید علوم کا اہم حصہ ہے، جامعہ کا نصاب ان ہی دوافکار سے مرکب ہے۔ چنانچہ نصاب اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ قرآن کو براہ راست سمجھا جائے۔اور قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ نئے علوم سے طلبہ کو روشناس کیا جائے۔تا کہ جدید تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔

جامعہ کے ماہرین تعلیم اور اس کے بہی خواہوں نے جامعہ کا نصاب ایسا تیار کیا جو عام مدارس کے نصاب سے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے طلبہ کے اندر لکھنے اور بولنے کی صلاحیت کے ساتھ ان کے اندر داعیانہ تڑپ پیدا کرنا تھا اس کے پیش نظر اس بات کی کوشش کی گئی کہ ایسا نصاب تیار ہو جوان کے ذہنوں میں کتاب وسنت کی تعلیم کے ساتھ جدید علوم سے واقفیت ہو سکے تا کہ نئے دور کے چیلنجوں کو جان سکیں اور ان کا بھر پور مقابلہ کر سکیں، ایک داعی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دور حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے جن علوم کی آگاہی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے اس کے نصاب میں سیاسیات، معاشیات انگریزی جیسے مضامین کی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔اور شروع سے اخیر تک اس بات کو مدنظر رکھا گیا کہ اسکولوں میں جو معیار ہوتا ہے وہ معیار یہاں بھی قائم رہ سکے۔ یہ ایسا چیلنج تھا اور ہے تا کہ عربی علوم کے معیار کو باقی ہوتے ہوئے نصاب تعلیم میں شامل ان جدید علوم کے معیار کے حصول کو کیسے آسان بنایا جاسکتا ہے۔اس کا صحیح اندازہ جامعہ کے ذمہ داران ہی بتلا سکتے ہیں کہ جامعہ نے اس معیاری تکمیل میں جو جدجہد کیا ہے اس میں کتنی کامیابیاں ہوئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دور حاضر کے نت نئے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اوران کو سامنے رکھ کر نصاب تعلیم جاری رکھنا کتنا مشکل ہوگا اور کتنا آسان ہوگا۔ جتنا نصاب تعلیم مرتب کر دینا آسان ہے اتنا اس نصاب کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہے۔

آغاز کار میں جامعہ کا نصاب کس طرح کا تھا اس کی تفصیل مولانا محمد عمران فلاحی استاد جامعۃ الفلاح بلریا گنج بتلاتے ہیں:''۱۹۵۹ء میں درجہ ششم کا آغاز ہوا اور اس کے نصاب میں عربی کی کتاب منہاج العربیہ داخل کی گئی۔کوئی با قاعدہ عربی نصاب نہیں تھا، عربی کے نام پر یہی کتاب ہم لوگ پڑھتے تھے۔۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء یہ عبوری دور رہا۔اس دوران درجہ ہفتم وہشتم کے ساتھ ساتھ عربی اول کے لیے غیر واضح اور غیر مربوط عربی کتب کا اضافہ ہوا۔دھیرے دھیرے شکل واضح ہوتی گئی اور با قاعدہ نصاب نافذ ہوا اور جماعت اسلامی ہند کی تیار کردہ درسی کتب بھی نصاب کے لیے منظور کی گئیں اور ایک جامع نصاب زیر عمل آیا اور اس دوران کئی اساتذہ

نے درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔مگر مفتی عبدالرؤف صاحب کا نام نمایاں ہے۔''(۵۷)ہمیں جو بات معلوم ہے وہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحسیب صاحب نے آتے ہی ایک پراسپکٹس تیار کیا تھا جو ظاہر ہے مولانا جلیل احسن صاحب کے مشورہ اور انتظامیہ کے باہمی اتفاق سے طے ہوا ہوگا۔نئے نصاب کی تیاری میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ لگ گئے اور مولانا جلیل احسن ندویؒ کے ساتھ مل کر جدید وقدیم کا نصاب تیار کیا، جو عصری علوم کا مرکب تھا اور جو جدید وقدیم کا سنگم تھا۔اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ دونوں ہی مدرسۃ الاصلاح کے نصاب سے بخوبی واقف تھے اس لیے نصاب کم وبیش وہیں کا نصاب تھا اس میں اضافہ جدید علوم کا کیا گیا ہے جس میں سیاسیات، معاشیات اور انگریزی کے مضامین شامل ہیں۔اسی پراسپکٹس میں مولانا عبدالحسیب صاحب نے اس نصاب کو قدیم اور جدید کا سنگم قرار دیا تھا۔

پہلا نصاب جسے مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ تعلیمی کمیٹی کے ساتھ مل کر بنایا تھا اس میں ''کور سبجکٹس''، قرآن وحدیث اور ادب کی کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی نحو وصرف کا کوئی معیار نہیں متعین تھا ایک طرح سے درس نظامی کی کاپی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔اور براہ راست قرآن فہمی اور اس کی تدریس کا واضح نقشہ اس نصاب میں نہیں تھا، اس کو مولانا جلیل احسن ندویؒ اور عبدالحسیب اصلاحیؒ نے بدل دیا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیل احمد کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ان کی انتھک کوششوں سے جامعۃ الفلاح کی داغ بیل ڈال دی گئی اور اور عربی اول سے عربی چہارم تک کی تعلیم شروع ہوگئی۔

۱۹۶۲ء کا نصاب

اوپر کے تاریخی جائزہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے جماعت کے افراد کو ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو مستقبل میں مکتب اسلامی کو ترقی کی راہ پر لگا کر ایک ایسا نصاب وضع کرے جو جماعت کی فکر کو آگے بڑھا سکے لیکن اس جماعتی فکر کے حامل افراد دو طرح کے تھے جو مدرسہ کو دو سمتوں کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔اس کی واضح مثال وہ نصاب ہے جو ۱۹۶۲ء میں تیار ہوا۔اس نصاب میں جو درجات کی ترتیب رکھی گئی وہ بالکل اس سے مختلف تھی جو ۱۹۶۴ء سے درجات کے ناموں سے پتہ چلتا ہے۔۶۲ء کے نصاب میں درجات اس طرح متعین کیے گئے اور یہ نصاب درس نظامی کا چربہ تھا جس میں مولوی اور عالم کی اصطلاح ہوتی ہے اور اس لحاظ سے اس نصاب میں درجہ بندی کی گئی تھی، اور اس میں ایسے سبجکٹس کا مجموعہ تھا جو اس بات کے غماز تھے یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ تحریک کے علاوہ درس نظامی کے درس گاہوں میں سیٹ ہو جائیں گے یا پھر اس نصاب

کی بنیاد پر کسی سرکاری ملازم ہونے کے حق دار ہو جائیں گے۔اس نصاب میں تحریک کے افراد پیدا کرنے کے لیے کوئی بھی مضمون نہیں تھا، جو اس کی رہ نمائی کرتا۔قرآن فہمی کے قرآن پڑھانے کا کوئی بھی طریقہ نہیں وضع کیا تھا جو اس کی طرف رہنمائی کرتا ہو،حتی کہ جماعت اسلامی ہند نے جو نصاب تیار کیا تھا اس کا بھی اس میں نہیں خیال کیا تھا جماعت کے نصاب کی کوئی بھی اس میں شامل نہیں تھی۔ظاہر ہے یہ نصاب ان تقاضوں کو پورا کرنے میں کلی طور پر ناکام تھا جو قرآن فہمی اور تحریک کے افراد پیدا کرنے لیے ضروری تھا۔''تاریخ جامعہ'' کے صفحات میں (۱۱۶تا۱۱۹) اس نصاب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کے جامعہ میں آنے کے بعد ہی اس نصاب میں نمایاں تبدیلی ہوئی جو ۶۲ء میں بنی تھی۔اس نصاب کا صحیح سمت متعین ہوا اور اس نصاب میں قرآن پڑھانے کے طریقہ کو متعین کیا گیا۔عربی زبان، جو قرآن کو سمجھنے کے لیے اساس ہے،ان عربی کتابوں کو شامل کیا ہے اور ساتھ منطق او فلسفہ کی کتابوں کو بھی کو جگہ دی گئی، اس کے ساتھ جدید علوم کے سبجیکٹس کو بھی نصاب کا حصہ بنا۔

یہ دونوں حضرات جماعت کے رکن تھے اور مولانا فراہیؒ کی حامل فکر کی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے،اس لیے ان دونوں حضرات نے اس نصاب کو بالکل بدل رکھ دیا جو ۶۲ء میں تیار ہوا تھا اور اس کی طرف اشارہ ماسٹر جلیل صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جو انھوں نے مولانا جلیل احسن ندویؒ کے بارے میں لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں''۱۹۶۲ء میں ایک روز عصر کے بعد ڈاکٹر خلیل صاحب ناظم جامعہ اسلامیہ بلریا گنج نے مجھ سے مشورہ کیا کہ مولانا جلیل احسن سے مل رہے ہیں،بلا لیا جائے؟ میں نے بلا تامل اثبات میں جواب دیا۔میں جامعہ اسلامیہ بلریا گنج کی تعلیمی کمیٹی کا ممبر اور کنو یز تھا۔مولانا موصوف چتر پور سے (بہار) سے بلریا گنج آ گئے۔اپنے ساتھ چتر پور سے کچھ عربی طالب علم لائے، چنانچہ عربی اول تا عربی چہارم تک درجات کھل گئے، جامعہ اسلامیہ کا نام بدل کر جامعۃ الفلاح رکھا گیا۔جامعہ اسلامیہ کا جو تعلیمی خاکہ ہم نے بنایا تھا مولانا موصوف نے اس کو موڑ کر عربی کی طرف کر دیا۔مولانا کی رائے کے خلاف جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔اس لئے اگر میں موصوف کو جامعۃ الفلاح کی موجودہ عربی تعلیم کا بانی کہوں تو نا مناسب نہ ہوگا۔۔(۶۷الف)

اسی طرح مولانا محمد عیسی قاسمیؒ جب تعلیم سے فراغت حاصل کی تو مدرسہ اسلامیہ (موجودہ جامعۃ الفلاح) میں بحیثیت عربی استاد ۱۹۵۹ء میں تقرر ہوا۔''(۶۷ب) اور جب آپ کا تقرر ہوا تو اس وقت صرف درجہ پنجم تک تعلیم ہوتی تھی اور ان کی شدید خواہش تھی کہ یہاں ایک دینی و مذہبی درسگاہ قائم ہو۔''چنانچہ مولاناؒ نے

۱۹۵۹ء میں ہی درجہ ششم کا آغاز کیا عربی کتابیں داخل نصاب کیں یہیں سے عربی درجات کا سلسلہ چل پڑا اور ساتھ ہی مکتب نام تبدیل کر کے جامعہ اسلامیہ کر دیا۔ مولاناؒ نے اس ''ننھے پودے'' کو کھاد پانی ڈالنا شروع کر دیا تا کہ جلد از جلد ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لے، لیکن ذمہ داران جامعہ ہی میں سے کچھ لوگ آگے آئے اور اسے ایک معیاری انٹر کالج بنانے کے لئے غور وخوض شروع کر دیا۔ اس پر مولانا سے شدید اختلاف ہو گیا اور یہ اختلاف اس قدر شدید اختیار کر گیا کہ آپ ناراض ہو کر ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کو بحیثیت عربی استاد درس گاہ اسلامی، مرازا بگان مسجد بیل گچھیا، کلکتہ چلے گئے۔'' (۶۷ج) اوپر کے دونوں حوالوں سے یہ بات مکمل طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اول روز سے یہاں کے ذمہ داروں کی مسلسل اور بھرپور کوشش رہی ہے کہ اسے انٹر کالج بنا دیا جائے۔ ماسٹر عبدالجلیل صاحب کا یہ بیان کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے ہمارے خاکہ اور پلان کو بننے سے روک دیا اور ہمارے نصاب کو ''عربی نصاب بنا دیا'' اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مولانا محمد عیسی قاسمیؒ صرف اس لیے مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے کہ ذمہ داران اسے کالج بنانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کوشش کبھی نہیں تھمی بلکہ مشہور سائنسداں ماسٹر اکرام الدینؒ اور جماعت کے رکن ۱۹۷۴ء میں اسی لئے بلائے گئے کہ مدرسہ کو کالج کی شکل دے سکیں، لیکن ان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہوا۔ کیونکہ اس وقت حالات بدل گئے تھے اور صاحب فکر اساتذہ جن میں مولانا شہباز ہندی اصلاحیؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی موجودگی میں ذمہ داروں کا یہ پروگرام فیل ہو گیا۔ اسے کالج بنانے کی قیادت ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ناظم جامعہ کر رہے تھے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے یہ کوشش نہیں رکی اور اس نصاب میں ضرور اس بات کی کوشش کی گئی نصاب کی اصل روح ختم ہو جائے، اس میں وہ کامیاب ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ بالکل ابتدائی زمانہ میں علوم جدیدہ کا نصاب میں اتنا ہی حصہ تھا جتنا قرآن وحدیث کے معیار میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے۔ لیکن جیسے جیسے سال گزرتے گئے نصاب میں اس انداز سے تبدیلی ہوتی چلی گئی اور قرآن وحدیث کے معیار میں فرق آتا گیا۔ نصاب میں قرآن، حدیث اور عربی ادب جو جامعہ کا ''کور سبجکٹس'' ہے ان کی تعلیم میں کٹوتی کی گئی اور علوم جدیدہ کے نصاب کو بھاری بھرکم بنا دیا گیا تا کہ فارغین طلبہ کا یونی ورسٹیوں میں آسانی سے داخلہ لے سکیں۔ اس طرح قرآن وحدیث کا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ علوم جدیدہ کے نام پر طلبہ پر قرآن وحدیث اور ادب کے معیار کو گھٹا دیا گیا، تعلیم کے اوقات اتنے ہی تھے اور ہیں جتنے شروع میں تھے اور انہی اوقات میں وہ تمام سبجکٹس پڑھائے جاتے ہیں جو پہلے ان ہی اوقات میں علوم جدیدہ کے سبجکٹس اور ''کور سبجکٹس'' پڑھائے جاتے تھے۔

علوم جدیدہ کے مضامین کو بڑھا کر ''کور سبجکٹس'' میں کمی کی گئی اور خوب ردوبدل کیا گیا اور معیار گھٹایا گیا جیسے ''کلیلہ دمنہ'' کتاب عربی دوم سے عربی سوم میں داخل نصاب ہوئی اور منثورات اور مختارات کو جو دو اہم کتابیں تھیں خارج نصاب ہوگئیں۔ یہ دونوں ہی کتابیں عربی ادب کی اچھی کتابیں سمجھی جاتی ہیں اور معیاری بھی ہیں۔اس کے ساتھ ہی طلبہ کی ذہنی تربیت کرتی ہیں۔اوران دونوں کتابوں کی تعلیم سے اصلاح نفس کی تربیت میں ایک اہم کردار ہے۔اس تبدیلی سے وہی نتائج نکل کر سامنے آ گئے جو دوسرے نظام تعلیم کا ما حاصل تھا۔اس لیے دوسرے نظام تعلیم میں اوراس میں کوئی بہت زیادہ فرق نہ رہا۔قرآن فہمی اوردعوت اسلامی کی تحریک جو اس نظامِ تعلیم کا خاصہ تھا اس نظام تعلیم سے نکلتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ہمارا نصاب بھی اسی مقصد کے حصول میں لگ گیا جو دوسرے نصابوں میں ہے۔اور یہ نصاب اس ڈگر پر چل پڑا جو قدیم نصاب مدارس میں عام تھا۔جامعہ کو یونیورسٹی یا کالج بنانے کا خواب تو نہیں پورا ہوا، البتہ مسلسل کالج بنانے والوں کی کوشش سے اتنی بات ضرور ہوئی کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔ظاہر ہے اگر کسی یونیورسٹی میں کسی طالب علم کو جانے کے لیے عالمیت کا کورس پورا کر کے فوراً اس کا رخ کرنا ہوگا تو اسے جامعہ کا بقیہ نصاب اس کے لئے بے معنی ہوکر رہ جائے گا۔اور یونیورسٹیز میں داخلے کے لیے جانے والے طلبہ کی تعداد کم از کم آدھے سے زیادہ ہوتی ہے۔اور جب ذمہ داروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہورہے ہیں تو ''دعاۃ'' پیدا کرنے کے لیے مختلف ذرائع اپنا جانے لگے اور جامعہ کا نصاب بے کار ہوکر رہ گیا۔اس طرح پیوند کاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ہم اپنے مقصد سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔قرآن فہمی کے طریقہ کار کو نصاب میں سمو گیا تھا اور جس مضبوطی سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اب وہ ماند پڑتا جارہا ہے۔طلبہ جامعہ میں داخلہ لیتے ہیں اور ساری توجہ یونیورسٹی کی طرف رہتی ہے۔مقصد طے کرنا ہوگا۔اور واضح ڈائرکشن طے کرنا ہوگا۔مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ ہمیشہ اس صورتحال کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور انھوں نے اپنے دور میں جو معیار تعلیم بنایا تھا وہ اسے اپنی زندگی کے آخری دور میں نہ دیکھ سکے۔ان حالات کو دیکھ کر بہت ہی کبیدہ خاطر ہوتے تھے۔

نصاب میں تبدیلیاں اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا رول

'جامعہ کی تاریخ' کی روشنی میں یہ بہت واضح ہے کہ اصل نصاب تعلیم کا آغاز ۱۹۶۴ء سے شروع ہوا جو جامعہ کے متعین کردہ مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔البتہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۸ء تک مکتب اسلامیہ میں اطفال، اول، دوم، اور سوم کے درجات کے نصابات کے بارے میں معلومات مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہیں۔پہلی

مجلس تعلیمی کی تشکیل ۲۰ جون ۱۹۵۶ء کو عمل میں آئی۔ ۱۹۵۷ء میں درجہ چہارم اور ۱۹۵۸ء میں درجہ پنجم کے درجات میں اردو، ہندی، ناظرہ، دینیات، اور ریاضی کی تعلیم جاری کی گئی اور ۱۹۵۹ء میں درجہ ششم میں بعض ابتدائی عربی کتابوں کو شامل نصاب کیا گیا۔'' (۷۷)

جامعۃ الفلاح کے نصاب میں تبدیلیوں کے لیے ان تاریخوں میں ریویوز کے لیے اجلاس ہوئے۔ ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۶ء، اور ۱۹۹۳ء۔ ان تاریخوں میں جامعۃ الفلاح کے نصاب کے خدوخال مسلسل متعین کئے جاتے رہے۔ جس کی تفصیل تاریخ جامعہ میں موجود ہے۔ (۷۸) ۲۹ / جون ۱۹۶۴ء کو مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ کے تیار کردہ نصاب کو مولانا جلیل احسن ندویؒ اور مولانا عبد الحسیب اصلاحیؒ نے مکمل طور پر ریویو کر کے جامعہ کے مقاصد کے عین مطابق بنایا۔

اسی طرح تعلیم کی تیسری مجلس ۱۹۶۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ شریک ہوئے۔ جس میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔

تفصیل کے لیے' تاریخ جامعہ' میں ص ۱۲۰ میں موجود ہے۔ اسی میٹنگ میں ایک مخصوص کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کو عربی ادب کے لئے نئے نصاب کی تنفیذ کی ذمہ داری دی گئی۔ ۱۰ اپریل ۱۹۸۵ء کو ۱۹۸۰ء کے مجوزہ نافذ شدہ کورس پر جائزہ ہوا اس تعلیمی کمیٹی میں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ شریک تھے، اس مجلس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا عبد الحسیب اصلاحیؒ کو مدعو کیا گیا۔ (تاریخ جامعہ ص ۱۲۲۔ اور ۲۰ فروری ۱۹۸۶ء کی مجلس تعلیمی برائے نصاب جامعۃ الفلاح میں اصلاح وترمیم کے لیے ۱۹۸۵ء کے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے میٹنگ ہوئی۔ اس میں شریک ہوئے اور اس میں مولانا صدرالدین اصلاحیؒ بھی شریک تھے۔ (۷۹)

جامعۃ الفلاح کا قیام دراصل ایک ایسے نصاب کی بنیاد پر ہوا جسے قدیم اور جدید کا سنگم کہا جاتا ہے، ظاہر یہ ایک نیا تجربہ تھا، عربی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے مضامین شامل نصاب کئے گئے، قرآن وحدیث، فقہ عربی ادب اور منطق کے ساتھ ساتھ معاشیات، سیاسیات اور انگریزی کی تعلیم کو نصاب میں جگہ دی گئی، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ طلبہ ایسے علوم بھی سیکھیں جن کی میدان عمل میں اشد ضرورت ہے۔ لیکن یہ نصاب بیک وقت تو نہیں تیار ہوا، ذمہ داران جامعہ نے مختلف مراحل میں تیار کیا، جامعہ کے آغاز میں ۵۔۶ سالوں میں جدید علوم کی تعلیم ہوئی، لیکن پورے پلان اور منظم پروگرام کے تحت نہ تھا۔ اس میں انگریزی بھی شامل ہے، اوران کا کوئی معیار متعین نہ ہو سکا تھا۔ وقت جیسے جیسے گزرتا گیا ان علوم کی تعلیم میں بہتری اور معیار میں بہتری

ہوتی چلی گئی، تجربہ کے بعد یہ نصاب جدید شکل میں ماہر تعلیم کے مشورہ سے پھر سے تبدیل ہوا اور ہر کلاس میں کتابوں کا انتخاب میں اوراس کے مضامین کو متعین کیا گیا۔سرکاری اسکولوں میں جو جدید علوم داخل نصاب تھے بشمول انگریزی اسے سامنے رکھ کر جامعہ کا نصاب تیار ہوا اور انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے کورس کے مطابق وہ کتابیں شامل نصاب کی گئیں۔

یہ بالکل نیا تجربہ تھا، یہ بہت مشکل مسئلہ تھا کہ جدید وقدیم میں کتنا توازن رکھ کر طلبہ کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا جائے۔یہ ایک سوال تھا اور اب بھی سوال باقی ہے۔اس توازن کو برقرار رکھنے میں کتنی کامیابی ہوئی ہے یہ تو جامعہ کے ارباب حل وعقد ہی بتلا سکتے ہیں۔اس لیے کہ قرآن وحدیث اور ادب بھاری بھرکم کورس کو ہضم کرنے کے بعد جدید علوم کے نصاب کو پڑھانا کتنا آسان ہوگا اور پھر طلبہ کی صلاحیت اور اہلیت کو باقی رکھنا کتنا ممکن ہوگا اور طلبہ کتنے متحمل ہوں گے۔

۱۹۶۲۔۱۹۶۱ کے دور میں ایک پلان اور نصاب تعلیم کی تدوین کی تمہید اور ابتدا ہوئی۔یہ بات مسلم ہے، یہ صرف بالکل ابتدائی مرحلہ تھا اس وقت نہ افراد تھے اور نہ مادی وسائل تھے۔اور یہ بات ایک حقیقت ہے کی مادی وسائل اور افرادی قوت کے بغیر کسی تنظیم کی اٹھان اور ترقی ممکن ہی نہیں۔اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ۱۹۶۴ سے جامعہ کی اصل تاریخ شروع ہوتی ہے۔اس پہلے جتنے واقعات ہوئے سب کے سب تمہیدی تھے۔اس پلان اور خاکے کو پر کرنے کی تکمیل کا آغاز ۱۹۶۴ء سے ہوا، اس سے پہلے جامعہ کے پاس افرادی قوت اور مادی وسائل نہ تھے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور تدریس کا طریقہ

مولاناؒ نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ۱۹۵۰ء میں فراغت حاصل کی، اس کے بعد آپ کی تدریسی کیریئر کا آغاز ہوجاتا ہے، سب سے پہلے آپ تدریس کے لیے محمد حسنین سیدؒ، اسلام نگر، دربھنگہ (آپ اجتماع ارکان جماعت اسلامی مشرقی یوپی وبہار، ۲۱،۲۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء بمقام دربھنگہ بہار میں شریک تھے، اور آپ بہار کے اولین وسابقین ارکان میں سے تھے اور اس وقت جماعت کا لٹریچر آپ ہی کے توسط سے دستیاب ہوتا تھا) کی دعوت پر ۱۹۵۱ء میں ان کی درسگاہ اسلامی میں تشریف لے گئے لیکن وہاں تین چار ہفتہ ہی رہ سکے اور وہاں کی آب وہوا راس نہیں آئی، اور وہاں سے واپس آگئے۔پھر اسی سال عید بعد مولاناؒ بقرعید تک بحیثیت استاد کے قیام کیا۔اور ۱۹۵۵ء۔۱۹۵۲ء کے دوران مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ نے رامپور بلا لیا پھر یہاں سے علی

گڑھ تدریس کے لیے آ گئے اور یہاں تین سال قیام رہا۔

علی گڑھ میں قیام (۱۹۵۵ء۔۱۹۶۱ء) کے دوران دومرتبہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے مدرستہ الاصلاح میں تدریس کے لیے بلایا لیکن پہلی مرتبہ انکار کردیا دوسری مرتبہ دعوت پر وہاں چلے گئے۔ چھ سال یہاں آپ کا قیام رہا، ۱۹۶۱ء میں حج کے لئے روانہ ہوگئے اور حج سے واپسی پر کچھ عرصہ کے لئے جامعۃ الفلاح میں تدریس کا فریضہ انجام دیا اس کے بعد وعدہ کے مطابق آپ جامعۃ الرشاد چلے گئے اور یہاں دوسال تک قیام کیا۔ پھر ۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۴ء تک اپنی زندگی کا سنہرا وقت جامعۃ الفلاح کی تدریسی میدان میں گزارا۔ اس کے بعد ۲۰۰۴ء۔ ۲۰۱۵ء تک جیراج پور (بندول) کے ایک مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں اور اس طرح مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد ۶۵ سال تک درس وتدریس اور جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی میں اپنی زندگی صرف کردی۔(۸۰)

آپ کا تدریس کا طریقہ عام مدارس سے ہٹ کر یہاں بالکل نیا اسلوب تھا، نصاب تعلیم کے مطابق طلبہ کو ہوم ورک کی مشق سے گزارا جاتا ہے اور طلبہ کو اس بات کا پابند بنایا جاتا ہے کہ وہ خود سبق کو پڑھ کر آئیں، اس کے مندرجات کو حل کر کے اور سمجھ کر آئیں، اس کی خاطر الفاظ کے معانی نکال آئیں اور اس کی تحقیق کرنی پڑے تو ڈکشنری کی طرف رجوع کریں۔ اس کی مدد سے زیر مطالعہ سبق کے معانی ومطالب کو سمجھ کر اور حل کر کے آئیں۔ یہ طریقہ نہیں اپنایا جاتا کہ لیکچر دے دیا جائے۔ اس طریقہ کو مفید نہیں سمجھا گیا بلکہ طلبہ کے اندرونی صلاحیت کو فروغ کے لیے مطالعہ کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے اور اس کا پابند بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ بات ضروری ہے کی جہاں طلبہ اپنے اوقات کو منضبط کر کے ایسا ٹائم ٹیبل ترتیب دیں، دوسرے دن کے تمام اسباق تیار کر کے کلاسوں میں بیٹھیں تا کہ استاد درس شروع کر کے، طالب استاد کے ہر طرح کے سوالات کے جوابات دینے لیے تیار رہے۔ یہ ایک کامیاب تجربہ رہا ہے، جس کے ذریعہ طلبہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ طلبہ کا اپنے طور پر اسباق کے معانی کو سمجھنا اور اس کے مطابق مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہر وقت مفید رہا ہے، ہر چند اس طریقہ کو اختیار کرنے میں طلبہ پر بوجھ تو ضرور ہوتا ہے لیکن مستقبل میں ان کے مطالعہ کی صلاحیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اپنی عربی تعلیم کے بالکل ابتدائی مرحلہ میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب استاذ تھے جنھوں نے اس اسلوب کی مشق آغاز کیا، انھیں اپنے استاذ محترم مولانا اختر احسن صاحب سے بے پناہ لگاؤ اور عقیدت تھی

دوران درس ان کے طریقہ کار کا ذکر کرتے اور اسی اسلوب اور طریقہ کار کے مطابق پڑھاتے اور ہر طالب علم سے یہی امید رکھتے کی اسی طریقہ کو اپنائیں، ابتدا میں ہمیں یہ سکھا گیا کہ قرآن مجید کے معانی ڈکشنری سے نکالیں اور اس کے مطابق درس کا مطلب سمجھ کر آئیں کسی طالب کو کوئی تفسیر دیکھنے کی اجازت نہ تھی ازخود سبق کو حل کر کے آنا ہوتا تھا۔ عربی ادب اور قرآن مجید پڑھانے میں دونوں ہی میں یہی اسلوب ہوتا، اس طریقہ کار سے مطالعہ کی اہمیت اور درس کے معانی ومطلب کو سمجھنے میں بہت مفید ہوتا۔ مولاناؒ اس بات پر زور دیتے، خود سے سبق کے معنی ومطلب کو حل کرلیا جائے بہتر ہے ہمارے استاذ محترم کا یہی اسلوب اور طریقہ تھا، اس پر وہ بہت زور دیتے اور برابر تاکید کرتے، یہ بات دل ودماغ میں نقش کرگئی ورنہ ہماری صلاحیت نہ ابھر سکے گی۔ صلاحیت کو تقویت دینے کا یہی طریقہ ہے، یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا کہ اس طریقہ کار کو کیسے اپنایا جائے۔ ڈکشنری سے معنی نکالنا اور صحیح معنی کی تلاش بعض وقت آسان اور بعض وقت مشکل ہوتا ہے، ظاہر ذہن کی پختگی اتنی نہیں ہوتی کہ ہر طالب یکساں طور پر صلاحیت کا مظاہرہ کرے یہ ایک امتحان سے بڑھ کر ہوتا ہے لیکن اس وقت اعتماد اور ذہنی تربیت پر ایک اچھا نقش پڑتا ہے، جب طالب علم صحیح معنی تلاش کرلے اور استاذ کو خوش کردے، طالب علم کا اعتماد بڑھتا ہے مزید اس کے قدم جمنے شروع ہوجاتے ہیں، یہ سلسلہ جامعۃ الفلاح سے فراغت تک جاری رہا۔ ظاہر ہے ہر کتاب کو خاص طور سے قرآن وحدیث اور ادب کے اسباق کو مطالعہ کر کے معنی ومطلب کی تیاری کرنا وہ بھی روزانہ یہ کام اتنا ہی کھٹن اور مشکل ہوتا، اس لیے ساتھ ہی دوسرے ہوم ورک جو روزانہ کرنے ہوتے تھے۔

استاذ محترم جس فکر کے مطابق درس دیتے وہ تھا فکر فراہی۔ مولانا فراہیؒ ایک عظیم مفسر تھے، ہوا یہ کہ مولانا کی عظمت ہمارے دلوں میں بیٹھ گئی، ہر چیز بغیر پڑھے ہوئے قائل ہوگئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تدبر قرآن کی تکمیل ہونے سے پہلے امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعے جو اردو میں موجود تھے ہم لوگوں کے پاس نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے یہ بات بےچینی سے جاننے کی کوشش ہوتی کہ آخر مولانا فراہی نے اپنی تفسیر میں کیا کہا ہے؟ ان کا فلسفہ نظم درس قرآن کے دوران کچھ نہ کچھ ہوتی رہتی تھی لیکن مکمل قرآن کا نظم اس وقت تک دستیاب نہیں تھا یہ باتیں ۱۹۶۷ء تک کی ہیں۔

اس تعلیم میں یہ سقم ضرور تھا کہ عربی سوم سے نظم قرآن اور مولانا فراہی کا پڑھانے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہ تھی ان کے فلسفہ نظام کو سمجھانے کے لیے ایسی کتاب داخل نصاب ہو جو نظم کو سمجھانے میں مفید ثابت

ہو۔موجودہ صورتحال یہ ہے اس کمی کو پوری کر دیا گیا ہے،لیکن ابتدائی زمانہ میں شدت سے کمی محسوس کی گئی،علم فراہی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کا رواج زیادہ تھا۔ایک عرصہ کے بعد ایک Breakthroug ضرور ہوا اور اصحاب فکر اس بات کی طرف توجہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ فکر فراہی زیادہ سے زیادہ عام ہو۔استاذ محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب دوران درس کسی قسم کا نوٹ لینے کی ہمت افزائی نہ کرتے۔ان کا مشورہ ہوتا تھا کہ درس کے بعد اپنے کمروں میں اپنی یادداشت کے مطابق قلم بند کرنے کے لیے کہتے۔لیکن مولانا جلیل احسن ندوی کی رائے اس سے مختلف تھی اور وہ کہتے کہ انسانی حافظہ کمزور ہے تمام باتیں یاد رکھنا مشکل ہے،اس لیے دوران درس نوٹ کی ہمت افزائی کرتے،طلبہ دونوں رایوں کا احترام کرتے تھے۔

تربیت کا انداز اور خدمات

مولانا خارجی مطالعہ پر بہت زور دیتے،عربی کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ اردو میں دارالمصنفین کی کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دیتے، بلکہ بسا اوقات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی کتاب اسوہ صحابہ کے بعض حصے پڑھ کر سناتے جو انشا پردازی کے اعلیٰ نمونہ ہوتے۔ترجمہ کرنے اور لکھنے کی طرف بہت توجہ دیتے اور اکثر طلبہ کو اسکی طرف توجہ دیتے۔اپنے استاذ محترم مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کا خاص انداز میں ذکر کرتے،وہیں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اپنے خاص اساتذہ میں شمار کرتے اور اپنی تعلیم وتربیت کے باب میں ان بزرگوں کا نمایاں کردار اور حصہ بتلاتے اور کہتے کہ میں ان حضرات کی توجہ سے اس قابل ہوا۔ مولانا اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ میرے والد محترم مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کے حوالہ کر کے آ گئے تھے۔یہی وجہ ہے جب مولانا ابواللیث اصلاحیؒ اپنے دور امارت میں کبھی اپنے وطن چاند پٹی جاتے تو جامعہ تھوڑی دیر کے لیے رک جاتے اور ویسے بھی انہیں جامعہ سے بہت تعلق خاطر تھا کیونکہ تحریک کا نمائندہ جامعہ تھا۔

ایسے موقع پر مولانا اپنے استاد کی خدمت میں لگ جاتے اور یہی چیز مولانا صدرالدین اصلاحی کی آمد کے موقع پر دیکھنے کو ملا کہ وہ ان کی تکریم وتعظیم میں بچھ جاتے تھے۔ایسا نمونہ تھا جس سے ہم طلبہ بہت متاثر ہوتے۔

مولانا جہاں ایک کامیاب معلم ومربی تھے وہیں ایک اچھے منتظم بھی تھے۔اللہ تعالیٰ نے انھیں انتظامی صلاحیت سے مالا مال کیا تھا۔جس کام میں لگ جاتے اس کے وہ ہو کر رہ جاتے،جب تک وہ کام پورا نہ ہوتا دم نہ لیتے،ایک دھن سوار ہو جاتا سوتے جاگتے اس کے بارے میں سوچتے اور حلقہ احباب اور اپنے طلبہ سے اس کا ذکر کرتے کہ کیسے اس کام کو پائے تکمیل تک پہنچانا ہے۔جامعہ کی مسجد کی تعمیر ان کے حسن انتظام کا ایک

بہترین نمونہ ہے۔

جامعہ کا آغاز ہوا تو نہ تو لائبریری تھی نہ کتب خانہ نہ مطبخ نہ ڈائننگ ہال بس ایک پختہ عمارت تھی (جو اس وقت سید ابوالاعلیٰ کے نام سے موسوم ہے) جس میں طلبہ رہتے تھے اور کلاسیں ہوتی تھیں اور مسجد بھی، غرضیکہ یہ عمارت تمام تعلیم وتربیت کی آماجگاہ تھی۔ اور جامعہ کے پاس کتب خانہ اور نہ طلبہ کے لیے لائبریری تھی، جامعہ کا آغاز بے سروسامانی کے عالم میں ہوا، بس ایک جوش اور جذبہ تھا اور تحریکی لگاؤ اور نصب العین سے عشق ومحبت تھا اور اس عشق ومحبت کے ساتھ اساتذہ کی مخلص ٹیم تھی جس نے جامعہ کو بام عروج تک پہونچانے کا تہیہ کر رکھا تھا، اور حالات نے جامعہ کو اپنے دوش پر لے جانے کے لیے تیار ہوگیا، جیسے جیسے سال گزرتے گئے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور جامعہ کا شہرہ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلتا گیا اور جوق درجوق تعلیم کے لیے آنے لگے اور یہ صورتحال پیدا ہوگئی کہ جامعہ تنگ دامانی کا شکار ہونے لگا۔ ایسی صورتحال میں مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے باہر کا سفر کیا اور ان کے اس سفر سے مسجد کی تعمیر اور طلبہ کے لیے بورڈنگ کی تعمیر عمل میں آئی۔ ان کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ جامعہ کے روزمرہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی تکمیل بہ آسانی ہوسکی۔

قرآن اور ادب سے لگاؤ

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ قرآن مجید شعبہ اعلیٰ کے مختلف درجات میں اور اسی طرح عربی ادب بھی زندگی بھر پڑھاتے رہے ہیں۔ ان کا قرآن مجید سے لگاؤ(۱) اور عربی زبان میں مہارت (۲) اور ترجمہ و تالیف (۳) کی جو سرگرمیاں رہی ہیں یہ سب ان کی زندگی کا ایک اہم حصے ہیں اور ان میدانوں میں بھی بہت بڑی خدمات ہیں۔ میں نے ان سے ان کے ان تینوں میدانوں میں تربیت حاصل کرنے اور سیکھنے کا خوب خوب مواقع ملے۔

حواشی ومراجع

۱۔ تاریخ اسلام اول، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ

۲۔ تاریخ اسلام، اول، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ

۳۔ تاریخ اسلام، اول، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ

۴۔ تاریخ اسلام، اول، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ

۵۔ تاریخ اسلام، اول، ۱۸۷ مولانا شاہ معین الدین ندویؒ

۶۔ قرآن مجید کا تعارف۔ص ۶۸ مولانا صدرالدین اصلاحی

۷۔ اسوہ صحابہ دوم ۲۲۹، مولانا عبدالسلام ندویؒ

۸۔ عبدالوھاب القرش۔العلاقات الحضاریۃ ۲۰۹۔۲۱۱ ڈاکٹر راغب السرجانی کے مضمون 'الحضارۃ' سے۔

۹۔ سید محمود خاور، روزنامہ دنیا

۱۰۔ نظام الملک الطّوسی: ماذا تعرف عن الوزیر الذی احدث طفرۃ فی حضارۃ الاسلام، محمد شعبان ایوب، الجزیرۃ نیٹ۔

۱۱۔ ویکی پیڈیا، درس نظامی

۱۲۔ ماخوذ برصغیر کا نظام تعلیم وتربیت، محمد عارف، ڈاکٹر عبدالغفور اعوان

۱۳۔ آپ کے شرعی مسائل اوران کا حل، درس نظامی کا تاریخی پس منظر

۱۴۔ درس نظامی ماضی، حال اور مستقبل پروفیسر محمد اسحاق علوی

۱۵۔ درس نظامی کے نصاب اور اصول نصاب کا جائزہ، فکری موضوعات پر اردو بلاگ

۱۶۔ درس نظامی: مردہ علوم کی لاش تحریر: محمد اسحاق علوی

۱۷۔ علی گڑھ ایک مطالعہ

۱۸۔ ویکی پیڈیا، علی گڑھ

۱۹۔ ویکی ہیڈیا، سرسید احمد خان

۲۰۔ ویکی پیڈیا، علی گڑھ تحریک

۲۱۔ ویکی پیڈیا

۲۲۔ بصیرت آن لائن۔محمد شکیب قاسمی

۲۳/الف بصیرت آن لائن

۲۳ب ماخوذ: معارف سال ۱۹۶۵ء مولانا مجیب اللہ ندویؒ)

۲۳ج معارف جلد ۹۶ سال، ۱۹۶۵ء معارف، مولانا مجیب اللہ ندویؒ

۲۳د حیات شبلی، ص ۳۹۲

۲۳ھ حیات شبلی ص ۴۳۳

۲۴۔ مرشد کمال، جامعہ ملیہ اسلامیہ سیکولرازم، اور اسلامی تہذیب کا حسین امتزاج

۲۵۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ: برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کا استعارہ ڈاکٹر شاہد صدیقی

۲۶۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک: ایک تنقیدی جائزہ۔وقاص احمد

۲۷۔ آپ کے شرعی مسائل اوران کا حل، درس نظامی کا تاریخی پس منظر

۲۸۔ درس نظامی ماضی حال اور مستقبل، پروفیسر محمد اسحاق علوی

۲۹۔ الندوہ فروری ۱۹۰۹ء کے شمارے میں

نصاب تعلیم وتربیت کی تعمیر اور ترقی میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا حصہ

۳۰۔ پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۱۔ پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت ص ۲۳۸، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۲۔ ص ۲۴۶، پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۳۔ ص ۲۶۷، پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۴۔ ص ۲۴۷، پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۵۔ ص ۲۴۸، پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۶۔ ص ۲۵۲ پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۷۔ ص ۲۴۹ ، پاک وہند میں نظام تعلیم وتربیت اول، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۳۸۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندویؒ
۳۹۔ افادات جلیل احسن ندویؒ جون ۱۹۰۷ء، ظفر احمد اثری
۴۰۔ تاریخ جامعہ ص ۴۴، ترتیب وتدوین، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
۴۱۔ سرسید شناسی کی روایت۔ حالی تا حال، مجاہد حسین
۴۲۔ نفس المصدر
۴۳۔ تعلیمات، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۴۔ تعلیمات ص ۴۷ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۵۔ تعلیمات ص ۴۷۔۴۸ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۶۔ تعلیمات ص ۴۹، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۷۔ ص ۵۳، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۸۔ ص ۶۱، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۹۔ تعلیمات ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۰۔ تعلیمات، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۱۔ تعلیمات ص ۴۳ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۲۔ تعلیمات، ۹۴۔۹۵ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۵۳۔ جماعت اسلامی ہند کی تعلیمی خدمات (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۹ء) شعبۂ تنظیم مرکز جماعت اسلامی ہند
۵۴۔ ص ۹، نفس المصدر (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۹ء) شعبۂ تنظیم مرکز جماعت اسلامی ہند
۵۵۔ ص ۹، نفس المصدر (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۹ء) شعبۂ تنظیم مرکز جماعت اسلامی ہند
۵۶۔ ص ۱۱، نفس المصدر (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۹ء) شعبۂ تنظیم مرکز جماعت اسلامی ہند
۵۷۔ روداد جماعت اسلامی ہند ص ۲۰۱ شائع شدہ زندگی اپریل ۱۹۶۲ء

۵۸۔ تاریخ جامعہ:۶۶،ترتیب وتدوین،ڈاکٹر ضیاءالدین ملک فلاحی

۵۹۔ ہمارے اساتذہ نمبرص ۱۳۳،حیات نو اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء از مولانا نظام الدین اصلاحی، مدیر انیس احمد فلاحی

۶۰۔ ہمارے اساتذہ ۲۳۷ حیات نو اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء از محمد عمران احمد فلاحی، استاد جامعۃ الفلاح، مدیر انیس احمد فلاحی

۶۱۔ حیات نو اجلاس نمبر ۹۳ ترتیب وپیش وکش، مولانا نسیم احمد غازی فلاحی

۶۲۔ حکیم ایوب نمبر حیات نو ترتیب وپیش وکش، مولانا نسیم احمد غازی فلاحی

۶۳۔ حکیم ایوب نمبر۔ ترتیب وپیش وکش، مولانا نسیم احمد غازی فلاحی، انٹریو، ابوالاعلی

۶۴ الف۔ حکیم ایوب، ترتیب وپیش وکش، مولانا نسیم احمد غازی فلاحی [انٹرویو، ابوالاعلی سید سبحانی کا۔]

۶۴ ب۔ ''تعبیر کی غلطی'' مولانا وحیدالدین خان کی یہ کتاب دین کی تعبیر ایک نئے انداز اور نئے اسلوب سے کیا ہے اور اصل نکتہ اس بات پر ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جو دین کی تعبیر اور تشریح کی ہے وہ غلط ہے اور انھوں نے اپنے انداز سے دین کی نئی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلہ میں ان کی خط وکتابت مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی وندویؒ اور مولانا جلیل احسن ندویؒ سے ہوئی تھی۔ جن کی تفصیلات ''تعبیر کی غلطی'' میں ہیں۔ سب اہم بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ''پوسٹ مارٹم'' مولانا عامر عثمانیؒ مدیر تجلی نے اپنے پرچہ کا تنقید نمبر نکال کر کیا ہے جو فروری و مارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔ اور اسی نمبر میں مولانا صدالدین اصلاحیؒ نے مولانا عامر عثمانیؒ کی درخواست پر مولانا وحیدالدین خان کے اعتراضات کا بہت ہی مکمل کافی اور شافی جواب دیا۔ تجلی کا یہ نمبر 'پی ڈی ایف' کی شکل میں موجود ہے۔ ہم اس بات کے مشکور ہیں یہ معلومات قابل قدر اسکالر رضوان احمد فلاحی لندن نے فراہم کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت کی دولت سے نوازے آمین۔ ''تعبیر کی غلطی'' پر اصحاب فکر کے متعدد تبصرے اور مضامین اس دور میں چھپتے رہے ہیں۔ لیکن اس بحث کے اصل مخاطب مولانا مودودیؒ تھے اور انھوں اسکا کوئی بھی جواب نہیں دیا ظاہر جواب انکی تحریروں میں مدلل انداز میں موجود تھا اور مولاناؒ ایک اصولی عادت تھی ایسے مباحث جنکا انھوں کافی شافی جواب لکھ دیا ہے ایسے اعتراضات کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے بلکہ مولانا عامر عثمانیؒ نے اپنے نمبر ہی میں مولانا مودودیؒ کی تحریر سے ''کتاب وسنت اور اقامت دین'' (مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا ایک ٹکڑا'' جو تعبیر کی غلطی'' کے مرکزی خیال کا مکمل طور پر قاطع ہے) شامل کر دیا ہے۔ ایک اور اہم کتاب ایک اہلحدیث عالم دین کی بھی چھپی ہے جو ''پی ڈی ایف'' میں پڑھی جاسکتی ہے۔ ''مولانا وحیدالدین خان افکار ونظریات'' ڈاکٹر حافظ محمد زبیرؒ (ابوالحسن علوی) [۲۵ جون ۱۹۵۷ء۔ ۱۰ نومبر ۲۰۱۳ء]

۶۵۔ حکیم محمد ایوبؒ نمبر ص ۹۹، ترتیب وپیش کش مولانا نسیم احمد غازی فلاحی، از ظفر احمد اثری لندن

۶۶۔ حکیم محمد ایوبؒ نمبر ص ۹۹ ترتیب وپیش کش مولانا نسیما حمد غازی فلاحی، از ظفر احمد اثری لندن

۶۷۔ اجلاس نمبر ص ۹۲ حیات نو مارچ تا جون ۲۰۱۶ء، از مولانا محمد عمران فلاحی استاد جامعۃ الفلاح

۶۸۔ الف تاریخ جامعہ ص ۱۱۷ ترتیب وتدوین، ڈاکٹر ضیاءالدین ملک فلاحی

۶۸۔ ب ہمارے اساتذہ نمبر ص ۳۷، حیات نو اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء، مدیر انیس احمد فلاحی از ڈاکٹر مجاہدالاسلام بختاروی فلاحی

نصاب تعلیم وتربیت کی تعمیر اور ترقی میں مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا حصہ

۶۹۔ ہمارے اساتذہ نمبر ص ۷۸ حیات نو اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲، مدیر انیس احمد فلاحی از مولانا اقبال اصلاحی ندوی مدنی

۷۰۔ نقوش وتاثرات، ص ۴۹۔۵۰، مولانا جلیل احسن ندویؒ

۷۱۔ نقوش وتاثرات ص ۵۳ مولانا جلیل احسن ندویؒ

۷۲۔ ہمارے اساتذہ نمبر ص ۴۷، حیات نو اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء از حفیظ الرحمان فلاحی ریاض، مدیر انیس احمد فلاحی

۷۳۔ ذکر شہباز ص ۱۹۶ مرتب مولانا محمد اسماعیل فلاحی سابق استاد تفسیر جامعۃ الفلاح

۷۴۔ حیات نو اپریل تا جون ۲۰۱۴ء (ہمارے زمانہ کا جامعہ ص ۱۹) از ظفر احمد اثری لندن

(۷۵) حیات نو اجلاس نمبر ص ۹۲ مارچ تا جون ۲۰۱۶ء از مولانا محمد عمران خان استاد جامعۃ الفلاح

۷۶۔الف حیات نو اکتوبر ۲۰۱۶ء ص ۲۷، ماسٹر عبدالجلیل مرحوم

۷۶ب حیات نو اگست ستمبر ۲۰۱۹ء محمد افضل فلاحی

۷۶ج حیات نو اگست ستمبر ۲۰۱۹ء محمد افضل فلاحی

۷۷۔ تاریخ جامعہ، ترتیب وتدوین، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، ص ۱۱۵

۷۸۔ تاریخ جامعہ، ترتیب وتدوین، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، ص ۱۱۶

۷۹۔ تاریخ جامعہ، ترتیب وتدوین، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، ص ۱۲۴

۸۰۔ یہ معلومات عبدالعظیم قاسم فلاحی بن مولانا سلامت اللہ اصلاحی، دہلی نے فراہم کیں۔

اہلِ خاندان کے جذبات

ابّا کی یاد میں-چند باتیں

صفیہ عبدالحسیب فلاحی

الحمدللہ جب سے ہوش سنبھالا، ماں باپ دونوں کا سایہ سر پر رہا۔ ماشاءاللہ ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔اس کے علاوہ صرف پھوپھی زاد تین بہنیں اور دو بھائی، یہی تھا ہمارا مکمل خاندان۔لیکن ہم اتنے چھوٹے خاندان میں نہیں رہے۔ابّا کے چچا جن کا خاندان بیش تر افراد پر مشتمل تھا۔ماشاءاللہ ان کے چھ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی اور ان کی اولادیں۔دراصل یہی سب لوگ ہمارے سب کچھ تھے، دادا دادی، چچا چچی، پھوپھی اور بھائی بہنیں۔ہم اتنے سارے لوگ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ایک ہی ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔سب کچھ ایک تھا۔ ہماری والدہ محترمہ بھی قابل تعریف تھیں۔انہوں نے بہت اچھی تربیت دی۔ ہمیشہ انہوں نے یہی سکھایا کہ ہم سب ایک ہیں۔خود کا بھی ان کا یہی رویہ رہا سبھی کے ساتھ۔ہم سب بہنیں مل کر خوب مزے کرتے۔ بہت اچھا وقت گزرتا اور الحمدللہ آج بھی ہمارا وہی رشتہ باقی ہے۔

ابّا جان کی زندگی کچھ الگ سی تھی۔گھر کے کاموں سے بالکل دور، ساری توجہ اور ساری دلچسپی کا مرکز 'جامعۃ الفلاح' اور درس وتدریس۔بیش تر اوقات وہیں پر گزارتے۔جمعرات کی شام کو گھر آتے اور سنیچر کی صبح پھر چلے جاتے۔کافی عرصہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس کے بعد ان کے معمول میں تبدیلی آئی اور صبح شام آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

ابّا کو اپنی بیٹیوں سے بہت زیادہ پیار تھا۔اس چیز کو ہم لوگ اچھی طرح محسوس کرتے تھے، بلکہ ہماری جو دوسرے نمبر پر باجی (صدیقہ مرحومہ) تھیں وہ ابّا کو کچھ زیادہ ہی عزیز تھیں۔ جب اُن کا نام لیتے تھے تو اور شفقت ومحبت چھلکتی تھی اور ''وہ اِس کی اہل بھی تھیں''۔

ابّا ہمیشہ ہم لوگوں کو بیٹی ہی کہہ کر پکارتے تھے۔نام تو شاذ ونادر ہی لیتے تھے، لیکن افسوس کہ ہماری دو بہنیں بہت چھوٹی عمر میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن 'راحلہ مرحومہ' بہت ہی کم عمر میں

وفات پائی۔اُس کی وفات کی خبر سن کر مجھے سب سے زیادہ اِسی بات کا ڈر ہوا کہ اس غم کو میرے ابا کیسے برداشت کر پائیں گے جو کہ اپنی بیٹیوں کو سامنے سے ہٹنا گوارہ نہیں کرتے،لیکن میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔میں نے ان کی اصل شخصیت کو جانا نہیں۔جیسا انہوں نے صبر وضبط کا مظاہرہ کیا،اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

ابھی یہ زخم مندمل نہیں ہوا کہ نواسے کا غم،اور اِس غم سے باہر آتے کہ اپنی دوسری بیٹی جس کو زیادہ ہی پسند کرتے تھے ایسے موذی مرض میں مبتلا ہوئیں کہ رو بہ صحت نہ ہوسکیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں۔اتنے سارے غم مل کر ابّا کی صحت پر حاوی ہوگئے۔

والدہ ہماری نیک خاتون تھیں۔گھر کے اندر رہ کر ابّا کی خدمت اور بچوں کی تربیت،ان کی دیکھ ریکھ میں اپنی ساری زندگی گزار دی۔ان کی صحت پر بھی اتنے سارے غم نے بہت برا اثر ڈالا۔یکم اپریل ۲۰۱۳ء میں انہوں نے اس دار فانی کو الوداع کہہ دیا۔ہم لوگوں کے لیے یہ بڑا الم ناک سانحہ تھا،جو زندگی میں ایک خلا پیدا ہوا وہ آج تک نہ بھر پایا۔

والدہ کی وفات کے بعد ابّا تنہائی محسوس کرنے لگے۔لیکن الحمد للہ اہلِ خانہ ابا کی تنہائی کے لیے کافی مددگار ثابت ہوئے۔بھابھی نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ابّا بھی ان کو بہت مانتے تھے،ان کی بہت تعریفیں کرتے اور بچے تو ان کے لیے کھلونا ہوگئے اور بہت خدمت بھی کرتے۔

ہم لوگ دور دور اپنے اپنے گھروں میں ابا کے لیے پریشان رہتے اور ابا ہمیشہ اپنے مختصر سے فون کے ذریعے ہم لوگوں کی خیریت لیتے اور دیتے رہتے۔

ابّا ہمارے بہت اصول پسند آدمی،وقت کے بہت پابند،بہت ہی سادا زندگی گزارنے والے،سادہ سفید کپڑا،چند جوڑوں پر مطمئن اور قانع،سادہ کھانا،کھانے میں کبھی کوئی نقص نہیں نکالتے۔ہمیشہ کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتے۔

نماز کی خود بھی بہت پابندی کرتے اور بچوں کو بھی تاکید کرتے۔ہر دن کا اپنا پروگرام بناتے جو نماز کے اوقات پر منحصر ہوتا۔رشتوں کا بہت خیال رکھتے اور حسب طاقت نبھاتے رہتے۔بیماروں کی عیادت ضرور کرتے۔ایفائے عہد کی پابندی کرتے۔بچوں سے بہت پیار کرتے۔لین دین کا معاملہ بہت صاف رکھتے۔کئی بار جامعۃ الفلاح کے تعلق سے کویت کا سفر کیا۔واپسی میں جب ہم لوگ ابا کی ڈائری دیکھتے تو ایک ایک روپے کا حساب ذاتی خرچ کا الگ اور جامعہ کی رقم کا الگ لکھا ہوا ہوتا۔

خود اپنے گاؤں (علاؤالدین پٹی) کی مسجد اور گاؤں کے مدرسے کی رقم گاؤں کے لوگ ابا کے پاس جمع کرتے۔ اُس وقت نہ ابا کے پاس کوئی بیگ تھا اور نہ کوئی پرس، ایک سادہ سا کپڑے کا تھیلہ، جس کے اندر دو الگ الگ رجسٹر اور کپڑے کی سلی ہوئی دو تھیلیاں ہوتیں۔ اُن میں وہ رقم ابا رکھتے اور حساب لکھتے۔ کبھی اگر ہماری امی کہتیں کہ کچھ روپے اس میں سے چینج کر دیجیے ابا فوراً منع کر دیتے کہ نہیں، اُس تھیلے کو نہیں چھونا ہے وہ امانت ہے، بہت محتاط رہتے۔

قرآن سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ قرآن کو پڑھاتے اور سکھاتے ہی دنیا سے جائیں۔ جامعۃ الفلاح سے جب ان کی سبک دوشی ہوئی تو سب سے زیادہ غم اُن کو اِسی بات کا تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی حل نکال دیا، قریب ہی کے ایک گاؤں بندول میں بچیوں کے مدرسہ میں کچھ دنوں تک یہ خدمت انجام دی۔

خود اپنی گاؤں کی مسجد میں بھی خطبۂ جمعہ کے ساتھ ساتھ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن کا اہتمام کرتے تھے۔ گھر میں ہوں یا بیٹھک میں، سفر میں ہوں یا کہیں ٹھہرے ہوئے ہوں ہر جگہ اپنی مختصر وعظ ونصیحت سے قریب میں رہنے والوں کو فیض یاب کرتے رہتے۔

انہیں اپنے اساتذہ سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ بہت عزت سے اور رشک سے ان کو یاد کرتے۔ مدرسۃ الاصلاح سے دلی لگاؤ تھا۔ یہاں تک کہ زندگی کے آخری چند دنوں میں ہاسپٹل کے بیڈ پر کئی بار یہ پوچھا کہ میں کہاں ہوں؟ ''سرائے میر میں''؟ ''نہیں ابا! آپ اعظم گڑھ ہاسپٹل میں ہیں۔'' ''اچھا''۔

ابا اپنے شاگردوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ (ہاسپٹل میں انہیں بھی یاد کرتے رہتے) ان کو یاد کر کے بہت خوش ہوتے۔ جس وقت جامعۃ الفلاح میں اُن کا دور عروج پر تھا اکثر اپنے شاگردوں کو اپنے گھر پر مدعو کرتے اور اپنی پسندیدہ چیزوں سے ان کی ضیافت کر کے بہت خوشی محسوس کرتے۔ ان کے شاگرد بھی ان کی بہت عزت واحترام کرتے۔ بعض شاگردوں کے تعزیتی مضامین میں نے پڑھے، جس خلوص ومحبت کا انہوں نے اظہار کیا ہے۔ جزاکم اللہ خیراً کثیراً

موت تو برحق ہے۔ کل نفس ذائقة الموت، موت دھیرے دھیرے قریب آنے لگی اور ابّا کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اچانک ۱۸ر فروری ۲۰۲۰ء کی رات طبیعت کچھ زیادہ بگڑ گئی۔ بھائی بھابھی اور کچھ لوگ ابّا کو لے کر بلریا گنج 'الفلاح ہاسپٹل' پہنچے۔ وہاں پر ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں نمونیہ ہو گیا ہے۔ انہیں اعظم گڑھ اقصیٰ

ہاسپٹل لے جایئے۔ یہ لوگ ابا کو لے کر اعظم گڑھ ہاسپٹل پہنچے وہاں ڈاکٹر نے ابا کو ICU میں رکھا۔

بھائی نے ہم سب بہنوں کو رات ہی مطلع کر دیا۔ ابا کی بیماری کی خبر سن کر طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ یہاں پر میں اپنے شوہر کی بہت تعریف کروں گی کہ انہوں نے ہمیشہ مجھے میرے والدین کی خدمت کے لیے آگے بڑھایا۔ خود کسی مجبوری کی بنا پر نہیں جا سکتے تھے۔ میرے اپنے بھانجے قاسم کے ساتھ صبح سویرے مجھے اعظم گڑھ کے لیے روانہ کر دیا۔ قاسم میرا ہمیشہ ساتھ دیتا ہے۔ رات آٹھ بجے ہم دونوں اعظم گڑھ اسپتال پہنچے۔ بس میرے دل میں اسی بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں میں ابّا کی تکلیف دیکھ کر برداشت نہ کر پاؤں، لیکن خدا خدا کر کے ICU میں داخل ہوئی۔

ماشاءاللہ ابّا کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ ہوش وحواس بالکل درست۔ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ بھائی بھی وہیں پر موجود تھا، دونوں بہنیں بھی پہنچ گئیں۔ اس کے بعد سبھی لوگ پہنچ گئے۔ طبیعت بھی کچھ بنتی اور بگڑتی گئی۔ ابا گھر جانا چاہتے تھے اور یہ چاہ اور بڑھتی گئی۔ بس ایک ہی جملہ زبان پر ''گھر چلو''، البتہ قوت گویائی سلب ہوگئی تھی، بات سمجھنا بہت مشکل تھا۔ بہر حال بہلاتے اور تسلی دیتے پانچ دن ہاسپٹل میں بڑی مشکل سے گزرے۔ تین دن ICU اور دو دن ہاسپٹل کے پرائیویٹ کمرے میں۔

کلمہ، دعائیں اور اللہ کا شکر زبان پر جاری تھا۔ ۲۴ر فروری کو ڈاکٹر نے چھٹی کر دی اور ہم لوگ ابّا کو لے کر بذریعہ ایمبولینس گھر پہنچے۔ گھر پہنچ کر اطمینان کی سانس لی۔ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر سوئے، لیکن موت بالکل قریب آ لگی تھی۔ رات میں سو نہیں سکے۔ صبح سے اٹھ کر بھی کچھ زیادہ سکون نہ تھا۔ دوا، انجکشن، آکسیجن وغیرہ سب کچھ ساتھ تھا لیکن سب بے اثر۔ طبیعت میں بے چینی بڑھتی گئی۔ کبھی اگر ہم نے کسی ضرورت کے لیے بھی اٹھنا چاہا تو فوراً ہاتھ پکڑ لیا ''مجھ کو چھوڑ کر نہ جاؤ''۔ لیکن ابّا خود ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک ایسے سفر پر جس سے واپسی نہیں۔ اب تو بس ابّا کا کمرہ ہے، کتابیں ہیں اور ان کی یادیں ہیں، ابّا خود نہیں ہیں۔

سر سے ماں باپ دونوں کا سایہ اُٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، ہمیں صبر دے اور ان کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

عبدالحمید حاکم

علم وحلم، عزم وحزم، ذہانت وفراست، سنجیدگی ومتانت، تہذیب وشرافت، تواضع وانکسار اور تقوی و للّٰہیت کے اس پیکرِ جمیل نے ۲۵ رفروری ۲۰۲۰ء کو (جس وقت مالک ارض وسماں کی جانب سے بلاوا آیا کہ یا أیتھا النفس المطمئنة ارجعي الی ربک راضیة مرضیة ..... اپنی حیاتِ مستعار صاحب امانت کے حوالہ کردی، اور ہردم جواں، پیہم رواں کی مصداق اور جہد مسلسل سے عبارت زندگی یہ کہتے ہوئے تاقیامت خاموش ہوگئی کہ ؎

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

آپ نے جس گھر اور خاندان میں آنکھیں کھولیں وہ علم وفن کا گہوارہ تھا۔ والد محترم حاجی محمد عثمان ایک جید عالم باعمل اور گاؤں کی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے۔ ''اقبال کامل'' اور ''اسوۂ صحابہ'' جیسی شان دار تصانیف کے خالق، مشہور اور جید عالم دین مولانا عبدالسلام ندویؒ آپ کے چچا، اور مشہور ومعروف عالم دین مولانا حافظ اسلم جیراج پوری آپ کے ماموں ہوا کرتے تھے۔

آپ کے جد محترم ابوعیسیٰ نور محمد ترابی اپنے عہد کے نمایاں اور معتبر عالم دین تھے۔ مصادر شریعت اور متون کا خاصا ذخیرہ اپنی لائبریری میں اکٹھا کر رکھا تھا۔ اپنے علمی مقام ومنزلت اور علم دوستی کے باعث جس وقت علامہ شمس الحق عظیم آبادیؒ اپنی شاہکار تصنیف ''عون المعبود (شرح ابوداؤد)'' قلم بند کر رہے تھے آپ نے علامہ کی جائے قیام پر تقریباً چار سال کا عرصہ گزار کر اس مبارک علمی کام میں بھرپور معاونت کی۔

گویا اصحاب علم وفن کی کہکشاں کے درمیان آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی اور آگے چل کر آپ علم وعمل اور زہد وورع کی اسی خاندان کی میراث کے امین ہوئے۔

تعلیم کی ابجد گھر پر ہی والد محترم کے ذریعہ قائم کردہ مدرسہ میں ہوئی، بعد ازاں بلریا گنج کے مکتب اسلامیہ جس میں درجہ سوم تک تعلیم ہوا کرتی تھی، داخلہ لیا۔ اور یہی مکتب ترقی وعروج کی منزلیں طے کرتا ہوا ۱۹۶۴ء میں جامعۃ الفلاح کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا۔

بہر کیف، مکتب کی تعلیم سے فراغت کے بعد ''مدرسۃ الاصلاح'' کا رخ کیا جوان کی دیرینہ تمناؤں کا مرکز تھا، جہاں آ کر آپ کی اپنی گونا گوں صلاحیتوں کو نیا رنگ و روپ ملا اور یہی ''مرکز تمنا'' آپ کی خوب صورت شخصیت کی جولان گاہ بھی بنا۔ اس وقت وہاں اساطین علم وفن کی کہکشاں موجود تھیں۔ یوں یہ ذرۂ خاکی اس کہکشاں سے مستنیر ہوتا رہا اور بالآخر نیر تاباں ہو کر آسمان علم وادب پر نمودار ہوا۔

دوران طالب علمی اپنی سنجیدگی ومتانت اور ذہانت وفطانت کے سبب بہت ہی نمایاں اور ممتاز طلبہ میں آپ کا شمار تھا۔ عربی زبان وادب سے حد درجہ لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ لہٰذا اپنی ذاتی محنت وکاوش اور اساتذہ کرام خصوصاً مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا جلیل احسن ندویؒ کی (جو اس وقت مدرسہ پر قرآن اور ادب وانشا کے لائق وفائق اساتذہ تھے) خصوصی معاونت اور رہ نمائی سے عربی زبان اور ادب وانشا پردازی میں یک گونہ کمال حاصل کر لیا۔

مادر علمی میں رہتے ہوئے آپ کی شدید خواہش تھی کہ طلبہ کے اندر ادب وانشا کا عمدہ ذوق اور صلاحیت پروان چڑھتی رہے۔ لہٰذا آپ نے ''معتمد دار المعلومات'' کی حیثیت سے اس وقت کے شیخ الازہر شیخ محمود شلتوت کی خدمت میں نہایت عمدہ اسلوب وبیان اور فصیح لب ولہجہ میں ایک شان دار خط لکھا۔ خط کیا تھا بلکہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا مختصر اور جامع تعارف، مدرسۃ الاصلاح کا وجہ امتیاز وغیرہ کا خوب صورت بیانیہ جس میں شیخ الازھر سے یہ خصوصی درخواست کی گئی تھی کہ طلبۂ مدارس کی علمی تشنگی دور کرنے اور عالم عربی سے کما حقہ واقفیت کے لیے 'مجلة الأزهر'' کا دار المعلومات کے نام اجراء فرمادیں۔ ۱۹۴۹ء میں لکھا گیا یہ خط شاید مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ میں پہلا خط تھا جو مدرسہ اور طلبہ کے مفاد کے پیش نظر ایک طالب علم کی جانب سے کسی عالمی سطح کے رسالہ کے اجرا کے لیے لکھا گیا ہو۔

علامہ فراہیؒ کے تلمیذ رشید، ماہر قرآنیات مولانا اختر احسن اصلاحیؒ آپ کے خصوصی مربی اور محسن علمی وفکری تھے۔ ان سے خصوصی اکتساب فیض کو تا حیات باعث قدر ومنزلت اور متاع عزیز بنائے رکھا۔ عنفوان شباب کے زریں ماہ وسال مادر علمی کی آغوش میں گزار کر فراغت کے بعد اساتذہ کرام اور احباب ومتعلقین سے

ملاقات کے لیے مادرعلمی پہنچے تو چونکہ مردم شناس 'جوہری' (مولانا اختر احسن اصلاحیؒ) کو اس گوہر کمیاب کی صالحیت وصلاحیت کا اندازہ ہو چلا تھا لہٰذا اُن کی نیکی وپرہیزگاری اور ذہانت وفطانت سے متأثر استاد نے ان سے مادرعلمی کی خدمت اور ترقی کے لیے اپنی تدریسی خدمات پیش کرنے کی طلب ظاہر کی۔

گوکہ یہ تدریس جز وقتی اور نصف معاوضہ کے ساتھ تھی تاہم استاد کی تکمیل خواہش اور مادرعلمی کی ضرورت کے پیش نظر میدان تدریس میں قدم رکھ دیا، چند ماہ کی تدریس کے بعد عیدالاضحیٰ کے موقع پر گھر آمد ہوئی تو والدہ محترمہ کو بوجوہ یہ جز وقتی مدرس ہونا پسند نہ آیا۔ یوں سلسلۂ تدریس منقطع ہوگیا۔ اسی اثنا میں حسنین سید صاحب (قیم حلقہ بہار) نے دربھنگہ بلا لیا، جہاں ابھی درس گاہ اسلامی کا قیام تو ہوا تھا افتتاح باقی تھا۔ تاہم آب وہوا راس نہ آئی اور چند ہفتوں بعد واپس آگئے۔

بعدازاں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کی دعوت پر مرکز رامپور، پھر آپ ہی کے حکم سے دعوتی وتحریکی سرگرمیوں کی انجام دہی کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے اور تقریباً تین سال وہاں رہ کر دعوتی وتحریکی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر استاد محترم مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی جانب سے بلاوا آیا، بوجوہ معذرت کر دی لیکن ایک مختصر عرصہ کے دوران جب پھر طلبی ہوئی تو اب کے انکار نہ کرتے بنا اور مادرعلمی کی خدمت کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

وہاں پہنچ کر آپ نے عربی کے ابتدائی درجات میں 'مبادی القراءۃ الرشیدۃ'، 'کلیۃ ودمنۃ'، اور قرآن کریم پڑھانا شروع کر دیا اور چند سالوں کے بعد 'دول العرب والاسلام' 'دیوان الحماسۃ' اور 'جمہرۃ خطب العرب' نیز مقدمہ ابن خلدون بھی زیر درس آگئیں۔ تقریباً نصف دہائی کامل یکسوئی اور جہد مسلسل کے ساتھ تدریس کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے حتی کہ وہ ساعت غیر میمون بھی آئی جب آپ کو بشمول بعض دیگر اساتذہ کے 'جماعت اسلامی' سے فکری وعملی وابستگی کے جرم کی پاداش میں مدرسہ سے ہمیشہ کے لیے فارغ کر دیا گیا۔

مادرعلمی سے فارغ کیے جانے کے بعد مولانا مجیب اللہ ندویؒ (جو اس وقت جماعت اسلامی کے رکن تھے) کے ازحد اصرار پر ان کے قائم کردہ مدرسہ 'جامعۃ الرشاد' (جو اُن دنوں اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا) میں اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔ اسی دوران ''مکتب اسلامیہ'' بلریا گنج کے چند ذمہ داران جناب حکیم محمد ایوب صاحب (جو آپ کے نہایت مخلص اور دیرینہ رفیق وہمدم تھے) کی سربراہی میں آپ سے ملاقات کے

لیے علاؤالدین پٹی تشریف لائے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ’’مکتب اسلامیہ‘ کو ایک بڑا مدرسہ بنانے کا خاکہ زیرغور ہے، جس میں رنگ بھرنے کے لیے آپ جیسے باصلاحیت اور جواں عزم استاذ ومربی کی اشد ضرورت ہے۔

آپ جامعۃ الرشاد میں تدریس کو ترک کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے شدید اصرار پر وہاں آئے تھے اور مستقل طور پر رہنے کی گویا آمادگی ظاہر کرچکے تھے۔ تاہم جب مخلصین بلریاگنج کا اصرار بڑھتا گیا تو جامعۃ الرشاد سے استعفا دے کر جنوری ۱۹۶۴ء میں بلریاگنج تشریف لے آئے اور یہاں آکر اس ’وادی غیر ذی زرع‘ کو اپنی محنت وجانفشانی اور اخلاص وللّٰہیت کی برکتوں سے مرغ زار بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ اور جس وقت ’’جامعۃ الفلاح‘‘ کی تاسیس کا مبارک عمل انجام پارہا تھا آپ نے بشمول دیگر مؤسسین جامعہ کے اس کی بنیادوں میں اخلاص وللّٰہیت کے وہ جام انڈیلے کہ جن کی برکتوں سے وہ ننھا پودا آج ’شجرة طيبة أصلها ثابت وفرعها في السماء‘ کی مانند بلاتفریق مسلک ومشرب اور بلاامتیاز رنگ ونسل طالبان علم کی تشنگی دور کررہا ہے اور تقریباً زائد از نصف صدی توتی أكلها كل حين باذن ربها کی عملی تصویر بنا ہوا ہے۔

آپ کے جامعۃ الفلاح آنے کے بعد مولانا جلیل احسن ندویؒ کی بھی تشریف آوری ہوئی۔ باقاعدہ نصاب تعلیم بنا، درجہ بندی ہوئی اور پھر ایک منظّم اور باقاعدہ نظام تعلیم وتربیت کے تحت نئے عزم وحوصلہ اور جذبہ وامنگ کے ساتھ جامعہ کا تعلیمی سفر جاری ہوا جو الحمدللہ ہنوز جاری ہے۔ اس وقت ہر ایک کی زبان پر ’’آپ مدرسہ کے اور مدرسہ آپ کا‘‘ کے خوب صورت اور پرخلوص الفاظ تھے۔ یوں اس منبع علم کا فیض عام ہونے لگا اور علم کے پروانے دور دراز علاقوں سے جوق در جوق آنے لگے۔ آپ کی بے لوث اور پرخلوص کاوشوں کے سبب جامعہ میں لائق وفائق اساتذہ کی ایک کہکشاں وجود میں آ گئی۔

آپ کا طریقۂ تدریس بہت موثر تھا، آپ اپنے طلبہ کو گفتار سے بڑھ کر کردار کے غازی بننے پر بہت زور دیتے۔ طلبہ کی تربیت وتزکیہ کے لیے گاہے بگاہے ’اسوۂ صحابہؓ (از عبدالسلام ندویؒ) جیسی کتب سے چنندہ اقتباسات پڑھ کر سناتے۔

قرآن کریم کی تدریس کے وقت طلبہ سے مطالعہ کرکے آنے کی سخت تاکید کرتے۔ لغت بینی پر ابھارتے، نیز براہ راست قرآن پر غور وفکر کی تشجیع کرتے گویا رواج عام سے ہٹ کر تفاسیر کے بجائے راست

قرآن فہمی کا مذاق سلیم پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ بوقت ضرورت خود بھی اور طلبہ کو بھی 'تدبر قرآن' یا 'کشاف' وغیرہ سے رجوع اور استفادہ کا مشورہ بھی دیتے۔

تدریس قرآن کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ طلبہ کو بصدق دل یہ نصیحت کیا کرتے کہ وہ قرآن کریم کو حرز جاں بنائیں اور قرآن کریم کو اپنی عملی زندگیوں میں نافذ اور اس کی تعلیمات پر سنجیدگی اور خلوص نیت کے ساتھ عمل کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقی استاد اور مربی وہ ہوا کرتا ہے جو اپنے قول سے زیادہ عمل سے تربیت کا مشن انجام دیتا ہے۔ لہٰذا آپ کی شخصیت سے بھی قرآنی تعلیمات کا پرتو صاف نظر آتا تھا اور اس طور پر آپ ایک کامیاب استاد و مربی تھے۔

اقامتِ صلوۃ کے حد درجہ پابند، غیبت اور حسد سے کوسوں دور، تقویٰ وللّٰہیت کا حسین پیکر، حقوق العباد کے سلسلے میں بے انتہا محتاط اور فکرمند، اوقات کی غایت درجہ پابندی۔ احباب و متعلقین سے گفتگو کے وقت ریشم کی طرح نرم لیکن اصول وضوابط اور معمولات کی پاس داری میں فولاد کی طرح سخت۔ اپنے ان اوصاف حمیدہ کے سبب آپ بجا طور پر قرآن کریم کے استاد کہے جا سکتے تھے۔ قرآن کریم کی گویا چلتی پھرتی تصویر، اور اس شعر کے مصداق کہ ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

عربی زبان وادب کی تدریس کا انداز بھی کچھ یوں تھا کہ کلام عرب میں وارد الفاظ وتعبیرات کا بوقت ضرورت قرآن کریم سے استشہاد بھی کرتے، اچھے جملے اور عمدہ تعبیرات کو حفظ کر لینے کی تاکید کرتے۔ ادب وانشا پڑھاتے وقت جملوں کو کم از کم چار پانچ طریقوں اور اسالیب بیان میں بتاتے۔ چونکہ آپ اردو اور عربی دونوں زبانوں کا بہت ہی اعلیٰ اور نفیس ذوق رکھتے تھے، بولتے تو موتی رولتے، جچے تلے اور فصیح جملے بولتے۔ لہٰذا اپنی اس خوب صورت میراث کو طلبۂ عزیز کو بھی بحسن وخوبی منتقل کرنے کی کوشش کرتے اور عربی زبان وادب سے محبت وعقیدت اور اس میں مشق وممارست کی طلبہ کو تلقین کیا کرتے۔ زبان کو ہمیشہ اہل زبان سے سیکھنے کی تاکید کرتے لہذا آپ کا اس بات پر بجا طور پر شدید اصرار ہوتا کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے عرب ادبا کی کاوشوں سے استفادہ کیا جانا چاہیے کہ غیر عرب ادبا کی کاوشوں سے استفادہ، ذوق سلیم کے لیے سم قاتل ہے۔

عربی زبان وادب سے شدت اعتنا کے دیگر اسباب کے ساتھ اہم ترین سبب یہ بھی تھا کہ آپ کی دیرینہ

تمنا تھی کہ عربی زبان وادب میں مطلوبہ استعداد پیدا کرکے عالم عرب میں ''فکر فراہیؒ'' کی مناسب اور بہتر نمائندگی اور تشہیر وتفہیم کی جاسکے۔ آپ کی یہ دیرینہ تمنا برآئی کہ آپ بجا طور پر فکر فراہیؒ سے عالم عرب کو متعارف کرانے کی اولین کاوشوں کا مؤسس قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہذا ۱۹۶۱ء میں جس وقت آپ کو سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی آپ نے علامہ فراہیؒ کی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مضمون ''حکمۃ السعی والرمی فی الحج'' کے عنوان سے تحریر کیا اور اسے لے کر 'صحیفۃ قریش' (مکہ مکرمہ) کے رئیس التحریر کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے مضمون کو بہت پسند کیا اور اسے حج کی مناسبت سے نکلنے والے خصوصی شمارہ میں شائع کیا اور اس خصوصی شمارہ سے پیشتر شمارہ کے سرورق پر یہ خبر بھی شائع کردی کہ حج کے خصوصی شمارہ میں ایک ہندوستانی عالم دین کا '**حکمة السعی والرمی فی الحج**' کے عنوان سے ایک عمدہ مضمون شائع ہونے جارہا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اسی پر ایک صاحب قلم نے تنقید کا نشتر بھی چلایا جو '**تعقیب علی مقال عبدالحسیب، هذا خلاف العقل والمنقول**' کے عنوان سے شائع ہوا۔

رئیس التحریر الاستاذ احمد سباعی نے آپ سے دریافت کیا کہ آیا وہ تنقید کا جواب دینا چاہتے یا نہیں۔ آپ نے کہا: ذرا توقف کرلیں، مزید تنقیدیں آجانے دیں، پھر ان سب کو پیش نظر رکھ کر ایک جوابی مضمون لکھ دیا جائے گا البتہ آپ (رئیس التحریر) وہ تمام شمارے جن میں آئندہ تنقیدیں آئیں مجھے بھیج دیں۔ لیکن تکمیل حج کے بعد وطن واپسی پر وہ تمام مطلوبہ شمارے آپ کو نہ مل سکے، جنہیں پیش نظر رکھ کر جواب دینا تھا۔ یوں یہ اہم سلسلہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں ہی تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

انہی دنوں جدہ ریڈیو سے وابستہ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ سے مکہ میں ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے مضمون کی پذیرائی کی اور اس کی اشاعت پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ آپ نے بہت عمدہ کام کیا کیوں کہ لوگ یہاں اس تحقیق سے واقف نہیں تھے۔

اسی طرح اردو سے عربی میں مترجم مضامین 'الدعوۃ' دہلی، 'المجتمع' کویت اور 'صحیفۃ قریش' مکہ مکرمہ میں شائع ہوئے۔ خصوصاً المجتمع میں مولانا امین اصلاحیؒ کا رسالہ 'پردہ اور قرآن مجید' احکام الحجاب فی القرآن کے عنوان سے شائع ہوا اور یاران نکتہ داں سے داد تحسین حاصل کی۔

بشمول ان کے بعض اردو اور بعض عربی سے اردو مضامین 'سہ روزہ دعوت'، دہلی 'الانصاف' الہ آباد، 'حیات نو' حیدرآباد اور 'ایشیا' لاہور کے صفحات کی زینت بنے۔

قلم وقرطاس سے اس اٹوٹ وابستگی اور عربی زبان وادب سے حددرجہ شیفتگی نے آپ کو اس مقام ومنزل پر پہنچادیا کہ جہاں پہنچ کر بالغ نظر مفسر قرآن اور جید عالم دین مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنے مخصوص مذاق ومزاج کے علی الرغم آپ کو اپنی تمام تصنیفات کو عربی قالب عطا کرنے کی تحریری طور پر خصوصی اجازت مرحمت فرمائی۔ ڈاکٹر عبداللطیف خاں صاحب کے نام خط میں آپ کو ترجمہ کی اجازت عام کچھ ان الفاظ میں دیتے ہیں: ''مولوی عبدالحسیب صاحب کو میرا بہت بہت سلام لکھ دیجیے۔ وہ میری کتابوں میں سے جس کتاب کو بھی ترجمہ کے لائق خیال کریں شوق سے اس کا ترجمہ کریں۔ میں ان کی اس عزت افزائی کا شکر گزار رہوں''۔

المجتمع کویت میں **احکام الحجاب فی القرآن** کی اشاعت پر اپنے دلی احساسات کچھ یوں بیان کرتے ہیں: '' **المجتمع** میں مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی، پرچہ معیاری اور اسلامی ہے۔ مولانا عبدالحسیب صاحب ماشاءاللہ اچھی عربی لکھ لیتے ہیں، مجھے اب عربی بولنے لکھنے میں ذرا تکلف محسوس ہوتا ہے۔ ان کو میری طرف سے سلام اور شکریہ لکھ دیجیے اور اطمینان دلایئے کہ وہ اس خدمت کو جاری رکھیں''۔ (تدبرٗ لاہور مکاتیب اصلاحی نمبر۔ رحمان آباد: ۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء)

بہرکیف آپ کے قلم سے مولانا کی تین کتابیں ترجمہ واشاعت کے مرحلہ سے گزر کر افادۂ عام کے لیے منصۂ شہود پر آچکی ہیں: '**احکام الحجاب فی القرآن**' اور '**الدعوۃ الاسلامیۃ ومنهاجها**' یہ دونوں کتابیں عرصہ قبل ملک وبیرون ملک سے شائع ہوچکی تھیں تاہم اب نظر ثانی اور تصحیح اغلاط کے بعد ہدایت پبلشرز دہلی سے کتابت وطباعت کے عمدہ معیار کے ساتھ شائع ہوچکی ہیں۔

اسی طرح 'حقیقت شرک' جو ایک عربی مجلّہ میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے اب باراول کتابی شکل میں طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے اور ان شاءاللہ بہت جلد زیور طبع سے آراستہ ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب (**التفسیر السیاسی للاسلام**) کا تردیدی جواب بزبان اردو مولانا سید احمد عروج قادریؒ نے لکھا جسے آپ نے '**التفسیر الحقیقی للاسلام فی الرد علی کتاب التفسیر السیاسی للاسلام للشیخ ابی الحسن علی الندوی**' کا عربی قالب عطا کیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں سعودی عرب سے کتابی شکل میں شائع ہوئی اور قبول حسن حاصل کیا۔ پھر ۲۰۱۱ء میں جامعہ اسلامیہ شانتاپورم (کیرلا) سے یہی کتاب عنوان کی تبدیلی کے ساتھ '**التفسیر الحقیقی للاسلام مقارنة بین آراء**

المودودی و الندوی' کے نام سے منظر عام پر آئی۔

ان کے علاوہ آپ 'حقیقت توحید' اور 'تزکیۂ نفس' کو بھی عربی پیراہن عطا کرنا چاہتے تھے اور 'حقیقت توحید' کی تعریب کا کام شروع بھی کر چکے تھے لیکن پھر زندگی نے وفا نہ کی اور یوں یہ سلسلۂ کارِ عظیم مرحلۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

بہر کیف جامعۃ الفلاح سے آپ کو بے پناہ عقیدت تھی، جس کی گواہی جامعہ کے در و دیوار پر نقش ہے۔ لہٰذا اس کی علمی، فکری، مادی اور تعمیراتی ترقی کے لیے شب و روز کے فرق کو بھلا کر جس جانفشانی اور جہادِ مسلسل کی روشن تاریخ رقم کی ہے اس کی مثال جامعہ کی تاریخ میں ملنا قطعاً محال ہے۔ آپ بلاشبہ ان نیک طینت رجال میں سے تھے جنہوں نے اپنی اپنی کشتیاں جلا کر اس دشت میں قدم رکھا تھا۔

اپنی پیہم رواں، ہر دم جواں خوب صورت زندگی کی چالیس بہاریں قرآن کریم اور عربی زبان و ادب کی تدریس کی نذر کر دینے کے بعد بھی یہ احساس رہتا کہ 'حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'۔ لہٰذا آپ کی شدید خواہش اور تمنا تھی کہ تا دم آخریں تدریس قرآن سے وابستہ رہیں کہ یہی ان کی مغفرت اور رفع درجات کا ذریعہ بھی ہے۔

لیکن جامعۃ الفلاح کے ضابطۂ ریٹائرمنٹ کی وجہ سے مولانا کی یہ دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی اور پچھتر (۷۵) سال کی عمر مکمل ہونے کے بعد جامعہ سے آپ کا رشتۂ تدریس منقطع ہو گیا۔

جامعہ سے فراغت کے بعد اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر اور تکمیل کے لیے اپنے گھر سے قریب گاؤں بندول کے ایک مدرسہ میں تدریس قرآن سے وابستگی اختیار کر لی اور تقریباً زائد از ایک دہائی مکمل محنت و لگن اور جانفشانی سے تدریس قرآن کے اپنے اس دیرینہ مشن میں قلب و جان سے لگ گئے۔ جب بوجوہ مدرسہ بند ہو گیا تو آپ نے گھر کی راہ لی اور خاموشی سے اپنے بعض گھریلو اعذار کے باوجود مطالعہ و تحقیق میں مصروف ہو کر اپنے استاد گرامی (مولانا امین احسن اصلاحیؒ) کی کتابوں کی تعریب کو اپنی زندگی کے آخری ایام کا وظیفہ بنا لیا۔

زندگی کے اس آخری پڑاؤ پر بھی جب کہ طوالت عمری کے سبب نقاہت و کمزوری شدید غالب رہا کرتی تھی، مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لیے مثل ماہی بے آب کے تڑپتے رہتے۔ گاؤں والے بھی چونکہ آپ کے بے حد قدرداں تھے، لہٰذا اُن کی مدد سے آپ مسجد جایا کرتے۔ اس مسجد میں آپ نے تاحیات (جب تک صحت نے رفاقت کی) خطبۂ جمعہ اور دروس قرآن کے ذریعہ عوام و خواص کی علمی و فکری تربیت و رہ نمائی کا مبارک فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ چونکہ بہت ہی اختصار پسند تھے لہٰذا آپ کے خطبات جمعہ، دروس قرآنی اور

تذکیر وغیرہ ماقلّ ودلّ اور اختصار وجامعیت کا نمونہ ہوا کرتی تھیں۔فرض نمازیں بھی مصلین کی رعایت کرتے ہوئے بہت ہلکی پڑھایا کرتے۔

آپ جب کبھی بیمار پڑتے اور مسجد میں حاضری سے معذور ہوتے تو مصلین بالخصوص اور اہل محلّہ بالعموم آپ کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہوتے، آپ کی عیادت کے لیے آتے اور آپ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار بھی کرتے۔نمازوں سے آپ کی عقیدت اور مسجد سے تعلق خاطر کے سبب آپ کے حقیقی مومن ہونے کی گواہی بھی دیتے۔وفات سے چند روز قبل ہاسپٹل میں بستر علالت پر دراز بار بار ہاتھ اوپر اٹھاتے اور جملہ متعلقین کو نماز کی شدت سے پابندی کی تاکید اور وصیت کرتے۔

بہرکیف، تقریباً زائد از نو دہائیوں پر محیط یہ سدا بہار زندگی بے شمار شاگردوں اور احباب و متعلقین کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو منور کرے، آپ کی لغزشوں سے صرف نظر کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین یارب العالمین

الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنّٰهُمْ فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ

(الحج:۴۱)

''اگر اہل ایمان کو ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، شریعت کی معروفات کا حکم دیں گے اور منہیات اور منکرات کا سدِّ باب کریں گے''۔

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

صفی الرحمٰن نبیل

آپ کی پیدائش اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاؤالدین پٹی میں ہوئی۔ دوشنبہ کا دن تھا۔ سال ۱۹۲۸ء۔ آپ کے دادا ابوعیسیٰ نور محمد ترابیؒ کے بارے میں ہم نے بذات خود ان سے سنا ہے، آپ ایک اہل حدیث عالم تھے۔ گھر پر بالا خانہ میں تشریف رکھتے اور سارا وقت پڑھنے اور لکھنے میں گزار دیتے۔ مولانا نے دادا جان کو تو نہیں دیکھا لیکن ان کی کتابوں سے استفادہ ضرور کیا۔ اس زمانے میں جب کتابیں نایاب ہوا کرتی تھیں ان کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا، جس میں بخاری کا ایک انتہائی قدیم نسخہ بھی شامل تھا۔ مولانا نے کبھی وعدہ کیا ہوگا اس کو جامعۃ الفلاح کی لائبریری کو دینے کے لیے، لہٰذا پچھلے سال کی بات ہے وہ نسخہ انھوں نے مجھے دیتے وقت یہ کہا کہ یہ اتنا قدیم ہے کہ مولانا اجمل اصلاحی صاحب دیکھ کر کہنے لگے کہ مولانا یہ امام فراہیؒ کی پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ اس نسخہ کو فلاح کی لائبریری میں دینے کے لیے میرے حوالے کر دیا اور وہ نسخہ اب جامعہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

آپ کے دادا حدیث کے ایک بڑے عالم تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب علامہ شمس الحق عظیم آبادی (پٹنہ) جن دنوں ابوداؤد کی شرح (عون المعبود) لکھ رہے تھے، ابوعیسیٰ نور محمد ترابیؒ وہاں موجود تھے اور آپ علامہ کی معاونت کرتے رہے اور تین چار سال تک وہیں مقیم رہے۔ مولانا کو دادا کی کتابوں میں متعدد مسودات اور مطبوعہ رسالے ملے۔ ایک تحفۃ الولدان، دوسرا تحفۃ الخلیل۔ اول الذکر بچوں کے لیے اور ثانی الذکر بڑوں کے لیے ایک تربیتی رسالہ ہے۔

آپ کے والد محترم حاجی محمد عثمان صاحب اہل حدیث عالم تھے۔ حنبلی مسلک پر عمل کرتے تھے۔ گاؤں کی جامع مسجد میں امام وخطیب تھے۔ گھر، خاندان اور گاؤں کے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے ہر وقت فکرمند رہتے تھے۔ اپنے دروازے پر ہی ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا جس میں خود پڑھایا کرتے تھے۔ بعد نماز عشاء گاؤں کی مسجد میں ہی درس کا اہتمام کرتے اور بڑے بوڑھوں کو قرآن ناظرہ پڑھاتے اور نماز کا طریقہ بھی سکھاتے۔

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

آپ کے والد محترم شاید پہلے وہ شخص تھے جنھوں نے ۱۹۳۷ء میں بلریا گنج کے مکتبہ اسلامیہ کو عربی مدرسہ بنانے کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اس جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اجتماعات بھی منعقد کیے۔ایک جلسۂ عام میں تقسیم ہونے والا ہینڈ بل مولانا کو بعد میں ملا، جس میں صاف لفظوں میں یہ لکھا تھا کہ ''بلریا گنج کے مکتب کو ایک عربی مدرسہ بنایا جائے''۔اس عظیم الشان جلسہ عام کے تعلق سے آپ نے بتایا تھا کہ اس جلسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالسلام ندوی بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ جلسہ اتنا بڑا تھا کہ شرکاء کے پانی کے لیے ایک کنواں بھی کھدوایا تھا جس پر ایک شکر کی بوری اور پانی نکالنے والا ڈول رکھا رہتا۔ لیکن ان کا یہ خواب ان کی زندگی میں تو پورا نہ ہوسکا، البتہ ان کے بیٹے یعنی مولانا عبدالحسیب کی قسمت میں آیا۔

بالآخر وہ دن آیا کہ آپ کے صاحب زادے اور دیگر لوگوں کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ مدرسہ آج ملک وملت کے دیگر اداروں کے مقابلے میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے بھی بلریا گنج کے اس مکتب میں چند سال تعلیم حاصل کی ۔آپ کے والد اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت فکر مند تھے اور اس فکر مندی نے انہیں مدرسۃ الاصلاح تک پہنچایا اور وہیں پھر آپ کا داخلہ ہوا۔

مولانا لکھتے ہیں: ''جب شوال آیا تو والد صاحب مجھے اور بڑے بھائی عبدالفتاح کو لے کر ۱۸/نومبر ۱۹۳۶ دوشنبہ کے دن مدرسۃ الاصلاح پہنچے۔ بڑے بھائی کو درجہ چہارم میں اور مجھے درجہ سوم میں داخل کیا''۔

مولانا نے مدرسۃ الاصلاح سے ۱۹۵۰ء میں فراغت کے بعد چند مہینوں وہاں پے درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر وہاں سے رامپور کا رخ کیا۔ وہاں مولانا ابواللیث اصلاحیؒ نے آپ کو بلایا تھا کچھ دنوں وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران علی گڑھ سے ایک خط مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کے پاس آیا، جس میں ایک ایسے عالم دین کی خواہش کی گئی تھی جو خطبہ دے سکے اور بچوں کو دینی تعلیم بھی دے سکے۔مولانا نے جانے کی رضامندی ظاہر کردی اور پھر تین سال تک علی گڑھ میں ہی مقیم رہے۔مولانا کو چائے بہت پسند تھی، ایسا لگتا ہے کہ یہ شوق علی گڑھ میں ہی پروان چڑھا۔

علی گڑھ کے زمانے میں مدرسۃ الاصلاح سے دو مرتبہ مولانا اختر احسن اصلاحی کا خط آیا کہ یہاں پر ایک استاد کی ضرورت ہے، آپ آجایئے۔ پہلی مرتبہ آپ نے معذرت کرلی لیکن دوسری بار رضامندی ظاہر کی۔علی گڑھ میں جب آپ کے شاگردوں اور دوستوں کو پتہ چلا تو انہوں نے آپ کا سامان چھپا دیا اور آپ کو روکنے

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

کی ہر ممکن کوشش کی، یہاں تک کہ مولانا کی ٹرین چھوٹ گئی۔ لوگوں نے سوچا کہ اب مولانا رک جائیں گے لیکن چونکہ مولانا نے جانے کا عزم کر لیا تھا اس لیے روکنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں اور مولانا علی گڑھ سے مدرستہ الاصلاح پہنچ گئے۔

مدرستہ الاصلاح میں تقریباً چھ سال تک (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۹ء) درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ اس زمانے میں آپ نے مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے بھرپور استفادہ کیا۔ مولانا کو شروع میں نحو، صرف، انشا اور مقدمہ ابن خلدون کی گھنٹیاں ملیں۔ پھر قرآن اور عربی ادب جو مولانا کا سب سے اہم موضوع تھا پڑھانے کا موقع ملا۔

مولانا نے اپنے استاذ کے کہنے پر حماسہ کے اشعار کے معانی لسان العرب سے نوٹ کر کے ایک کاپی پر لکھ لیے اور قرآن مجید کی جن آیتوں کے ترجمے میں ان اشعار سے مدد ملتی تھی اس کو بھی نوٹ کر لیا۔ مولانا کی یہ کاپی آج بھی موجود ہے۔

مدرستہ الاصلاح وہ عظیم مدرسہ ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ وہ جماعت اسلامی کا پہلا مرکز بنا۔ جماعت کا یہ مرکز بعد میں ملیح آباد منتقل ہو گیا جہاں پر کچھ لوگوں نے ایک باغ جماعت کے لیے وقف کر دیا لیکن وہاں مرکز کا قیام نہ ہو سکا اور پھر وہاں سے رامپور اور پھر دہلی، جہاں اب مستقل طور پر جماعت اسلامی کا مرکز قائم ہے۔

مولانا بتاتے تھے کہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی صلاحیتوں کا ہر ایک معترف تھا یہاں تک کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے بھی قرآن مجید کی بعض آیتوں کے متعلق آپ کو خط لکھا تھا۔ اور مولانا اختر اصلاحیؒ کی ہی رائے سے 'حکومت الٰہیہ کے قیام' کی جگہ 'اقامت دین' کی اصطلاح کو پسند کیا گیا۔ کیوں کہ اول الذکر کے بجائے ثانی الذکر قرآن کی اصطلاح سے قریب تر ہے۔

تحریک اسلامی برصغیر میں

مولانا مودودیؒ نے جس عظیم تحریک کی بنیاد ڈالی وہ تحریک چند برسوں میں پورے برصغیر میں پھیل گئی اس تحریک میں خصوصاً ہندوستان میں جن لوگوں نے اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ان میں مدرستہ الاصلاح کے فارغین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کی محنت اور کوششوں کو قبول فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمائے۔

انہیں لوگوں میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا بھی ہے۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد

مدرسۃ الاصلاح میں درس وتدریس کے وقت آپ کے ساتھی اکثر گاؤں میں جماعت کی جانب سے پروگرام منعقد کرتے اور **بلغوا عنی ولو آیۃ** کا فریضہ انجام دیتے۔

مولانا ان میں شریک نہ ہو پاتے، اس کا انہیں افسوس بھی ہوتا لیکن اس سلسلے میں وہ ان کی مدد چاہے مضامین لکھ کر یا اور کسی بھی طرح سے ضرور کرتے اور جمعہ کے روز خطبہ بھی آپ دیتے تھے (غالباً آس پاس کی کسی مسجد میں)۔ میں نے مولانا سے یہ سنا ہے کہ مولانا اختر احسن اصلاحیؒ خطبہ دینے سے بہت گھبراتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ صلاحیت نہ تھی۔ صلاحیت بے پناہ تھی لیکن بولنے سے گھبراتے تھے۔ چنانچہ جمعہ کے دن کسی طالب علم کو اپنے ساتھ لے کر گاؤں کی جانب نکلتے، کہیں اگر کوئی مولانا اختر اصلاحیؒ کے پروقار اور نور بھرے چہرے کو دیکھ کر خطبہ دینے کے لیے کہہ دیتا تو آپ اس طالب علم کو آگے بڑھا دیتے۔ مولانا اختر احسن اکثر وبیشتر مولانا عبدالحسیب صاحب کو اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ آپ کے باقاعدہ استاذ تو نہیں تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کے جو بھی درس مدرسۃ الاصلاح پر ہوتے تھے اس میں مولانا ضرور شریک ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحسیب صاحب کی عربی زبان وادب پر جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی اس کا علم ان کے اساتذہ کو بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں آپ کو مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی تمام کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ خط آج بھی موجود ہے، جس میں آپ کو ترجمہ کی باقاعدہ اجازت دی تھی۔

مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ اور دیگر اکابرین نے جس طرح سے تحریک اسلامی کی خدمت انجام دی ہے اس کی نظیر بعد میں ملنا مشکل ہے۔ چنانچہ ایک بار مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ آپ لوگوں کے زمانے میں جو لوگ مدرسۃ الاصلاح سے فارغ ہوئے انہوں نے تحریک اسلامی کی غیر معمولی خدمات انجام دی اور یہی نہیں کہ صرف تحریک اسلامی بلکہ وہ زندگی کے تمام میدانوں میں کامیاب رہے۔ مولانا نے چند لفظوں میں جواب دیا: ''ہمارے اساتذہ''، اور اس میں ایک نام مولانا عبدالحسیب صاحب کا بھی لیا۔

مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ نے نائیجیریا میں ۳۰ سال تک (۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۰ء) دعوت دین کا فریضہ انجام دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہاں اس سے پہلے جو لوگ بھی جاتے وہ رک نہیں پاتے، اس کی وجہ دراصل وہاں کی عیسائی مشنریاں تھیں جو جادو اور دوسرے ذریعہ سے دعوت دین کے کام کرنے والوں کو ہلاک کر دیتے یا ڈرا دھمکا کر

واپس کر دیتے تھے۔

لیکن مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کے سامنے ان کے تمام جادو اور چالیں ناکام ہوگئیں اور آپ نے تیس سال تک وہاں پر دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ سیکڑوں لوگ آپ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

یہ وہ بزرگ ہستیاں تھیں جنھوں نے تصنیف کتب کے بجائے تصنیف رجال پر اپنی ساری زندگی لگا دی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

افسوس صد افسوس کل جس مدرسہ سے ایسے نایاب لعل و گوہر جو شاید آج جماعت اسلامی میں کم ہی ہوں گے جن کو مدرسۃ الاصلاح نے تیار کیا تھا۔ کل کو جو جماعت کا اول مرکز بنا تھا آج وہی مرکز اپنوں کو رکھنے کے لیے تیار نہیں اور محض جماعت کے ممبر ہونے کی وجہ سے انہیں مزید خدمت کا موقع نہ دیا گیا، ان میں ایک نام مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کا بھی تھا۔

اسی سال آپ حج کو روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ ایک مجلّہ شائع ہونے والا ہے جس کا اشتہار آپ نے ایک عربی اخبار میں دیکھا۔ آپ نے 'رمی جمرات' پر فکر فراہی کی روشنی میں ایک مضمون لکھا اور مضمون لے کر اس اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے مضمون کو بہت پسند کیا اور اس کی اشاعت کے لیے تیار ہو گئے۔ کسی اصلاحی کا شاید یہ پہلا مضمون تھا جو ایک عربی رسالے میں شائع ہوا۔ بعد میں اس مضمون پر عربوں کے تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے۔ مولانا چاہتے تھے کہ جب سارے تنقیدی مضامین آجائیں تو پھر وہ ان کا جواب دیں گے لیکن نہ وہ تمام تحریریں مولانا تک پہنچ سکیں اور نہ اس کا جواب لکھ سکے۔

حج سے واپسی کے بعد آپ چند روز جامعۃ الرشاد میں رہے، جو ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھا اور مسجد میں کلاس وغیرہ ہوتی تھی۔ ایک دن علی الصبح مولانا کے رفیق و ہمدم حکیم محمد ایوب صاحب بلریاگنج کے چند لوگوں کے ساتھ مولانا سے ملنے گئے اور بلریاگنج کے مکتب میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے کی درخواست کی۔ حکیم ایوب صاحب مولانا کو بہت مانتے تھے اور سفر حج میں بھی مولانا کے ساتھ تھے اور مولانا بھی حکیم صاحب کو اپنا سب سے عزیز ساتھی بتاتے تھے۔ مولانا نے پہلے انکار کیا کہ میں نے مجیب اللہ ندوی صاحب سے وعدہ کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف حکیم صاحب اصرار پر اصرار کر رہے تھے اور چائے پانی کرنے سے انکار کر دیا اور کہا جب تک آپ راضی نہ ہو جائیں۔

مولانا کہتے ہیں کہ میرے چچا قریب میں موجود تھے کہنے لگے کہ عبدالحسیب راضی ہو جاؤ۔ آپ نے کہا:

چچا ایک شرط پر اگر مجیب اللہ ندوی صاحب نے اجازت دے دی۔ مولانا کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا کہ کسی بھی شخص کی دل آزاری نہ ہو۔ ہر کام سب کی خوشی اور رضا ورغبت سے انجام پائے تو اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور اس طرح مولانا بلریا گنج کے مکتب تشریف لے آئے اور اوّل روز سے ہی اس مکتب کو جامعہ بنانے کی فکر میں لگ گئے۔ فلاح کی قسمت کہ اسے مولانا جیسا گوہر نایاب مل گیا۔ مولانا نے بھی جب فلاح میں قدم رکھا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنے والد کے ادھورے خواب کی تکمیل میں جی جان سے لگ گئے۔

۱۹۶۴ میں جامعۃ الفلاح کی باقاعدہ بنیاد رکھی گئی۔ جہاں مولانا نے اپنی زندگی کے قیمتی ۴۰ سال لگا دیے اور جامعۃ الفلاح کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ جامعہ کے علاوہ قصبہ بلریا گنج اور خود اعظم گڑھ اس وقت اتنا ترقی یافتہ نہ تھا بلکہ راستے بھی کچے تھے۔ ایسے میں وہاں پر علماء کی ایک بڑی جماعت کا اکٹھا ہو جانا صرف مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا۔

مولانا نے نہ صرف نصاب تعلیم کو مرتب کیا بلکہ تعلیمی اور تحریکی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عمارتوں کی تعمیر و ترقی میں بھی کلیدی رول ادا کیا۔ مسجد جامعۃ الفلاح کا نقشہ بنانے سے لے کر اس کے مطابق اس کی تعمیر کرانے کا ایک بڑا کام مولانا کی ہی مرہون منت ہے جسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

دو واقعات ہیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ فلاح اپنے تعمیراتی دور میں ہے۔ شان دار مسجد کی تعمیر آپ کی رہ نمائی میں ہو رہی ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر ہر طرف رکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب پانی کے لیے صرف چِندنل ہی تھے۔ پانی کی ٹنکی یا موٹر کا تصور بھی نہیں تھا۔ ایسے میں آپ سروں پر رومال رکھے ان اینٹوں پر پانی ڈالتے رہتے۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب آپ نے صدارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ایک دفعہ باہر سے کچھ مہمان ذمہ داران جامعہ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے اس وقت بھی آپ ان اینٹوں پر پانی ڈال رہے تھے۔ ان مہمانوں نے ذمہ داران سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ انہیں مودودی ہال میں بیٹھا کر جب ہاتھ منھ دھل کر بحیثیت صدر ان کے سامنے آئے تو وہ مہمان یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ یہی بے لوث خدمات اور عظیم جذبات تھے جس نے ایک مکتب کو جامعہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اسی طرح آپ نے ایک بار بتایا کہ جب فلاح میں طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور رات میں لالٹین/لیمپ کے اردگرد طلبہ کا گھیرا بڑھنے لگا تو آپ پریشان ہو گئے کہ اس سے طلبہ کی آنکھوں کی روشنی متاثر ہو جائے گی۔

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

آپ نے اسی دن سے بجلی کنکشن کی کوشش شروع کردی۔مختلف لوگوں سے ملے۔کافی تگ ودواور دوڑ دھوپ کے بعد بھی جب کنکشن نہیں مل سکا تو ایک دن خود ہی نکل پڑے۔اس وقت بجلی محکمہ کی آفس جین پور میں تھی جو جامعۃ الفلاح سے تقریباً ۱۵رکلومیٹر کی دوری پر ہے۔آپ پیدل ہی چل پڑے۔راستے میں بہت سے لوگوں نے حوصلہ شکن،طنزاور مایوسانہ باتیں کیں لیکن آپ کے ارادے کو کمزورنہیں کرسکیں۔جب آپ اس آفس میں پہنچےاوراپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو وہ آفیسر متاثر بھی ہوااورخوش بھی اور وعدہ کیا کہ جلد ہی بجلی کا ایک تار ادارے میں پہنچ جائے گا۔آپ بتاتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے اندر ہی بجلی کنکشن مل گیااورفلاح روشن ہوگیا۔

خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں

مولانا نے اپنی آدھی زندگی (۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۴ء) جامعۃ الفلاح میں لگادی اوراس کی ترقی کے لیے خودکووقف کردیا۔اس زمانے میں مولانا کا گھر گرچہ بہت دور نہ تھالیکن وہ مدرسہ پر ہی قیام کرتے۔جمعرات کو گھر جاتے اورسنیچر کی صبح پھر جامعہ آجاتے۔مولانا مزاج میں بالکل اپنے اساتذہ کو پڑے تھے،اپنا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کبھی کسی کو نہ کرنے دیتے۔طلبہ کوشش کرتے کہ نل ہی چلادیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔

ایک ایسا شخص جس نے اپنی پوری زندگی جامعہ کے لیےخرچ کردی۔ملک وبیرون ملک اس کے لیے متعدد سفر کیے۔عرب ممالک میں فلاح کا اوّلین اور جامع تعارف آپ ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔آپ جب عربوں کے سامنےفصیح عربی میں جامعہ کا تعارف پیش کرتے تو عرب شیخ تعجب کرتے کہ ایک ہندی اتنی فصیح زبان میں گفتگو کیسے کرسکتا ہے۔ایسے شخص کو چالیس سال بعدایک خط دیا جاتا ہے۔اس کو پڑھنے کے بعد مولانا کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو

بے شک یہ خط مولانا پر تیرنیم کش کی مانند ثابت ہوا۔افسوس اس وقت مزید ہوتا ہے جب یہ خط ایک چپراسی کے ذریعے دے دیا جاتا ہےاوران کی غیرمعمولی خدمات کے اعتراف میں کسی نشست کا بھی اہتمام نہیں کیا جاتا ہے۔

ہم ہی ان کو بام پہ لائے اور ہمیں محروم رہے

جس نے چالیس سال تک اپنی زندگی جامعۃ الفلاح کی تعمیروترقی اوردرس وتدریس میں لگادی اس شخص کواب مزید خدمت کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔مولانا نے یہاں تک کہا کہ مجھے کسی سے بھی کوئی شکایت نہ

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

ہوگی اور نہ ہی تنخواہ چاہیے بس مجھے قرآن پڑھانے سے دور نہ کیجیو، یہی میری متاع حیات ہے۔ اور کل آخرت میں یہی میری مغفرت کا سبب ٹھہرے گا۔ لیکن ان باتوں کی جانب ذرا بھی توجہ نہ دی گئی اور بالآخر مولانا ہزاروں امنگوں، خواہشوں اور حسرتوں کو دل میں رکھ کر گھر چلے آئے۔

یہ سلسلہ ہے جو دراز ہے

جامعۃ الفلاح سے مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ غالبًا وہ پہلے استاذ تھے جن کو ریٹائرمنٹ کا حوالہ دے کر مزید خدمت کا موقع نہ دیا۔ لیکن یہ اگر اول اور آخر ہوتا تب بھی ذرا صبر کر لیتے لیکن یہاں تو ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو دراز ہے، جو روکے نہیں رکتا۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ قدیم طلبہ میں اپنے استاذ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی قدر ومنزلت آج بھی باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے بیشتر پروگراموں میں مولانا کو نہ صرف یاد رکھا گیا بلکہ پروگرام کی صدارت سے لے کر تعمیری کاموں کا افتتاح اور سنگ بنیاد مولانا کے ذریعہ ہی انجام پائی۔

گمنامی جو وراثت میں ملی

علامہ حمیدالدین فراہیؒ کے دو ممتاز شاگرد زیادہ مشہور ہوئے، ایک مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور دوسرے مولانا اختر احسن اصلاحیؒ۔ علامہ فراہیؒ نے ایک بار دونوں شاگردوں سے کسی عنوان پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی، جب علامہ نے دونوں لوگوں کا مقالہ پڑھ لیا، اس وقت ایک قیمتی بات کہی: جو لوگ خاموش رہتے ہیں سوچتے زیادہ ہیں۔ (ص ۸۸، شیدائے قرآن از مولانا عنایت اللہ سبحانی) مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کی طرح مولانا بھی بہت کم بولتے تھے۔ مولانا اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

> ''خوش قسمتی سے میرے ادب وقرآن کے استاذ آغاز ہی سے مولانا فراہیؒ کے شاگرد رشید اور ان کی فکر کے جانشین مولانا اختر احسن اصلاحی صاحب تھے، اس طرح آغاز سے ہی مولانا فراہیؒ کے نام، ان کی فکر اور کام سے واقف اور آشنا ہوا، اور یہ فکر میرے دل ودماغ میں پیوست ہوگئی''۔

أتـــانـــي هـــواهـــا قبـــل أن أعـــرف الهـــوى
فـصـــادف قـــلبـــا فـــارغـــا فتـمـكـنـــا

جس طرح مولانا کے اندر فکر قرآنی پیوست ہوگئی تھی اسی طرح ان نایاب گوہروں کے اخلاق وکردار بھی

مولانا میں داخل ہو چکے تھے۔ مولانا آخری ایام تک جامعہ کے انتظامیہ کے ممبر رہے۔ کم بولتے لیکن اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے۔ لیکن پچھلے سال کی میٹنگ میں محض اتنا بول دیا تھا کہ:

''قرآن فریاد کر رہا ہے۔۔۔۔۔'' یعنی قرآن مجید کے طریقۂ تدریس اور نصاب کی جانب توجہ دلائی اور اس کی اہمیت کو لوگوں کے سامنے بیان کیا۔ اس دن گھر پر آنے کے بعد بہت پریشان تھے۔ بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ کبھی کچھ نہ بولتا تھا لیکن اب کی نہ جانے کیسے بول دیا۔ میری بات کسی پر گراں نہ گزری ہو۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

میں نے مادر علمی جامعۃ الفلاح میں زندگی کے ۱۳ سال گزارے ہیں۔ بارہا ایسا محسوس ہوا کہ وہ عمارتیں جن کی بنیاد مولانا اور مولانا جیسے نیک طینت لوگوں کے ہاتھوں رکھی گئی تھیں اور وہ درخت جس کا بیج ان لوگوں نے لگایا تھا، تیز تیز آوازوں میں مجھ سے یہ کہہ رہے ہوں کہ کہاں چلے گئے وہ لوگ جن کو دیکھ کر آنکھوں کو سرور ملتا تھا۔ درخت کے ایک ایک پتے، عمارتوں کی ایک ایک اینٹ اپنے اسلاف سے واقف ہیں کیونکہ ان لوگوں نے یہاں پر اپنا وقت لگایا، پسینہ بہایا، خلوص بکھیرا، اور بے لوث خدمت کی عظیم مثال قائم کی۔

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

جوانی کے سارے ایام جامعۃ الفلاح میں لگا دیے، یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد بندول کے ایک اسکول جو کہ جامعہ کی ہی شاخ ہے، میں تقریباً ۱۲ سال تک تدریس سے وابستہ رہے۔ آخر کے چند سال مولانا گھر ہی پر رہ رہے تھے۔ اس سب کے باوجود مولانا کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ سویرے سونا، سویرے اٹھنا۔ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان گزارنا۔ پوتوں اور پوتیوں سے بے پناہ انسیت تھی، باتوں باتوں میں انہیں کچھ سکھانا، ہنسانا، سمجھانا اور نصیحت کرنا مولانا کی خاص عادت تھی۔

مولانا کو جماعت اسلامی سے گہری محبت تھی۔ ۱۹۴۹ میں آپ باقاعدہ رکن بن گئے تھے۔ دہلی سے آنے والوں سے سب سے پہلے جماعت کے احوال جاننا چاہتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے جب بھی جانا ہوتا اکثر وہ دعوت اخبار پڑھتے ہوئے ملتے۔ جب تک صحت ٹھیک تھی ہفتہ واری پروگرام میں پابندی سے شرکت کرتے حالانکہ اس کے لیے مولانا کو علاؤالدین پٹی گاؤں سے بلریا گنج تک آنا ہوتا لیکن پھر بھی بلاناغہ پہنچتے تھے۔ اسی طرح دعوت اخبار کا بہت شدت سے انتظار کرتے تھے۔ تاریخوں سے انہیں یاد رہتا کہ فلاں شمارہ پڑھ لیا ہے، فلاں تاریخ کا ابھی نہیں پڑھا ہے۔

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

مولانا جب گھر پر آتے تو اس وقت ماموں یا ہم بھائیوں میں سے کوئی انہیں پہنچا دیتا لیکن اگر صبح یا پڑھائی کے درمیان والے وقت میں آتے تو کیا مجال کی کوئی انہیں بائک سے چھوڑ دے، کیونکہ وہ راضی ہی نہیں ہوتے، ''آپ پڑھائی کریئے''بس یہی کہتے تھے۔ایک بار کا واقعہ ہے گیارہ بجے کا وقت تھا، وقفہ میں میں گھر آیا ہوا تھا، اتفاق سے مولانا بھی آئے ہوئے تھے۔ بہت کوشش کی کہ آپ کو گھر تک پہنچا دوں، اتنی دور کیسے پیدل جائیں گے لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ میں نے کہا کہ گھنٹی خالی ہے لیکن پھر بھی جواب یہ ملا کہ 'آپ پڑھائی کریئے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ محض ایک چھوٹا سا واقعہ ہوگا لیکن حقیقت میں اس میں ہمارے لیے بڑی نصیحت ہے۔

آپ ہم سب کے مربی تھے۔ ہم سب بھی آپ کی بہت عزت کرتے۔اپنی ہر خوشی میں آپ کی شرکت کو ضروری سمجھتے اور آپ بھی ہر موقع پر اپنی شفقت و محبت اور دعاؤں سے ہمیں نوازتے۔عید اور بقرعید میں ہم لوگ علاؤ الدین پٹی ضرور جاتے ۔اس وقت مولانا اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتے اور سب سے خیریت پوچھتے، باتیں کرتے ۔ چھوٹوں سے ہنسی مذاق بھی کرتے اور بڑوں سے سنجیدہ گفتگو بھی۔ میرے بچپن کا ایک واقعہ انہیں اتنا یاد تھا کہ اکثر مجھے وہ خود یہ واقعہ سناتے تھے۔مولانا کے گھر پر عید اور بقرعید میں پینے والی سویّوں کا اہتمام ہوتا تھا اور مولانا ہم لوگ سے اور اور پینے کے لیے بار بار کہتے۔

آپ کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ دو بیٹیوں کی رحلت آپ کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔ بیٹا (محمد شارق) بچپن سے ہی جسمانی لحاظ سے کمزور تھا لیکن آپ نے ان کے علاج کے لیے کبھی ہار نہیں مانی اور ان کے علاج کے لیے اعظم گڑھ سے لکھنؤ تک ہر ممکنہ علاج کی کوشش کی۔اس وقت گاڑیوں کی اتنی سہولیات نہیں تھیں۔آپ کندھے پر بیٹے کو بٹھا کر میلوں سفر کرتے تھے۔ڈاکٹر سے ملتے۔کوشش کرتے کہ بہتر سے بہتر علاج ممکن ہو سکے۔علاج کرا کر اپنی ساری امیدیں اس رب ذوالجلال والاِکرام سے ہی وابستہ کرتے جو شفا دینے والا ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

۲۵رفروری بروز منگل قریب ڈھائی بجے امی جان کا فون آیا اور مولانا کے انتقال کی خبر دی۔اچانک ملی اس خبر سے پریشان سا ہوگیا۔ایسا لگا کہ ہم نے کتنا قیمتی سرمایہ کھو دیا۔فوراً علی گڑھ سے دہلی آیا۔ دہلی بھی اس دن فسادات میں جل رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ منظم طور پر مسلم علاقوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔مسلمانوں کے

مجھے ان سے بے پناہ محبت تھی!

جان و مال کا کافی نقصان ہوا تھا۔دونوں خبریں میرے لیے کافی پریشان کن تھیں۔پھر دہلی سے ماموں کے ساتھ اعظم گڑھ کے لیے نکل گیا۔بس کے لیٹ ہوجانے کی وجہ سے بھاگتے بھاگتے جنازے میں شریک ہوئے۔

مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر کہ انتقال سے دو دن پہلے مولانا مجھے یاد کر رہے تھے،امی جان بتارہی تھیں کہ میرے چھوٹے بھائی کی جانب اشارہ کرکے پوچھ رہے تھے کہ اس سے بڑا والا کہاں ہے۔علی گڑھ کے حالات کی وجہ سے مولانا میرے لیے پریشان تھے۔

ساری زندگی قرآن مجید کی چلتی پھرتی تصویر بنے رہے۔سادگی کا یہ عالم تھا کہ چند کپڑوں اور دوشیروانی کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں مولانا اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ **انا للہ وانا الیه راجعون**

اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات کو بلند فرمائے۔ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ اور ارفع مقام عطا فرمائے اور ہمیں مولانا کے علمی کاموں کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

●❐●

نهى رسولُ اللّهِ ﷺ عن شريطة الشيطان ،وهى التى تذبح فيقطع الجلدو لاتفرى الأوداج.

[سنن ابوداؤد، كتاب الضحايا، باب فى المبالغة فى الذبح]

’رسول اللہ ﷺ نے شیطان کے نشتر سے منع فرمایا ہے۔اس سے مراد وہ نشتر ہے جو ذبح کے وقت جلد کو تو کاٹ دے،لیکن گردن کی رگوں کو نہ کاٹے۔‘

خدا بخشے! ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں

عبداللہ زکریا

مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کی وفات کے ساتھ ہی علم کی وہ شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی جس نے تقریبا آٹھ دہائیوں سے اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا، صرف علاءالدین پٹی لکھ کر نہ تو میں مولانا کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور نہ ہی ان کا قد چھوٹا کرنے کی کوئی مذموم سازش ہے۔ اس سے مقصود صرف ساکنان علاءالدین پٹی کو جتلانا ہے کی کیسی عظیم شخصیت ان کے درمیان سے اٹھ گئی۔ گاؤں کے سادہ لوح لوگ مولانا سے عقیدت تو بہت رکھتے تھے لیکن کسب فیض کے مرحلے شاذونادر آتے، دوسروں کا کیا شکوہ کریں ہم نے خود کبھی بھی مولانا سے براہ راست اکتساب فیض نہیں کیا۔ بیچ میں رشتے داری کی دیواریں حائل تھیں۔ میرے مزاج کا یہ عجیب خاصہ ہے کہ میں ہمیشہ سے رشتہ داروں اور قرابت داروں سے بات چیت یا تبادلہ خیال میں ایک حجاب سا محسوس کرتا ہوں۔ اسی لیے میں دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کا بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔

مولانا کی عربی دانی اور انشا پردازی کی دھوم چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی لیکن میں کبھی بھی اتنی ہمت نہ جٹا سکا کہ اس بحر ذخار سے علم وحکمت کے چند موتی چن لوں۔

دیانت داری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ میں اس بات کا اعتراف کروں کہ تادم تحریر میں نے مولانا کی نہ تو کوئی کتاب پڑھی ہے اور نہ ان کا کوئی عربی ترجمہ۔ فضیلت کے آخری سالوں میں ضرور ان سے سبعہ معلقات پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس میں میرے ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، اتفاق سے میں بھی اس کلاس کا حصہ تھا، جس میں مولانا کی شیریں گفتار اور عربی زبان میں ان کی شناوری سارے کلاس پر ایک سحر طاری کر دیتی۔

مولانا کو میں نے ہمیشہ نحیف ونزار اور بیمار ہی دیکھا۔ صحت اور مرض کی یہ آنکھ مچولی آخری وقت تک چلتی

رہی، پتہ نہیں چلتا مولانا کی طبیعت آج اس قدر خراب ہے یا کل کے مقابلے میں خراب تر۔

میرا ایک مشاہدہ ہے کہ جو لوگ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں وہ بڑی لمبی عمر پاتے ہیں۔ مولانا کی عمر بھی انتقال کے وقت 90 سال سے زائد تھی، عمر کی طوالت جہاں خوشیوں کے ہزار ہا مواقع فراہم کرتی ہے وہیں کچھ ایسے کچوکے بھی لگاتی ہے جسے آدمی تاعمر نہیں بھولتا۔ مولانا کی زندگی میں بھی تین بار ایسے جانکاہ صدمے آئے ہر بار مولانا صبر اور شکر کا پیکر بنے رہے۔

ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر عین جوانی میں داغ مفارقت دے گئیں، پھر سب سے بڑی بیٹی کو اسی مرض نے آدبوچا اور ایک نواسا عین عنفوان شباب میں چل بسا، نواسے کا انتقال سب سے زیادہ تکلیف دہ حادثہ تھا۔ وہ مولانا کی ایک بیٹی اور میری (پھوپھی زاد) بہن کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس صدمے سے ابھرنے میں خود مجھے کئی سال لگ گئے، لیکن میں نے مولانا کو کبھی بھی شکوہ کناں نہیں دیکھا۔ چھوٹی بیٹی کے انتقال کے وقت میں موجود تھا، جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے مولانا کی آنکھیں خشک تھیں اور زبان سے بار بار یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے **اللھم اغفر لھا اللھم اغفر لھا**۔

ہر آدمی اپنے چہرے پر ایک نقاب اوڑھے رہتا ہے جو صرف گھر کے اندر اترتی ہے، مولانا کو میں نے گھر کے باہر اور گھر کے اندر یکساں پایا، پھوپی ہماری انتہائی نیک طینت، سادہ لوح اور سیدھی سادھی گھریلو خاتون تھیں، تعلیمی لیاقت اس وقت جتنی عام تھی یعنی گلستاں بوستاں تک تھی، مولانا کا ذوق انتہائی شستہ اور طبیعت حد درجہ کڑھی ہوئی تھی لیکن اس علمی تفاوت نے کبھی بھی ان کے تعلقات میں تلخی نہیں گھولی۔

میں نے کبھی بھی مولانا کو اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا، ان کے تکلم میں ایک انوکھا انداز مجوبی تھا، گھر میں داخل ہوتے ہوئے ایک خاص انداز میں شارق شارق کہتے اور پھوپھی سمجھ جاتیں کہ ان کی طلبی ہو رہی ہے، وہ سارے کام کاج چھوڑ کر ان کی طرف لپک پڑتیں۔ پچاس سال سے زائد اس خوشگوار اور مثالی ازدواجی زندگی کا خاتمہ پھوپھی کے انتقال کے ساتھ ہی ممکن ہو پایا۔ ایک مونس و غم خوار کی کمی اور تنہائی کا علاج انہوں نے اپنے پوتے اور پوتیوں میں ڈھونڈھ لیا اور اپنی ساری توانائی ان کی تعلیم اور تربیت پر صرف کرتے رہے۔

مولانا کے کردار کی راستگی اور ان کے حلم وتحمل کا سب سے روشن پہلو اس وقت سامنے آیا جب ان کو اور ان کے کچھ ساتھیوں کو جامعۃ الفلاح سے جبرا ریٹائر کر دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مدرسۃ الاصلاح کی ملازمت چھوڑ کر آئے تھے اور جامعۃ کی سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں رکھی تھی، برسہا برس کی کڑی محنت اور خون پسینہ سے

آبیاری کے بعد جب ان کا خواب ایک تناور درخت بن گیا، اس وقت ان کو یہ کہہ کر جامعۃ الفلاح سے نکال دیا گیا کہ آپ کی عمر اب جامعہ کی خدمت کے لائق نہیں رہی، ارباب حل وعقد جواز میں چاہے جو دلیلیں پیش کریں لیکن حقیقت جگ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ذہنی طور پر چاق وچوبند تھے کوئی جسمانی عارضہ بھی لاحق نہیں تھا۔

مولانا کو چاہے جتنی بھی دلی تکلیف رہی ہو ان کی زبان سے کبھی بھی حرف شکایت نہیں سنا۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور علم کے پیاسوں کی تشنگی دور کرنے کے لیے انہوں نے قریب کے ایک گاؤں بندول کے مدرسہ میں بچیوں کو قرآن کی تفسیر پڑھانا شروع کر دیا، اس خدمت سے مالی منفعت بالکل بھی نہیں تھی کیونکہ زمین داری کے خاتمے کے بعد بھی گاؤں میں مولانا کی زرعی زمینیں سب سے زیادہ تھیں، جو ان کی کفالت کے لیے کافی تھیں۔

مولانا سے آخری ملاقات انتقال سے چند روز قبل ہوئی۔ میں اتفاق سے اپنے ایک ہمزاد کی شادی میں گاؤں گیا ہوا تھا، بستر علالت پر انھیں دیکھ کر بالکل بھی اچھا نہیں لگا، قوت گویائی جزوی طور پر سلب ہو چکی تھی، اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے، ہوش وحواس البتہ بالکل درست تھے، بار بار ہونٹوں پر کوئی آیت یا کوئی دعا آجاتی اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیتے۔

جس روز میں گیا طبیعت قدرے بہتر تھی، بار بار پھنسی ہوئی آواز اور اشاروں سے اپنی ڈائری مانگتے، معلوم ہوا کہ توحید کے موضوع پر کوئی کتاب لکھ رہے ہیں، صرف آخری باب لکھنا باقی رہ گیا ہے، جس کی تکمیل کے لیے وہ حد درجہ پریشان تھے، ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، کاش ان کا کوئی شاگرد رشید یہ آخری باب لکھ کر کتاب کو زیور طباعت سے آراستہ کر دے، ان کے حق میں اس سے بہتر کوئی اور خراج تحسین نہیں ہوسکتا۔ مولانا تو اپنی جان کا قرض اتار کر رخصت ہو گئے۔ اب کوئی شاگرد آگے آئے اور اپنا قرض اتار دے۔ **و ما جزاء الاحسان الا الاحسان۔**

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی

مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے ملاقات

صفی الرحمٰن نبیل

مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جس نے کبھی بھی مولانا سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے متعلق گفتگو کی ہو۔ مولانا کے سامنے جب بھی مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا نام آتا، کمزوری کے باوجود ایسا لگتا کہ ان کے اندر طاقت آ گئی اور چہرہ گلاب کی مانند کھل اٹھا۔ رفتہ رفتہ آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور گفتگو دراز ہوتی گئی۔ سننے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا مولانا کل ہی ملاقات کر کے آئے ہیں اور سارا واقعہ تفصیل سے سناتے چلے جا رہے ہیں۔

پچھلے سال کی بات ہے۔ مولانا گھر پر آئے ہوئے تھے اور اس وقت اتفاق سے بڑے ماموں جان (ڈاکٹر عبدالعزیز فارس فلاحی) گھر پر موجود تھے۔ ماموں جان بھی مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تحریروں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ماموں جان نے مولانا کو مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ایک ویڈیو دکھانا شروع کیا، مولانا اسے بہت شوق سے دیکھتے اور سنتے رہے اور ان کی اس وقت وہی کیفیت تھی جس کیفیت کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

ویڈیو چالیس منٹ کی تھی اور مولانا کو علاؤالدین پٹی میں کچھ کام تھا جس کی وجہ سے باوجود حسرت کے اسے مکمل نہ دیکھ سکے۔ بعد میں مجھ کو خیال ہوا تو مولانا کو وہ ویڈیو دکھائی۔

مولانا نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو اپنے بچپن میں ہی دیکھ لیا تھا۔ مولانا کے والد محترم نے گاؤں میں ایک پروگرام منعقد کیا تھا، جس میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ تشریف لائے اور خطاب بھی فرمایا۔ مولانا کہتے تھے کہ اس وقت میں کمسن تھا مجھے یاد نہیں، گویا بچپن میں ہی استاد محترم کو دیکھ لیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ یہ دوریاں قربت میں بدل گئیں۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے مولانا کے والد محترم کو بھی محبت رہی ہوگی اور اس کی جیتی جاگتی مثال مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو پروگرام میں آنے کی دعوت دینا تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے مدرسۃ الاصلاح پہ پہنچنے کے بعد دوریاں ختم ہوئیں اور استفادہ آسان

ہوگیا۔مولانا امین صاحب کے تمام پروگراموں میں مولانا ضرور شریک ہوتے اور خصوصا درس قرآن میں۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کومولانا کی صلاحیتوں کا اندازہ مدرسۃ الاصلاح پر ہی ہوگیا تھا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ بعد میں انھوں نے مولانا کو اپنی تمام کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کی تحریری شکل میں اجازت دے دی تھی۔

مولانا نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تمام کتابوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔مولانا کا مطالعہ کرنے کا انداز بڑا ہی خوبصورت تھا۔وہ کتاب میں جن باتوں کو بھی عمدہ سمجھتے اور اسے نوٹ کرنا چاہتے تو اس کو کتاب کے پہلے صفحہ پر یا کور پیج پر اس بات کو مختصراً لکھ لیتے اور صفحہ نمبر بھی نیچے لکھ لیتے تھے۔جس سے بعد میں بآسانی تمام باتوں کو بیک وقت پڑھا جاسکتا ہے۔اور گویا کہ وہ ایک طرح کا نوٹ تیار ہوجاتا اور جس سے بعد میں پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بجائے صرف اس مختصر نوٹس سے استفادہ کرکے کتاب کے مقصد تک پہنچنا آسان ہوجاتا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی زیر سرپرستی ماہنامہ تدبر نکلتا تھا۔لگتا ہے کہ ہر مہینہ مولانا کے پاس نہیں آتا تھا یا وہ پرچے ادھر ادھر ہوگئے، بہرحال مولانا کی لائبریری میں چار پرچے ملے۔ہر پرچہ کا مطالعہ بہت ہی باریک بینی سے مولانا نے کیا تھا اور جیسا کہ مولانا کے مطالعہ کا طریقہ اوپر بتایا کہ کس طرح مولانا باتوں کو مختصراً صفحہ کے حوالے کے ساتھ نوٹ کرلیتے تھے وہ چیز تمام پرچوں میں دیکھنے کو ملی۔

تدبر قرآن کے حوالے سے ایک بار میں نے مولانا سے سوال کیا کہ مولانا اس پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کہنے لگے کہ عمارت کی مکمل تعمیر بذات خود ایک بہت بڑی بات ہے۔عین ممکن ہے کہ مکمل تعمیر میں کچھ کمی رہ گئی ہو۔عمارت کی تعمیر ایک انتہائی مشکل کام ہے، جب کہ تعمیر شدہ عمارت میں نقص نکالنا انتہائی آسان۔

وہ مجھ ناچیز کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ تدبر قرآن علمی دنیا کے لیے شان دار کارنامہ ہے اور صرف یہی نہیں کہ صاحب تدبر قرآن کا جو دعویٰ تھا وہ ثابت ہوگیا بلکہ اس طور سے ثابت کیا کہ پورے قرآن کی تفسیر میں اس کو دلائل کے ساتھ سامنے لاکر رکھ دیا۔اس بڑی کوشش کو مولانا نے عمارت کی تعمیر سے تعبیر کیا ہے۔

یہ واضح حقیقت ہے کہ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے تفسیر قرآن کے جو اسلوب بتائے اور اس سلسلے میں انہوں نے خود چند سورتوں کی تفسیر ان اسلوب کی روشنی میں کرکے دکھایا اور بعد میں مولانا امین صاحب نے اس کو کامل طریقے سے اپنی تفسیر میں واضح کردیا۔

مدرسۃ الاصلاح کے بعد مولانا کی ملاقات مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے اس وقت ہوئی جب مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتقال (۱۹۷۹ء) پر مولانا پاکستان گئے تھے۔ مولانا کو جیسے ہی پتہ چلا کہ ویزا بآسانی مل جائے گا تو آپ مولانا نور محمدؒ (سابق استاد جامعہ) کے ساتھ جامعۃ الفلاح سے فوراً روانہ ہوگئے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد اس وقت مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا ملاقات کا واقعہ اکثر سناتے تھے اور سناتے وقت ان پر عجیب سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور آواز لڑکھڑا رہی ہوتی۔

مولانا کے بہت سے شاگردوں نے ان واقعات کو قلم بند کرنے کی درخواست کی لیکن مولانا کہتے کہ ''مولانا امین صاحب، موتی ان کی زبان سے جھڑ رہے تھے اور جب میں انہیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ بکھرنے لگتے ہیں...... تقریباً ڈھائی گھنٹے تک مولانا امین صاحب مجھ سے بات کرتے رہے اور تحریک تعلیم سے لے کر ملک اور مدرسوں تک بہت سے موضوعات پر گفتگو کی۔ بہت سی رازدارانہ گفتگو بھی کی۔ تحریک سے اختلافات کی وجہ بھی بتائی...''۔ مولانا نے کبھی بھی اپنے استاذ اور مربی کی ان باتوں کا نہ تذکرہ کیا اور نہ کبھی کسی کاغذ پہ لکھی ان کی کوئی تحریر ہمیں ملی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس عقیدت ومحبت کا صلہ یوں دیا کہ مولانا عبدالحسیب صاحب کو اپنی تمام کتابوں کے ترجمہ کی اجازت دے دی۔ اس محبت کا اندازہ خطوط کے انداز وبیان سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں: ''مولوی عبدالحسیب صاحب کو میرا بہت بہت سلام لکھ دیجیے۔ وہ میری کتابوں میں سے جس کتاب کو بھی ترجمہ کے لائق خیال کریں شوق سے اس کا ترجمہ کریں۔ میں ان کی عزت افزائی کا شکر گزار ہوں........''۔ (رحمان آباد، ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء)

ایک دوسرے خط کا جواب ملاحظہ ہو:

''المجتمع میں مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پرچہ معیاری اور اسلامی ہے۔ مولانا عبدالحسیب صاحب ماشاءاللہ اچھی عربی لکھ لیتے ہیں، میں تو اب لکھنے اور بولنے میں تکلف محسوس کرتا ہوں، ان کو میری طرف سے سلام لکھ دیجیے اور اطمینان دلایئے کہ اس خدمت کو جاری رکھیں''۔ (رحمان آباد، ۲۶/جنوری ۱۹۷۷ء)

مولانا نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ 'حجاب کے احکام قرآن مجید میں'، 'دعوت دین اور اس کا طریقہ کار'، 'حقیقت شرک'۔ ان تینوں میں سے اول الذکر دونوں کتابیں پہلے بھی ملک وبیرون ملک سے شائع ہوچکی تھی، بعض تصحیح کے بعد یہاں سے بھی شائع ہوچکی ہیں۔ حقیقت شرک، جو ایک عربی مجلّہ میں قسط وار شائع ہوئی تھی اب پہلی بار کتابی شکل میں جلد ہی ان شاءاللہ شائع ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ

مولانا سید احمد عروج قادری کی کتاب 'عہد حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح پر ایک نظر' کا بھی عربی میں ترجمہ کیا تھا جو سعودی عرب سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

ان کے علاوہ مولانا حقیقت توحید اور تزکیۂ نفس کا بھی ترجمہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ مولانا نے حقیقت توحید کا ترجمہ شروع کر دیا تھا لیکن بیچ بیچ میں متعدد آزمائشوں نے مولانا کو اس کام کو مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ مولانا کی کاپی اور ڈائریوں سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے کئی مرتبہ حقیقت توحید کا ترجمہ شروع کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ شروع کرتے پھر کسی وجہ سے وہ کام چھوٹ جاتا، پھر دوبارہ دوسری جگہ شروع کر دیتے۔ اس طرح سے تقریباً تین چار جگہوں پر مولانا نے ایک ہی کام کو بار بار کیا تھا۔ کہیں پہ صرف مقدمہ ہے تو کہیں پہلی فصل تک پہنچ گئے ہیں۔ بیماری کے آخری دنوں میں وہ یہی کہتے رہتے کہ اگر زندگی رہی تو اس کام کو مکمل کروں گا۔

خود پر افسوس ہوتا ہے کہ مولانا سے اتنے قریب رہنے کے باوجود کبھی ان کی مدد اس سلسلے میں نہ کر سکا۔ ان کو وہ پرسکون ماحول نہ فراہم کر سکا، جہاں رہ کر مولانا اپنے ان علمی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے۔ مولانا خود اس سلسلے میں کبھی بھی کسی سے معاونت کرنے کی خواہش کا اظہار بھی نہیں کرتے۔

۲۰۱۱ء میں جب پہلی بار مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب کی کوششوں سے جامعہ اسلامیہ شانتاپورم سے مولانا کا ترجمہ ''**التفسير الحقيقي للاسلام، مقارنة بين آراء المودودي والندوي**: سید احمد عروج القادری'' شائع ہوا، تو گویا مولانا کو ایک حوصلہ ملا۔ اس کے بعد مولانا نے قاسم ماموں کو پھر اپنے دیگر علمی کاموں سے آگاہ کیا اور ماموں نے دھیرے دھیرے مولانا کی کتابوں کی ٹائپنگ شروع کی اور ان کو قابل اشاعت بنایا۔ ماموں اس وقت بھی مولانا کے ایک ترجمہ ''حقیقت شرک'' کی اشاعت کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے مولانا کے علمی کاموں کو تلاش کرنے اور ان کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کی توفیق، صلاحیت اور قوت عطا فرمائے۔ آمین

کیا لوگ تھے جو اس راہ وفا سے گزر گئے

ماثورات

مولانا عبدالحسیب اصلاحی سے ایک انٹرویو

عمران احمد اصلاحی

سوال: پہلے آپ اپنا مکمل تعارف کرائیے اور اپنے گھریلو ماحول پر کچھ روشنی ڈالیے؟

جواب: میری پیدائش اعظم گڑھ کے شمال میں واقع موضع علاؤالدین پٹی، جس کی سرحدیں جنوب مغرب میں موضع بندول سے ملتی ہیں، کے ایک ایسے خاندان میں وسط اگست ۱۹۲۸ء میں ہوئی جو نہایت دین دار، تعلیم یافتہ اور متوسط درجہ کا زمیندار خاندان تھا۔ زمین داری کے باوجود ان کا دامن اسامیوں اور کاشت کاروں کے ساتھ ظلم وزیادتی سے پاک تھا۔

میں نے اپنے دادا ابوعیسیٰ نور محمد ترابی کو دیکھا نہیں کہ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ وہ ایک اہلِ حدیث عالم تھے، گھر پر رہتے لیکن زمین داری اور زراعت کے کاموں سے بالکل واسطہ نہ رکھتے۔ یہ سارے کام مولانا عبدالسلام ندویؒ کے والد دادا دین محمد کی نگرانی میں انجام پاتے۔ دادا مرحوم تو گھر کے ایک بالا خانہ پر جوان کے لئے خاص تھا وہیں گویا معتکف رہتے اور اپنے اوقات مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف میں گزارتے۔ کتابوں کا اچھا ذخیرہ اکٹھا کیا تھا۔ دو بڑی الماریاں کتابوں سے بھری تھیں جن میں تفاسیر قرآن، کتب احادیث اور دیگر علمی اور دینی کتابیں تھیں۔ دادا کی کتابوں میں متعدد مسودات اور مطبوعہ رسالے ملے۔ ایک 'تحفۃ الولدان' دوسرا 'تحفۃ الخلیل'۔ اول الذکر رسالہ چھوٹوں کے لیے آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول پر مشتمل تربیتی رسالہ تھا۔ دوسرا اسی طرز پر بڑوں کے لئے۔ جو مسودات ملے وہ سب بہت ہی خوش خط قلمی کتاب کی شکل میں۔ ایک رسالہ 'السراج الوھاج للحاج' کا مسودہ بھی خوش خط لکھا ہوا قلمی کتاب کی شکل میں ملا تھا۔ آخرالذکر مسودہ کے سلسلے میں مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین نے جو ان دنوں شبلی اکیڈمی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ڈائرکٹر تھے اور میں مدرسۃ الاصلاح میں استاذ تھا اپنے خط میں پوچھا تھا کہ وہ رسالہ چھپا کہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسودہ مولانا انصاری کے دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں ان کی نظر سے گزرا ہوگا کہ

دادا ان دنوں دارالمصنفین جایا کرتے تھے۔ جس کی صراحت مولانا انصاری کے ایک خط میں بھی ہے۔ مولانا انصاری نے مولانا عبدالسلام ندویؒ کی سوانح حیات کی تالیف کے موقع پر مولانا کے ذاتی اور خاندانی احوال اور ضروری معلومات کی ضرورت تھی۔ دادا مرحوم کی جمع کردہ کتابوں میں صحیح بخاری کا نسخہ اب بھی محفوظ ہے۔ یہ نسخہ مطبوعہ مصر ہے اور ۱۳۰۶ھ کا طبع شدہ ہے، علامہ شمس الحق عظیم آبادی (پٹنہ) جن دنوں ابوداؤد کی شرح 'عون المعبود' لکھ رہے تھے ہمارے دادا بھی علامہ کے پاس ۳،۴ سال وہیں مقیم رہ کر 'عون المعبود' کی تالیف میں علامہ کی معاونت کرتے رہے اسی دوران کئی بار علامہ کے ساتھ دادا نے حج بھی کیا، جب یہ تالیف مکمل ہو کر چھپ کر آئی تو علامہ نے اس کا نسخہ اپنے دستخط سے مزین کر کے دادا مرحوم کو ہدیہ کیا تھا جس کو دادا کے بعد والد صاحب نے اپنے پاس بحفاظت رکھا اور اسے حرز جاں بنائے رکھا لیکن بندول سے متصل خانقاہ کے ایک مولوی صاحب نے مولانا عبدالسلام صاحب کو سفارشی بنا کر اسے والد مرحوم سے حاصل کر لیا۔ میں جب ذرا بڑا ہوا اور مدرسۃ الاصلاح کے عربی درجات میں پہنچا اور دادا کی کتابوں کو الٹنے پلٹنے اور کچھ پڑھنے کے قابل ہوا تو والد صاحب سے اس تاریخی نسخہ کے بارے میں پوچھا تو حسرت سے کہنے لگے کہ کیا کرتا بھائی عبدالسلام صاحب کی بات کو میں ٹال نہ سکا اور خانقاہ کے ایک مولوی صاحب کو دینا پڑ گیا۔ ایک مدت گزر چکی تھی میں نے خانقاہ کے مولوی صاحب کا پتہ لگانا چاہا لیکن نہ ان کا پتہ چلا اور نہ وہ نسخہ ملا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

میرے والد حاجی محمد عثمان صاحب بھی ایک متوسط درجہ کے اہل حدیث عالم تھے۔ حنبلی مسلک پر عمل کرتے۔ گاؤں کی جامع مسجد کے امام وخطیب تھے۔ گھر، خاندان اور گاؤں کے بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے ہر وقت فکر مند اور عملاً اس کے لیے کوشاں اور سرگرم رہتے۔ اپنے دروازے پر ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا جس میں خود اعزازی طور پر پڑھاتے۔ شام کو بعد مغرب تا عشاء جامع مسجد میں بڑے بوڑھوں کو قرآن ناظرہ پڑھاتے اور نماز کا طریقہ وغیرہ سکھاتے، نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ اس علاقے کی اصلاح اور تعلیم کی ترویج کے لیے سرگرم عمل رہتے۔ اسی سلسلے میں ایک بار گاؤں کے باہر تمام مواضعات کے درمیان ایک بڑے میدان میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس کی یہ بات ہے۔ شرکاء جلسہ کے پانی پینے کے لیے ایک کچا کنواں کھدوایا تھا۔ جہاں ڈول اور رسی اور چینی ایک بوری رکھی ہوئی تھی۔ والد مجھے اس کنویں پر خود لے کر گئے تھے۔ مجمع بڑا تھا۔

والد صاحب کی شدید خواہش تھی کی اس جلسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی شریک ہوں اور خطاب

فرمائیں۔ والد صاحب نے اپنی اس خواہش کا اظہار مولانا عبدالسلام صاحب سے کیا تو انہوں نے کہا کہ کوئی مشکل نہیں ہے میں مولوی امین کو لکھ دیتا ہوں وہ آجائیں گے۔ چنانچہ مولانا اصلاحیؒ آئے اور خطاب بھی فرمایا لیکن میں اپنی کم سنی کی وجہ سے مقررین کی ان تقریروں اور جلسہ کی کارروائیوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں ایک ہنڈ بل ملا جس میں اس دیار کے لوگوں سے اپیل کی گئی تھی کہ بلریا گنج کے اسلامیہ مکتب کو ایک عربی مدرسہ بنایا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہینڈ بل اسی جلسہ کے موقع پر چھپوایا گیا ہوگا۔ افسوس کہ والد مرحوم کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی۔ البتہ ان کے اس خواب کی تکمیل ان کے بیٹے (راقم الحروف) کی زندگی میں ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں باقاعدہ جامعۃ الفلاح قائم ہوا۔ تو اس کی تاسیس میں یہ ناچیز بھی شامل تھا اور اس کی تعمیر و ترقی اور خدمت میں زندگی کے پورے چالیس سال (از ۱۹۶۴ء تا ۲۰۰۴ء) صرف کیا۔ ارمان تھا کہ آخر دم تک خدمت قرآن کرتا رہوں گا لیکن ہائے افسوس ضابطہ ریٹائرمنٹ کا کہ میں مزید خدمت دین اور تعلیم القرآن سے محروم ہوگیا۔ آج تو میرا حال یہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا ہے کہ تعلیم قرآن سے محرومی پر میری آنکھیں نم نہ ہوجاتی ہوں اور دل سے آہ نہ نکلتی ہو۔

چچا محترم مولانا عبدالسلام ندویؒ کی شخصیت ہمارے خاندان کے لیے باعث صد افتخار تھی۔ مولانا دارالمصنفین کے زمانہ قیام کے دوران ہر جمعرات کو بالعموم تشریف لاتے اور شنبہ کی صبح کو دارالمصنفین واپس ہو جاتے۔ جب تشریف لاتے تو خاندان میں ایک رونق آجاتی اور ایک علمی چہل پہل ہوجاتی، عام دنوں میں بھی بیٹھک میں علمی گفتگوئیں ہوتی۔ اکثر علامہ اقبال و غالب کے اشعار موضوع سخن بنتے۔ ہمارے ایک چچا زاد بڑے بھائی محمد ابراہیم مرحوم تو اقبالیات کے اتنے شیدا تھے اور ان کا خط بھی اتنا عمدہ اور خوشنما تھا کہ انہوں نے علامہ اقبال کے تمام دواوین کے قلمی نسخے تیار کر ڈالے تھے۔ یہ نسخے اتنے دیدہ زیب تھے کہ بس دیکھتے رہ جایئے۔ مطبوعہ سے یہ قلمی نسخے کہیں زیادہ اچھے لگتے۔ ہمارے بڑے ابا (ابراہیم بھائی کے والد) کی فارسی خاندان کے دیگر افراد کی طرح بہت ہی اچھی تھی۔ میں جب مدرسۃ الاصلاح کے درجہ چہارم فارسی کا طالب علم تھا تو گھر پر مجھے بڑے ابا سے گلستان اور بوستاں میں بڑی مدد اور رہ نمائی ملتی۔ بڑے ابا اتنے ذہین، معاملہ فہم اور انصاف پرور تھے کہ گاؤں کے سارے چھوٹے بڑے معاملات یہیں اپنی بیٹھک میں حل کر دیتے۔ گاؤں کے یہی مکھیار ہتے، جب بھی گاؤں کے دو افراد کے درمیان کوئی بات پیدا ہوتی تو چوکیدار کے ذریعہ گاؤں میں اعلان کرا دیتے کہ آج شام پھاٹک (ہمارے احاطے اور بیٹھک) میں پنچایت ہوگی۔ لوگ اکٹھا ہوتے اور

بڑے ابا خوش اسلوبی سے معاملہ کا فیصلہ کرتے۔ اس وقت پنچایت میں بچوں اور نوجوانوں کے بولنے کا کیا سوال بڑے بوڑھے بھی ابا کی گفتگو بڑے احترام وادب کے ساتھ سنتے۔ فیصلے چونکہ انصاف پر مبنی ہوتے اس لیے فریقین اور دیگر حاضرین مطمئن اپنے گھروں کو جاتے۔ ہمارے گاؤں پر اللہ کی بڑی مہربانی تھی اور ہمارے بزرگوں کی نیکی، معاملہ فہمی اور انصاف پروری کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے گاؤں کے سارے مسائل گاؤں ہی میں حل ہوجاتے تھے۔ تھانہ کچہری کی بھی کبھی نوبت نہ آتی تھی۔ ہمارے تھانہ کندھرا پور پر ایک بار ایک نئے تھانیدار آئے تو انہوں نے کہا کہ میں علاؤالدین پٹی دیکھنا چاہتا ہوں وہاں کے لوگ کون لوگ ہیں کہ ۶۰، ۷۰ سال کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ وہاں سے تھانہ میں کوئی ایف، آئی، آر نہیں آئی۔

سوال۲: آپ کی تعلیم کہاں کہاں ہوئی؟ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح کے انتخاب کی کوئی خاص وجہ؟

جواب: میری تعلیم کا آغاز اس مدرسہ سے ہوا جسے والد مرحوم نے اپنے دروازہ پر قائم کیا تھا۔ جس میں گھر، خاندان اور گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو وہ اعزازی طور پر پڑھاتے تھے۔ اس مدرسہ کا رجسٹر داخلہ جو والد صاحب ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اب بھی محفوظ ہے۔ اس میں میرا اندراج اس ترتیب اور تفصیل کے ساتھ ہے:

نمبر داخلہ	نام طالب علم	باپ کا نام	تاریخ پیدائش سکونت
۳	محمد عبدالحسیب	محمد عثمان	۱۳۔۱۹۲۸/۸ء علاؤالدین پٹی

پیشہ	زبان	درجہ	تاریخ داخلہ
زمین داری	اردو	مبتدی	۱۔۱۹۳۶/۱ء

اس کے بعد والد نے میرا داخلہ بلریا گنج کے مکتب اسلامیہ جس میں درجہ ۳ تک تعلیم ہوتی تھی کرادیا جس میں مولوی محمد ادریس صاحب ہنگائی پور کے پڑھاتے تھے۔ یہ وہی محمد ادریس صاحب ہیں جو مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کے مڈل اسکول بلریا گنج میں کلاس فیلو تھے۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحیؒ نے تو مڈل پاس کرکے مدرسۃ الاصلاح کا رخ کیا لیکن محمد ادریس صاحب نارمل ٹیچر ٹریننگ حاصل کرکے بلریا گنج کے مکتب میں مدرس ہوگئے اور جامعہ کے ضابطہ ریٹائرمنٹ سے محفوظ رہ کر ہی اس سے جدا ہوئے۔ یہی پرانا مکتب مختلف منزلوں اور مرحلوں سے گزرتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں جامعۃ الفلاح بنا۔ ہاں تو میں نے وہاں سے درجہ تین پاس کیا۔ اثنائے

تعلیم والد صاحب کہتے رہتے کہ اس کے بعد تم کو میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجوں گا۔ یہ سن کر میں بہت خوش ہوتا تھا۔ میرے والد کو میری اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے بہت بے تابی تھی وہ چاہتے تھے کہ میرا لڑکا جلد دین کا عالم بن کر دین کی خدمت کرے۔ اس بیتابی میں انھی دنوں مجھے لے کر جیراجپور مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ کے پاس لے گئے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاذ تھے اور رشتے میں میرے ماموں ہوتے تھے، ان سے کہا کہ میں اپنے اس لڑکے کو آپ کے پاس دہلی پڑھنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے کہا کہ آپ کا یہ لڑکا ابھی چھوٹا ہے کچھ اور بڑا ہو جائے تو میرے ساتھ کر دیجیے گا۔ ایک روز اس طرح کی خواہش لے کر مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری کی خدمت میں مجھے لے کر حاضر ہوئے۔ واضح رہے کہ اعظم گڑھ میں تین شبلی پیدا ہوئے: مولانا شبلی فقیہ جیراجپوریؒ ندوۃ العلماء میں فقہ کے ماہر فن وممتاز استاذ اور زہد و ورع میں سلف کا نمونہ۔ دوسرے بندول کے علامہ شبلی نعمانی ؒ مورخ اسلام، تیسرے مولانا شبلی متکلم ندویؒ مدرسۃ الاصلاح کے علم کلام کے ممتاز استاذ، اس کے عظیم خادم اور محسن اور اس کے انتہائی شفیق اور مہربان مہتمم، اللہ کی رحمتیں ہوں ان عظیم شخصیات پر۔ مولانا شبلی فقیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کی بات کہی جو مولانا اسلمؒ نے کہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوشتۂ تقدیر میں میرے لیے مدرسۃ الاصلاح سے فیض یابی مقدر تھی۔ چنانچہ میں نہ جامعہ ملیہ دہلی جا سکا اور نہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اچھا ہی ہوا والد کو بھی مدرسۃ الاصلاح ہی بوجوہ پسند تھا اور میں بھی وہاں جانے کے لیے خوش اور منتظر اور بعد از داخلہ میں مدرسۃ الاصلاح کے انتخاب پر مطمئن اور ہر آنے والا دن اس اطمینان میں اضافہ کرتا رہا۔ ابھی شوال میں چند ماہ باقی تھے اتنے دنوں کے لیے والد نے مجھے بلریا گنج کے سرکاری پرائمری اسکول کے درجہ چہارم میں داخل کر دیا۔ جب شوال آیا تو والد مجھے اور بڑے بھائی عبدالفتاح (ولد محمد عیسیٰ) کو لے کر ۱۸/ نومبر ۱۹۳۶ء دوشنبہ کے دن مدرسۃ الاصلاح پہنچے۔ بڑے بھائی کو درجہ چہارم مکتب میں داخل کیا اور مجھے درجہ سوم مکتب میں، حالانکہ میں بھی چہارم کے لائق تھا۔ مدرسۃ الاصلاح کے مکتب کی دو سالہ تعلیم کی میں کتنی تحسین کروں کہ مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچا۔

مولانا اظہار الدین اصلاحیؒ سابق استاذ مدرسۃ الاصلاح کے والد محترم منشی محمد کاملؒ نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو کی چوتھی کتاب بڑی محنت سے پڑھائی اور ہم لوگوں میں اردو کی اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ جو آئندہ کے لیے اردو کتب کے مطالعہ کے لیے قابل اعتماد بنیاد بنی۔ درجہ چہارم میں مولانا نور الہدیٰ اصلاحیؒ فارسی کی ابتدائی کتابیں اور گلستاں بوستاں اپنے طلبہ کو اتنی محنت سے پڑھایا کہ ان کو فارسی کا لذت آشنا بنا دیا۔

سوال۳:   آپ کے زمانہ طالب علمی میں تعلیم وتربیت کا کیا ماحول تھا؟اس پر روشنی ڈالئے؟

جواب: تعلیم وتربیت کا ماحول اچھا ہی تھا۔ابتدا میں مولانا شبلی متکلم ندویؒ مدرسہ کے مہتمم تھے۔ مولانا شبلی بہت ہی قابل،تمام علوم کے ماہر اور علم کلام میں ممتاز اور طلبہ کے بے نہایت شفیق ومہربان استاذ تھے۔مولانا کی زیر نگرانی جید اساتذہ کی ایک ٹیم طلبہ کی تعلیم وتربیت میں مصروف خدمت رہتی۔میرا اپنا خیال ہے کہ مولانا کی نرم مزاجی اور طلبہ کے ساتھ رحم دلی کی وجہ سے نظم وڈسپلن میں کچھ ڈھیلا پن ضرور تھا،مگر علم کے شوقین اور محنتی طلبہ ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر محنت سے پڑھتے رہے اور کامیاب رہے اور جن کے اندر شوق اور محبت کی کمی رہی وہ بعد میں نظم وڈسپلن کی بہتری کے باوجود کماحقہ مستفید نہ ہوسکے۔خدا ہمارے ان تمام بزرگوں کی خدمت کو قبول فرمائے اور ہم تمام فیض یافتگان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سوال۴:   مولانا آپ نے کن اساتذہ سے کسب فیض کیا؟ ان میں سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے؟اور آپ کی پوشیدہ لیاقت وصلاحیت کو نکھارنے میں کس کا رول سب سے اہم رہا ہے؟

جواب: مدرسۃ الاصلاح میں میری طالب علمی کا زمانہ دس سال کو محیط ہے۔دوسال مکتب میں اور آٹھ سال عربی درجات میں مکتب میں منشی محمد کامل صاحب اور مولانا نورالہدیٰ اصلاحی سے بہت متاثر ہوا۔ عربی درجات (عربی اول تا عربی ہشتم)اس ہشت سالہ مدت میں متعدد اساتذہ کرام سے فیض یاب ہوا ہوں کس کس کا نام لوں اور کس کس کے فضل واحسان کا تذکرہ کروں۔ابتدا میں میرے اساتذہ مولانا ابوبکر اصلاحیؒ،مولانا داوٗد اکبر اصلاحیؒ،مولانا قمرالزماں اصلاحیؒ پھر آگے چل کر مولانا عبدالصمدؒ،مولانا اظہارالدین اصلاحیؒ،مولانا نبی احمدؒ،مولانا صدرالدین اصلاحیؒ،اور مولانا اختر احسن اصلاحیؒ۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ان تمام اساتذہ کرام کو جن کے فیض تعلیم وتربیت کی بدولت مجھے دین کا علم ملا اور میں کسی لائق ہوا اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔البتہ ان تمام اساتذہ کرام میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ سے بہت متاثر ہوا اور مستفید بھی۔عربی درجات میں پہنچنے کے بعد مجھے نحو وصرف اور عربی زبان وادب اور قرآن مجید وحدیث سے زیادہ تعلق خاطر رہا۔ فقہ ومنطق اور فلسفہ سے بس واجبی تعلق رہا۔خوش قسمتی سے میرے ادب وقرآن کے استاذ آغاز ہی سے مولانا فراہیؒ کے شاگرد رشید اور ان کے فکر کے جانشیں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ تھے۔اس طرح آغاز ہی سے میں مولانا فراہیؒ کے نام،ان کے فکر اور کام سے واقف اور آشنا ہوا اور یہ فکر میرے دل ودماغ میں پیوست ہوگئی۔

اتانی هوا ها قبل ان اعرف الهویٰ   فصادف قلبا فار غا فتمکنا

سوال۵: آپ کے رفقائے درس کون کون ہیں اوران میں سے کن لوگوں نے علمی ودعوتی میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے؟

جواب: فراغت کے وقت صرف چار یار رہ گئے تھے۔عربی اول میں تو ہم لوگ ۵۰،۵۵ ساتھی تھے، مگر ہر سال کچھ نہ کچھ تو کم ہوتے رہے تاآنکہ فراغت کے وقت صرف چار رہ گئے۔ یہ چار یہ ہیں: ڈاکٹر شرف الدین سنجری،نصیرالدین آروی اصلاحی، اکرام احمد اصلاحی سہریاوی اور یہ ناچیز۔احمد محمود کوثر اعظمی صرف ادب وقرآن کی گھنٹیوں میں شریک درس ہوجاتے تھے۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی محتاج تعارف نہیں،ان کے مقالات ہندوپاک کے رسالوں میں چھپتے رہے ہیں اور 'ذکر فراہی' لکھ کر انہوں نے بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔اصلاحی برادری کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔علمی حلقوں اور مولانا فراہیؒ کے قدردانوں نے موصوف کو اس خدمت پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کاش وہ جلد 'فکر فراہیؒ' بھی مرتب کردیتے تو تمام معتقدین فراہی پر بڑا احسان ہوتا۔مولانا نصیرالدین آروی ماضی میں اصلاح اور دعوت وتبلیغ کا کام کرتے رہے۔ان دنوں اپنے ضلع آرہ میں ایک ادارہ کے ناظم کی حیثیت سے دینی اور علمی خدمت انجام دے رہے ہیں،مولانا اکرام احمد اصلاحیؒ نے تو مادر علمی میں عرصہ تک استاذ کی حیثیت سے کام کیا۔بعض دوسری جگہوں پر دینی خدمات انجام دیں آخر میں وطن میں آکر رہنے لگے تھے۔چند سال پہلے انتقال کرگئے۔

مولانا احمد محمود کوثر اعظمی کی دعوتی اورتحریکی خدمات قابل قدر ہیں۔رہا یہ ناچیز تو اس کے پاس کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔میں نے حضورﷺ کے ارشاد گرامی 'خیر کم من تعلم القرآن و علّمه' کو اپنی زندگی کا شعار اور نصب العین بنایا اور تدریس قرآن ہی کو دعوت دین کی اصل اور عظیم خدمت شمار کرکے اپنی پوری زندگی قریباً زائد پچاس سال اس راہ میں گزاری۔اے خدا! تو اپنے اس حقیر بندے کی ان کوششوں کو قبول فرمالے، میرے گناہوں کو بخشش دے اور جنت میں جگہ عطا فرما۔

سوال۶: مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد آپ کی کیا مصروفیت رہیں؟

جواب: مئی ۱۹۵۰ء میں، میں فارغ ہوا۔رمضان بعد شوال میں مدرسہ پر لوگوں سے ملاقات کے لیے گیا تو مولانا اختر احسن صاحبؒ نے کہا کہ بحیثیت مدرس یہاں کام کرو البتہ یہ مدرسی اس سال جز وقتی (۳ گھنٹی) ہوگی اور تنخواہ نصف، آئندہ سال سے مدرسی پوری ہوگی اور تنخواہ بھی پوری۔ پڑھانا شروع کردیا،عید

الاضحیٰ میں گھر آیا تو والدہ کو اپنے حالات کی بنا پر یہ جز وقتی مدرسی پسند نہ آئی والد کا تو چند سال پہلے انتقال ہو چکا تھا واپسی پر جب مولانا مرحوم کو یہ تفصیلات معلوم ہوئیں تو انہوں نے کہا کہ سر دست تم کو کوئی دوسری جگہ مل جائے تو چلے جاؤ۔ مولانا نورالہدیٰ صاحب نے حسنین سید صاحب کو میرے بارے میں بتایا تو سید صاحب نے ۱۹۵۱ء میں مجھے بذریعہ ٹیلی گرام منی آرڈر کرایہ کے لیے روپے بھیج کر فوراً دربھنگہ بلایا۔ درس گاہ کا افتتاح نہیں ہوا تھا۔ آب و ہوا کے راس نہ آنے کی وجہ سے میں تین چار ہفتہ کے بعد واپس آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا ابواللیث اصلاحیؒ نے مجھے مرکز رامپور بلالیا کہ درس گاہ میں ضرورت پڑنے پر تمہیں رکھ لیا جائے گا۔ اس اثنا میں شہر علی گڑھ سے رفقا نے کسی ایسے شخص کے لیے لکھا جو ابتدائی درس گاہ میں پڑھائے بھی، خطبہ جمعہ بھی دے سکے اور دیگر اوقات میں دعوتی اور تحریکی کام کرے۔ مولانا نے مجھے وہاں بھیج دیا اور میں وہاں تین سال رہا۔ درمیان میں استاذ محترم مولانا اختر احسن رحمۃ اللہ علیہ کا خط ملا کہ یہاں عربی درجات میں ایک استاذ کی ضرورت ہے تم آسکتے ہو تو آجاؤ۔ کسی مجبوری سے مجھے معذرت کرنی پڑی۔ تیسرے سال کے آخر میں غالباً ۱۹۵۵ء کا آغاز تھا۔ مولانا مرحوم نے دوبارہ یاد فرمایا۔ اس پر میں فوراً تیار ہو گیا اور مادر علمی کی خدمت کے لیے مدرسہ حاضر ہو گیا۔

سوال ۷: آپ غالباً مدرسۃ الاصلاح میں استاد رہ چکے ہیں۔ اس وقت آپ کے زیر درس کون کون سی کتابیں تھیں؟

جواب: ابتدا میں مجھے مولانا نے مبادی القراۃ الرشیدہ، کلیلہ دمنہ اور درجہ سوم و چہارم کے قرآن کی گھنٹیاں پڑھانے کو دیں۔ دوسرے یا تیسرے سال سے درجہ چہارم کی دول العرب والاسلام، دیوان الحماسہ باب الادب والمراثی، درجہ پنجم کے ادب (جمہرۃ خطب العرب) اور ششم کے ادب کی گھنٹی مقدمہ ابن خلدون پڑھانے کو دی اور قرآن وہی سوم اور چہارم کا۔ فرماتے دیوان الحماسہ اور جمہرہ کے مشکل الفاظ کے معانی لسان العرب سے مرتب کر ڈالئے۔ استاذ کی ہدایت پر میں نے یہ کام سال بھر محنت کر کے مکمل کر ڈالا۔ دول العرب پڑھاتے وقت علامہ آلوسی کی بلوغ الادب فی احوال العرب کو پیش نظر رکھنے کی بلکہ ایک دن کہنے لگے کہ اگر آپ بلوغ الادب کی تلخیص کر دیتے تو میں اسے دول العرب کی جگہ داخل نصاب کر دیتا۔ یہ چیز زیادہ بہتر اور قابل اعتماد ہوتی۔ دل میں سوچا کہ استاذ محترم کا یہ حسن ظن ایک طرف اور ناچیز کی بے بضاعتی و بے مائیگی ایک طرف کاش میں اس لائق ہوتا اور استاذ محترم کی خواہش پوری ہو سکتی، قصہ مختصر یہ کام میں نہ کر سکا۔ بعد میں مجھے

بہت افسوس ہوا کہ کاش میں نے ٹیڑھے سیدھے کچھ کر دیا ہوتا تو استاذ کی نظر ثانی اور اصلاح کے بعد ایک کام کی چیز تیار ہوگئی ہوتی، مگر خدا کو منظور نہ تھا۔

سوال ۸: تصنیف وتالیف اور مضمون نویسی سے بھی آپ کو دلچسپی رہی ہے، اس طرح کی دلچسپی مدرسۃ الاصلاح کے زمانہ طالب علمی ہی سے رہی؟ اور اس کا محرک کیا تھا؟

جواب: مجھے زمانہ طالب علمی میں شروع ہی سے عربی بولنے اور لکھنے کا شوق تھا اور اپنے طور سے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ اس وقت اس کی مشق وتمرین اور تربیت کا معقول انتظام نہ تھا۔ فراغت کے بعد میں اپنی اس صلاحیت سے فکر فراہی کی خدمت واشاعت کا کچھ کام کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے مولانا فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے کیے، تاکہ اہل عرب بھی ان سے واقف اور مستفید ہو سکیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مرحوم نے مجھے اپنی جملہ کتابوں کے ترجمہ کی اجازت عنایت فرمائی تھی اور بعض چیزوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار بھی فرمایا اور دعاؤں سے بھی نوازا (دیکھیے 'تدبر' لاہور مکاتیب اصلاحی نمبر) مولانا اصلاحی کی تصانیف فکر فراہی کی شرح وتفصیل ہیں اور ان کی ہر کتاب کی بنیاد قرآن مجید پر ہے اور اسی سے مستنبط ہے۔

سوال ۹: آپ کے مضامین کن کن رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے مضمون نویسی کے آداب کس سے سیکھے؟ اور کس سے اصلاح لیتے رہے ہیں؟

جواب: میں نے صرف چند مضامین لکھے جو 'الانصاف' الہ آباد، 'حیات نو' حیدرآباد اور 'دعوت' دہلی میں چھپے۔ کچھ ترجمے عربی سے اردو میں 'دعوت' دہلی اور 'ایشیا' لاہور میں شائع ہوئے۔ اردو سے عربی میں ترجمے 'الدعوۃ' دہلی، المجتمع، کویت، اور 'صحیفہ مکۃ المکرّمۃ' میں شائع ہوئے۔ المجتمع میں 'احکام الحجاب فی القرآن' کے نام مولانا اصلاحی مرحوم کا رسالہ 'پردہ اور قرآن مجید' کا ترجمہ شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔ رسالہ کی شکل میں جب الاصلاح سے شائع ہوا تو میں نے بحرین، مکہ اور مدینہ منورہ کے بعض مکتبات کو اس کے نسخے بھجوائے اور جلد ہی تمام نسخے نکل گئے۔ صحیفہ 'قریش' مکہ مکرمہ میں مضمون 'حکمۃ السعی والرمی فی الحج' کے عنوان سے مئی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون میرا کیا تھا وہ تو مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے طویل اقتباسات اور میری تمہید اور خاتمہ پر مشتمل تھا۔ ہوا یہ کہ جب ۱۹۶۱ء میں میں حج کو جانے لگا تو اپنے ساتھ یہ مضمون مرتب کر کے لے گیا تھا کیوں کہ سفر کی تیاری کے دوران مناسک حج سے متعلق جب مباحث پڑھے تو اس کا شدت سے

احساس ہوا کہ مولانا فراہی کی توجیہات کو شائع کرنا چاہیے۔ مکہ پہنچنے پر جریدۃ الندوۃ یومیہ مکہ میں اشتہار دیکھا کہ 'صحیفہ قریش اسبوعیہ' کا حج کے موقع پر عدد خاص عن الحج (حج نمبر) شائع ہونے جا رہا ہے۔ مضمون لے کر 'قریش' کے دفتر پہنچ کر اس کے رئیس التحریر الاستاذ احمد سباعی سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر تک مضمون کو ادھر ادھر سے دیکھا اور کہا کہ مضمون حج نمبر میں شائع ہوگا۔ حج نمبر سے پہلے عام شمارے میں پہلے صفحہ پر یہ خبر بھی شائع کر دی کہ حج نمبر میں ایک ہندوستانی عالم کا 'حکمۃ سعی ورمی جمر' کے متعلق ایک اہم مضمون آ رہا ہے۔ نمبر شائع ہوا اور مضمون بھی۔ خوشی ہوئی۔ حج کے بعد کے ایک عام شمارے میں ایک صاحب کی تنقید بھی آ گئی جس کا عنوان تعقیب علی مقال عبدالحسیب، ھذا خلاف العقل والمنقول تھا، سباعی صاحب سے ملنے گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ اس کا جواب لکھیں گے؟ تو میں نے کہا ذرا رکیے اور تنقیدیں آنے دیجیے اور یہ شمارے آپ بھجوا دیں۔ پھر ان سب کو سامنے رکھ کر جواب بھیج دوں گا انشاء اللہ۔ لیکن پتہ نہ چل سکا کہ کتنے اشخاص نے تنقید کے تیر برسائے اور کتنے لوگوں نے تائید کی۔ مکہ سے واپسی پر جدہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی سابق معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء سے ملاقات ہوئی، ان دنوں وہ جدہ ریڈیو سے وابستہ تھے، انہوں نے مضمون کی اشاعت پر پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اس سے یہاں لوگ واقف نہ تھے۔

سوال ۱۰: متعدد علماء کرام سے آپ کے روابط رہے ہیں کیا؟ ان کے کچھ خطوط یا تحریری دستاویزات آپ کے پاس ہیں؟

جواب: متعدد علمائے کرام سے شرف ملاقات تو حاصل ہوا لیکن ان کے خطوط وغیرہ میرے پاس نہیں، البتہ بعض اصحاب سے ملاقاتوں کی کچھ یادوں کو نقل کرنا آپ کے لیے باعث دلچسپی ہوگا۔

علامہ محمد مبارک (شام) کے ایک جید عالم تھے۔ انہیں مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ عصر کہیں سے مل گئی تھی اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ صبر کی جو تحقیق مجھے یہاں ملی وہ کہیں اور نہیں ملی۔ ان سے جب میری ملاقات ہوئی اور تعارف میں جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میرا تعلق ہندوستان سے ہے تو انہوں نے مولانا فراہیؒ کے بارے میں فرمایا: لم أر رجلا عبقریا مثلہ میں نے ان جیسی عبقری شخصیت نہیں دیکھی۔ ''موسسہ دار القرآن الکریم کویت کے مدیر الشیخ عیسیٰ ماجد شاہین کو مولانا فراہی کی کتابیں دکھائیں تو انہوں نے بہت پسند کیا اور امعان فی اقسام القرآن کو شائع کیا اور الرای الصحیح فی من ھو الذبیح کو شائع کرنا ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ مکتبہ 'فدا مکہ مکرمہ' کے مالک کو ۱۹۶۱ء میں مولانا مرحوم کے موجود اجزا تفسیر دکھائے تو انہوں نے انہیں

بہت پسند کیا اور ان کو شائع کرنے کی اجازت چاہی، میں نے انہیں مولانا بدرالدین اصلاحیؒ سے اجازت لینے کا مشورہ دیا۔

سوال۱۱: آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس ہی میں گزرا ہے۔ آپ بحیثیت استاذ طلبہ کو کس طرح دیکھنا چاہتے ہیں؟

جواب: طلبہ پورے اخلاص کے ساتھ علم دین کے حصول میں منہمک رہیں، مطالعہ ومحنت کو اپنا شعار بنائیں، اپنے اساتذہ کرام کے قدر شناس اور ان کا پورا احترام کریں۔ نظام مدرسہ کا کما حقہ احترام اور اس کا پورا التزام کریں۔ تو مدرسہ کامیاب ہے ورنہ سب لا حاصل بے کار۔

سوال۱۲: مولانا آپ مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح میں مدتوں تفسیر کے استاذ رہے۔ تفاسیر میں کون سی تفسیریں آپ کے نزدیک بہتر ہیں اور کیوں؟

جواب: تفسیروں کی تلاش میں آپ کیوں پڑے۔ پہلے آپ خود زیر مطالعہ سورہ کو بار بار پڑھیں اور اس پر غور کریں۔ مشکل الفاظ ومعانی لسان العرب وغیرہ سے نکالنے کی کوشش کریں، آیات کا سیاق وسباق اور سورہ کا مجموعی نظام اور آیات کے نظائر کو پیش نظر رکھ کر خود غور کریں۔ یہ آپ کے لیے سب سے بہتر بات ہوگی۔ آخر میں آپ چاہیں تو تفسیر کشاف اور تفسیر ابن کثیر کی طرف رجوع کرلیں۔

سوال۱۳: متعدد مدارس کے فضلا وفارغین کا کہنا ہے کہ حدیث وفقہ سے فارغین مدرسۃ الاسلاح کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ان کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب: چند افراد کے سلسلے میں یہ کہنا کسی حد تک درست ہوسکتا ہے لیکن عام طور سے نہیں۔

س۱۴: مدرسۃ الاصلاح پر آپ کے زمانہ طالب علمی کا کوئی خاص واقعہ جس سے ہم طلبہ کو کوئی سبق ملتا ہو۔ برائے مہربانی اس کو بیان فرمائیے؟

ج: میں جب درجہ سوم عربی میں تھا۔ سالانہ امتحان کے دنوں میں میرے ایک پیر میں زخم ہوگیا۔ سخت تکلیف میں تھا۔ مولانا شبلی متکلم ندویؒ مہتمم مدرسہ نے از راہ شفقت گھر آنے کی اجازت دے دی۔ رمضان کے بعد جب مدرسہ پہنچا تو مہتمم صاحب نے فرمایا کہ درجہ چہارم میں جانے کے لیے یا تو تم امتحان دو یا اگر تمہارے گزشتہ سال کے اساتذہ اطمینان ظاہر کردیں تو بغیر امتحان کے۔ میں نے درخواست لکھی اور اپنے اساتذہ کے پاس گیا۔ سب سے پہلے میں مولانا اختر احسن صاحبؒ کے پاس گیا۔ انہوں نے سال گزشتہ کلیلہ

دمنہ بڑی محنت سے پڑھایا تھا، انہوں نے پورا اطمینان ظاہر فرمایا۔ پھر کیا تھا سب نے تصدیق فرمادی اس طرح میں بغیر امتحان دیے اگلے درجہ میں پہنچ گیا۔

درجہ ہشتم عربی میں جمہرۃ اشعار العرب کی گھنٹی تھی مولانا اختر احسن اصلاحیؒ نے ہم میں سے ہر ایک سے باری باری سبق پڑھنے کو کہا۔ ہر ایک نے مطالعہ نہ کر سکنے کا عذر کیا تو مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگ درجہ سے تشریف لے جائیں، ہم لوگ شرمندہ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ مولانا نے دوبارہ فرمایا کہ آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ میں بغیر مطالعہ سبق نہیں پڑھاتا ہوں۔ ہم لوگ شرمندہ وافسردہ کچھ دیر بیٹھے رہے تو مولانا نے فرمایا: اچھا آپ لوگ گھنٹی بھر یہیں مطالعہ کیجیے سبق کل ہوگا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا کے نزدیک طلبہ کے لیے مطالعہ کی کتنی اہمیت تھی اور اس سلسلے میں وہ کسی طرح کی کوئی رعایت نہیں فرماتے تھے، چاہے بات درجہ فراغت کے طلبہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ مدرسۃ الاصلاح سے دارالسلام پٹھان کوٹ تشریف لے جانے کے بعد درمیان میں ایک بار مدرسہ پر تشریف لائے، تقریباً ایک ہفتہ قیام فرمایا۔ مسجد میں سورۂ فاتحہ کا درس دیا جو ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ مولانا اختر احسن صاحبؒ، تمام اساتذہ اور بڑے طلبہ شریک رہتے۔ میں نے اس درس کے اشارات لکھ لیے تھے۔ اس موقع پر ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آدھ پون گھنٹہ تک مولانا کے پاس رہا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ مولانا آپ ہم طلبہ مدرسہ کو چھوڑ کر پٹھان کوٹ تشریف لے گئے۔ ہم لوگوں کو اس کا بہت غم ہے۔ مولانا نے فرمایا: ایک میرے چلے جانے سے کیا ہوا۔ تمام اساتذہ کرام موجود ہیں۔ تم طلبہ ان کے قدر شناس بنو اور ان سے زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرو۔ دیکھو! طالب علم کی مثال گداگر کی ہے۔ جس طرح ایک گداگر اپنا کشکول گدائی لیے ہر در پر حاضری دیتا ہے اور جہاں سے ملتا ہے اس کو بخوشی اپنے کشکول میں لے لیتا ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم ہر استاذ سے جتنا فیض یاب ہوسکتا ہو اس کو چاہیے کہ اس سے فیض یاب ہو۔

میں نے پوچھا کہ درسیات کے بعد اردو مطالعہ میں ہم لوگوں کو کس طرح کی کتابوں کو پڑھنا چاہیے؟ فرمایا کہ ٹھوس علمی کتابیں پڑھنا، ناول اور افسانے کے قریب نہ جانا کہ اس سے سوقیانہ ادب آتا ہے۔ کچھ اس طرح کی نصیحت مولانا اختر احسنؒ نے بھی ایک موقع پر فرمائی تھی۔

سوال ۱۵: - آپ جماعت اسلامی سے کیوں وابستہ ہوئے جب کہ اس کے علاوہ اور بھی تنظیمیں اور

جماعتیں ہیں جو قرآن وسنت کی روشنی میں مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں؟

جواب:- فراغت (مئی ۱۹۵۰ء) ایک آدھ سال پہلے ہی جماعت سے وابستہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کہ جماعت اسلامی اسلام کو ایک نظام حیات کی حیثیت سے پیش کر رہی ہے جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے اور اس کی طرف دعوت دے رہی ہے اس لئے میں اس میں شامل ہوا تھا۔

سوال ۱۶: سنا ہے مولانا مودودیؒ سے آپ کے نیاز مندانہ تعلقات رہے ہیں۔ اس کے متعلق کچھ بیان فرمائیں؟

جواب: مولانا مودودی سے نہ کبھی ملاقات ہوئی اور نہ دید وشنید۔ ۱۹۶۰ء کے آخر میں میں نے مولانا کو ایک خط لکھا تھا کہ اپریل ۱۹۶۱ء میں میرا ارادہ سفر حج پر جانے کا ہے، براہ کرم آپ مکہ و مدینہ کے چند ایسے اشخاص کے نام لکھ دیتے جن سے وہاں مقامات مقدسہ کی زیارت میں مجھے سہولت ہوتی۔ مولانا نے جواب سے سرفراز فرمایا اور تین افراد کے نام لکھے۔ خط ملک غلام علی صاحب کے قلم سے لکھا تھا البتہ اس پر مولانا مودودیؒ کا دستخط ثبت تھا۔

سوال ۱۷: کیا موجودہ دور میں جماعت اسلامی کی کارگردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: جماعت کی کارگردگی قابل اطمینان ہے یا نہیں، اس کے بارے میں ذمہ داران جماعت بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔

سوال ۱۸: اس وقت کچھ غیر مسلم اہل قلم اسلام کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ کی شبیہ بھی بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حال ہی میں جناب رسالت مآبؐ کا توہین آمیز کارٹون شائع کر کے اسلام کی تعلیمات کا مذاق بنانے کی کوشش کی گئی ہے ایسی نازک صورتِ حال میں مسلمانوں کو کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں؟

جواب: نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی جسارت ہر دور میں اشقیانے کی ہے۔ مسلمان صبر سے کام لیں۔ آپ کی تعلیمات پر پورے طور سے عمل کریں اور آپؐ کی تعلیمات کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائیں۔ ان مثبت تدابیر کے ساتھ پرامن طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ البتہ جلسہ جلوس اور کسی طرح کی ہنگامہ آرائی نہ مناسب ہے اور نہ مفید۔

سوال ۱۹: الیکشن کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی پالیسی دوسری تھی اور اب دوسری۔ اس سلسلے میں آپ کیا کا خیال ہے؟

جواب: الیکشن کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی پالیسی پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے اس کی وضاحت ذمہ داران جماعت کی طرف سے ہوتی رہتی ہے۔ہم تو اس کے پابند ہیں۔ ویسے میری ذاتی رائے ہے کہ جماعت اپنا سارا زور دعوت اور اصلاح معاشرہ ہی میں صرف کرتی تو اس کے حق میں بہتر ہوتا۔الیکشن کے چکر میں پڑنا میرے خیال میں بلاضرورت بھی ہے اور قبل از وقت بھی، بلکہ کار دعوت کے لیے ضرر رساں بھی۔

سوال۲۰: اخیر میں ہم طلبہ مدرسۃ الاصلاح کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: مدرسۃ الاصلاح کا مدارس میں جو امتیاز ہے اور ہند ہی نہیں عالم اسلام میں اس کا جو درجہ اور مقام ہے۔خوش نصیب ہیں آپ کہ ایک ایسی ممتاز اور عظیم درس گاہ کی آغوش تعلیم وتربیت میں آپ پل رہے ہیں۔کتنے مبارک ہیں آپ کے یہ ایام اور کتنا زریں ہے یہ موقع جو آپ کو اس وقت میسر ہے۔کبھی ہمیں بھی یہ دن نصیب تھے یالیت تلک الایام رواج

خدارا آپ اپنے اوقات کی قدر کریں اور اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔خدا آپ کو اس کی توفیق دے اور تیسیر فرمائے۔خادم کے لیے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں میں آپ اعزہ کا از حد ممنون ہوں گا۔

(بشکریہ سہ ماہی دعوت القران، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۶)

پیغام

مولانا عبدالحسیب اصلاحی

عزیز طلبہ!

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیوں کے تحت عمل میں آنے والی اپنی تحریری کاوشوں کے منتخبات پر مشتمل سالانہ میگزین 'الفلاح' کی اشاعت کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور عنقریب وہ منصۂ شہود پر آنے والا ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ کی کوششوں میں کامیابی عطا فرمائے اور پیش نظر میگزین ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مرصع ہوکر اس طرح سامنے آئے کہ ایک طرف وہ آپ کے حسن سلیقہ اور ذوق سلیم کا مکمل طور پر غماز ہو اور دوسری طرف آپ کی صلاحیتوں اور تحریری سرگرمیوں کی بھرپور نمائندگی کر سکے۔

عزیز طلبہ!

اس موقع پر میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک ایسی ملت کے نونہال اور اس کے مستقبل کے امین ہیں، جو دنیا میں دعوت الی اللہ، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے عظیم اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز کی گئی ہے۔ جسے امم سابقہ میں سے منتخب کر کے امت وسط قرار دیا گیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی گراں بار ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی۔ جس کے علماء کو انبیاء کا وارث اور انبیاء بنی اسرائیل کے مثل ٹھہرایا گیا۔

آپ اس امت کے نمائندہ اور اس کے اوپر عائد شدہ اقامت دین کے اجتماعی فریضہ کی ادائیگی کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ آپ فرمان خداوندی (آل عمران:۱۰۴) ''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیے جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے'' کی مجسم تعمیل اور ارشاد الٰہی (التوبہ:۱۲۲) ''یہ کچھ ضروری تو نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے

نکل کھڑے ہوتے۔مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبر دار کرتے، تاکہ وہ غیر مسلمانہ روش سے پرہیز کرتے'' کی سراپا تصویر ہیں۔آپ لب رسالت مآب پر مچلتی ہوئی دعا: نضر الله امرء سمع منا شيأ فبلغه كما سمعه فرب مبلغ اوعىٰ من سامع ۔(ترمذی عن ابن مسعود) اللہ تعالیٰ اس شخص کو شگفتہ اور خوش وخرم رکھے جو ہم سے دین کی کوئی بات سنے اور اس کو بعینہ دوسروں تک پہنچا دے۔کیوں کہ بہت سے لوگ جن کے پاس بات پہنچائی جائے اسے پہنچائی جائے اسے پہنچانے والے سے بہتر طور پر اس کو سمجھتے اور یاد رکھتے ہیں'' کے حقیقی مستحق ہیں۔

اس امت کو شرف وفضیلت کا یہ مقام بلند عنداللہ اس کی مسؤلیت اور ذمہ داری کی وجہ سے عطا کیا گیا ہے۔اس امت کے افراد ہونے کے ناتے اگر آپ خود کو اس مقام کا مستحق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو وہ ذمے داریاں بھی لازماً ادا کرنی پڑیں گی جن کی ادائیگی پر اس کو مامور کیا گیا ہے۔اسلاف کے مقام ومرتبہ کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو اپنے اندر ان کے وہ اوصاف ضرور پیدا کرنے ہوں گے جن کی بنا پر انہیں وہ مقام عطا کیا گیا

شمشیر پدر خواہی باز وئے پدر آور

خوش قسمتی سے آپ کا تعلیمی وتربیتی تعلق ایک ایسے ادارے کے ساتھ قائم واستوار ہوا ہے، جس کا مقصد قیام روز اول ہی سے یہی رہا ہے کہ یہاں ایسے افراد تیار کیے جائیں جو آئندہ چل کر اقامت دین اور شہادت حق کی ذمہ داری باحسن طریق اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔اگر آپ اس کے نظام تعلیم وتربیت سے کما حقہ استفادہ کر سکیں تو یقیناً آپ اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پورے طور پر تیار کر لیں گے۔جمعیۃ الطلبہ کے تحت انجام پانے والے مختلف پروگرام جو آپ کے ذریعہ زیر عمل آتے ہیں۔ان کی ترتیب میں اس مقصد کے لیے تیاری خاص اور اہم مقام رکھتی ہے۔اس پروگرام کا ایک خاص جز وہ ہے جس کے تحت آپ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے قلم کو ذریعہ بناتے ہیں، مختلف عنوانات پر مقالات اور مضامین لکھتے ہیں، اپنے صاف ستھرے خیالات، پاکیزہ جذبات اور قیمتی احساسات کو الفاظ کی زبان دے کر انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔اپنی تحریروں کو ترسیل خیالات، تبلیغ نظریات اور تبیین محسوسات کا وسیلہ بناتے ہیں۔ان تمام کوششوں اور سرگرمیوں کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ میدان جہد وعمل میں

اترنے سے پہلے خودکوان صلاحیتوں اورضروری قابلیتوں سے اچھی طرح آراستہ کرلیں جواس مقصد کی تکمیل کے لیے لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آپ قلم کی طاقت اورتحریر کی اثرانگیزی کی قوت سے ناواقف نہیں ہیں۔آپ اس بات کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ادب وصحافت اورتصنیف وتالیف،خیالات ونظریات کی توسیع واشاعت میں کتنا اہم رول ادا کرتے ہیں اوران کوذریعہ بنا کرکس طرح فکری انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے اوراس انقلاب کے نتیجے میں کس طرح صالح بنیادوں پرفرد کی اصلاح،معاشرہ کی تعمیراورریاست کی تشکیل عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

ان تحریری پروگراموں میں ذوق وشوق اورخوش دلی اوردل چسپی کے ساتھ بڑھ چڑھ کرحصہ لینا آپ کے مقصد حیات کے حصول کے لیے نہایت ضروری اورمفید ہوگا۔اس کے ذریعہ آپ کی ان مخفی اور پوشیدہ صلاحیتوں کوابھرنے اورنمایاں ہونے کا موقع ملے گا جن سے آپ بےخبراورناواقف ہیں۔کس کوعلم ہے کہ آپ کے اندر کتنے ارباب تصنیف وتالیف اورادیب وصحافی چھپے ہوئے ہیں جن کواگراپنی ان مخفی صلاحیتوں کو ظاہراوراپنے اندر چھپے ہوئے جوہرکونشوونمادینے اوران کے اظہار کے لیے مناسب اوربہترموقع مل جائے تو وہ مستقبل کے مودودیؒ اوراپنے وقت کے سید قطبؒ بن سکتے ہیں۔تطہیر خیالات اورتبلیغ نظریات کے محاذ پر نمایاں کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔تحریک اقامت دین کے کارکنوں کوزبردست فکری غذافراہم کرسکتے ہیں اوراپنی بے باک تحریروں سے باطل نظریات کے پرخچے اڑاسکتے ہیں۔لیکن اگرانہوں نے ان قوتوں اور صلاحیتوں کوابھرنے اورپروان چڑھنے کا موقع نہ فراہم کیا تووہ اسی طرح ضائع ہوجائیں گے،جس طرح کوئی شمشیرآب دارمٹی میں دفن کردی جائے تومٹی ہوجاتی ہے اور خدانخواستہ اگرایسا ہواتو یہ قوم وملت کا ایک زبردست اورناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

خدائے تعالیٰ آپ کواپنی تحریری صلاحیتوں کواجاگرکرنے،اپنے حصے کی ذمہ داریاں اداکرنے اورملت کی وہ توقعات پوری کرنے کی توفیق بخشے،جواس نے آپ کی ذات سے وابستہ کررکھی ہیں۔میری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔(ماخوذ از جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کا سالانہ میگزین ’الفلاح‘ ۱۹۸۷)

استقبالیہ کلمات

آپ کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے میری آنکھیں بھر آئیں

مولانا عبدالحسیب اصلاحی

حضرات اساتذہ کرام، مہمانانِ گرامی اور قدیم و جدید طلبہ!

میں اپنی جانب سے، اپنے رفقائے کار کی جانب سے، آپ کی اس مادرِ علمی کی جانب سے آپ طلبۂ قدیم کو اس کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

جامعہ کی زندگی میں صبحیں بہت سی آئیں، شامیں بہت سے گزریں، اگر میں اس صبح کو صبحِ عید سے تعبیر کروں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ شام ہی سے جب آپ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک اٹھے ہیں، آوازیں رندھتی گئی ہیں۔ اور یہ خوشی کوئی مصنوعی خوشی نہ تھی فطری تھی اور جذباتی بھی تھی۔ ایک ایسا ماحول، ایک ایسا ادارہ جہاں آپ نے زندگی کے قیمتی ایام گزارے ہیں، جہاں آپ نے کئی سال صرف کیے ہیں اور پھر بعد از فراغت کوئی زیادہ دنوں سے اور کوئی کچھ دنوں سے اپنے اپنے ماحول میں اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے۔ جب ان سے بات چیت کا موقع ملا ہے تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو کا چھلکنا ایک فطری بات ہے۔ آپ نے یہ کنونشن منعقد کر کے، آپ کا یہاں اکٹھا ہو جانا، آپ کو دیکھ کر آنکھوں کا روشن ہونا، دلوں کا شاد ہونا یہ ایک ایسا موقع ہمارے لیے نصیب ہو گیا ہے جس پر میں دلی اظہار مسرت کرتا ہوں اور آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ خوشی بالکل فطری ہے ویسے ہی جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو مدت دراز کے بعد دیکھے۔ ایک ادارہ اپنے نونہال فارغین کو ایک عرصہ کے بعد دیکھے، ایک ادارہ اپنی کاوشوں کو، اپنے ثمرات کو اپنی آنکھوں سے دوبارہ دیکھے، بالکل یہ خوشی ویسی خوشی ہے۔

جہاں یہ کنونشن اپنے دامن میں ہزار خوشیاں لے کر آیا ہے، جہاں یہ صبح جامعہ صبح عید بن کر طلوع ہوئی ہے، جہاں ہمارے لیے ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں وہیں غم بھی پیچھے سے دستک دیتا آتا ہے۔

میرا اشارہ استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندوی کی وفات کی طرف ہے، جن کی قابلیت کا، جن کی بزرگانہ حیثیت کا، جن کی پدرانہ شفقت کا، جن کی عالمانہ مہارت کا سبھی کو اعتراف ہے۔ مگر قدرت کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت سب پر حاوی ہوتی ہے۔ استاذ محترم کا سانحۂ ارتحال ہماری زندگی کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ اور جامعہ کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مگر راضی برضائے مولیٰ، اللہ موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دوسری طرف ہمارے محترم ساتھی جو روزِ اول سے اس کی تعمیر وترقی میں لگے رہے، جن کی رات دن کی محنتیں اس کی ترقی میں برابر نظر آتی ہیں۔ میرا اشارہ رفیق محترم مولانا شبیر احمد اصلاحی کی طرف ہے کہ وہ کچھ نادانوں کی نادانی کا شکار ہو کر کے بہت حد تک مجبور سے ہو گئے ہیں۔ جامعہ کی خدمت سے، باوجود خواہش کے، وہ معذور سے ہو گئے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اب وہ روبصحت ہیں۔ کبھی کبھی آ کر درجات میں بیٹھتے بھی ہیں۔ اپنے درس سے طلبہ کو مستفید بھی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔

حضرات! کنونشن اس دور کا ایک فیشن ہے۔ کنونشن ہوتے رہتے ہیں۔ اگر اس کو فیشن کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن اس کے علی الرغم یہ ایک ضرورت بھی ہے، اس کی اہمیت بھی ہے، اس کی افادیت بھی ہے۔ آپ حضرات بعد از فراغت اپنے اپنے حلقوں میں گئے، اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق اپنے اپنے حلقوں میں کام کرتے رہے، پھر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ پراگندگی کا شکار ہو گئے ہوں، آپ نے اپنے آپ کو بشکل انجمن منظم کیا اور بشکل کنونشن اپنے کو مجتمع کیا، ایسا ہونا بھی چاہیے تھا، یہ اس ادارہ کا عین تقاضا تھا، اس کے مطلوبہ مقاصد کے لیے یہ سب سے کامیاب طریقہ ہے۔ یہ ادارہ جیسے علماء فضلاء تیار کرنا چاہتا ہے، جیسے علماء پیدا کرنا چاہتا ہے، جیسے خدام دین جیسے تحریکِ اسلامی کے افراد تیار کرنا چاہتا ہے ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ یہاں کے فارغین، یہاں سے فارغ ہو کر کان نمک میں جا کر نمک نہ ہو جائیں، بلکہ جہاں بھی جائیں وہ اپنی روشنی جو انھوں نے یہاں سے حاصل کی ہے، چند سالوں میں جو کسب فیض کیا ہے، جو علم کتاب حاصل کیا ہے، جو معارفِ دین حاصل کیے ہیں، اس سے دنیا کو مستفید کریں اور پھر اپنے تجربات لیے ہوئے اپنے مسائل لیے ہوئے یا اپنی ناکامیوں اور پریشانیوں کو لیے ہوئے کبھی کبھی یہاں اکٹھا ہو جایا کریں، سر جوڑ کر بیٹھا کریں اور ان پر غور کریں اور ان کے ازالے کی اور اپنے کام کو بیش از بیش آگے بڑھانے کی فکر کریں، اگر دیکھا جائے تو اس پہلو سے یہ کنونشن ایک عین ضرورت بن جاتا ہے۔ یہ فیشن نہیں رہ جاتا ہے

بلکہ یہ بہت اہم تقاضا بن جاتا ہے اور اسی لیے اس کے انعقاد پر ہمیں دلی مسرت ہے۔ یہ آپ کا دوسرا کنونشن ہے، اس کے بعد اور بھی کنونشن آئیں گے، آتے رہیں گے کامیاب سے کامیاب تر ہوتے رہیں۔ اس بار آئے ہیں اور دو سال کے وقفہ کے بعد یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، اس عرصہ میں جو کام آپ نے کیے ہوں گے، آپ نے جو علم یہاں سے حاصل کیا ہے، اپنی قوم کو، اپنے لوگوں کو، انسانیت کو اس سے فیض پہنچایا ہوگا۔ آپ کے نتائج آپ کی کاوشیں ہم سننے کے منتظر ہیں، اور ان کو شوق سے سنیں گے، آپ کی مشکلات بھی سامنے آئیں گی، اس سلسلے میں ہوسکتا ہے کہ کچھ ہماری کوتاہیوں کا دخل رہا ہو، ہوسکتا ہے کہ ہم ناچیز خدام آپ کی کما حقہ تعلیم و تربیت نہ کرسکے ہوں۔ یہ عین ممکن ہے بلکہ ممکن ہے۔

ایسا ہے کہ اب تو نہ ویسے علماء رہ گئے، نہ وہ جہاں دیدہ علماء رہ گئے جن کے فضل و کمال کا ڈنکا بجتا ہو، کچھ ناچیز خدام ہیں جو یہاں آپ کی تعلیم کے لیے اور خدمت کے لیے اکٹھا ہوگئے ہیں، یہ آپ کی سعادت مندی ہے کہ آپ نے جو کچھ سیکھا ہے، اسے دلوں میں زندہ رکھا ہے، آپ اس پر عمل پیرا ہیں، اس کو عام کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور یہ مزید باعث اطمینان اور باعثِ مسرت ہے، اس لیے میں آپ کو اس کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس بات کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ کو میدانِ عمل میں جن مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس سلسلے میں ہماری جن کوتاہیوں کا پتہ چلے گا اس کے ازالے کے لیے ہم حتی المقدور کوشش کریں گے، اس لیے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ ہم ایسے فارغین تیار کرسکیں جو قرآن و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں، مسائل حاضرہ پر جن کی گہری نظر ہو، اسلام پر ہونے والے اعتراضات اور پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کے ازالے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہوں۔

اس سلسلے میں ہم جو کچھ کرسکتے ہیں کررہے ہیں، ہم آپ کے مشوروں کے منتظر رہیں گے اور ان مشوروں کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل میں، اپنے نصاب تعلیم میں، اپنے نظام تعلیم و تربیت میں ضروری اور مناسب تبدیلیاں بھی لائیں گے اور بہرحال اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے محدود وسائل کے باوجود جو کچھ بھی ہم کرسکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں گے۔ آپ کی یہ زندہ دلی، آپ کی حرکت اور آپ کی یہ سعادت مندی ہمارے حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ آپ کی آمد ہمارے حوصلوں کو بڑھا رہی ہے اور ہماری خوشیوں میں اضافہ کررہی ہے۔ اس سرزمین پر بہتر ے ادارے ہیں، اس سرزمین پر صدہا فارغین مختلف اداروں کے پھیلے ہوئے ہیں، لیکن بہت سے ادارے یہاں ایسے بھی ہیں جہاں کے فارغین کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ یہ میری

سعادت مندی ہے اور اس ادارے کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں کے فارغین گو کہ تعداد میں دو سو سے کچھ ہی زائد ہوئے ہیں لیکن بہرحال وہ ابھی سے، آغاز کار ہی سے منظّم ہو گئے ہیں اور یہ ان کی سرگرمیٔ عمل اور ان کا ایک لڑی میں پرو جانا اور مقاصد ادارہ کو روبعمل لانے کے لیے کوشاں اور فکرمند رہنا، کنونشن کا انعقاد کرنا اور اسے روبعمل لانا اس ادارے کے لیے فال نیک ہے۔ فارغین کی جہت ہمارے لیے باعث مسرت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی ہے وہیں آپ کے جذبات کا اندازہ کر کے آپ کی خدمات کا اندازہ کر کے مزید مسرت ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے، آپ کی کوششوں سے آپ کی حوصلہ افزائیوں سے آپ کے جدید ساتھیوں کو بھی حوصلہ ملے اور آپ کے ناچیز خادم کو اور آپ کے حقیر اساتذہ کو بھی وہی آب و تاب اور آپ کی ممکنہ رہنمائی کا موقع اور توفیق عطا فرمائے۔

اب میں پھر ایک بار اس کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں اور آپ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کا مزید اس بات پر ممنون ہوں کہ آپ نے اس کنونشن کے انعقاد کے لیے اس ناچیز کا انتخاب کیا۔ اسے میں کیا کہوں، بہرحال آپ کا احسان ہے، جس پر میں آپ کا مزید ممنون ہوں!

(ماخوذ از حیاتِ نو، فروری ۱۹۸۲ء)

منظومات

میرے استاد محترم

[مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ کی نذر]

سعید اختر اعظمی

جانے سے تیرے ٹوٹا ہے ہردل پہ کوہ غم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم
گہنا گیا وہ آخرش خورشید علم وفن — جس کی ضیا سے سینکڑوں مہتاب ضوفگن
روپوش ظلمتوں میں ہوئی نور کی کرن — روشن رہی جو برسوں، بجھی شمع انجمن
رستہ ہمیں دکھاتی رہی ہے قدم قدم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم
میدان خاص عربی ادب، خوب تھی نظر — شیریں بیان، گفتگو ہر لحظہ پُر اثر
''اصلاح'' سے ''فلاح'' تلک کاترا سفر — سالار کارواں تُو ہی، اور تُو ہی راہ بر
گنجینہ ہائے علم کی تقسیم دم بہ دم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم
ازبر ہے آج بھی وہ پڑھایا ہوا سبق — ہے نقش حرف حرف ہراک صفحہ، ہرورق
حل ہوگیا ہے مسئلہ، کیسا ہی ہو ادق — حق یہ ہے کہ ادا ہے کیا تونے سب کا حق
مطلوب علم جو تھا، دیا، بیش ہویا کم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم
قربت تھی تیری نازکے قابل، سدا رہی — ایسی گھڑی تھی زیست کا حاصل، سدا رہی
ہر کشتی طلب لب ساحل سدا رہی — جب چل پڑے تو سامنے منزل سدا رہی
تجھ کو ڈرا نہ پائے کبھی رَہ کے پیچ وخم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم
سچ یہ ہے بحرعلم سے جو کچھ ہمیں ملا — استاذ کا یہ فیض ہے، اُن کی ہے یہ عطا
تیری نوازشوں کا نہ دے پائیں گے صلہ — رب مغفرت کرے تری، اختر کی ہے دعا
ربّ کریم کا رہے ہراک پہ کرم — استاذ محترم، میرے استاذ محترم

آہ! پیکرِ وفا کھو گیا

(بیادگار مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ)

نصرت رضی فلاحی

ہوگی بیان ہم سے کہاں ان کی عظمتیں
گفتار سے بھی جن کے جھلکتی تھی شفقتیں

کچھ لوگ زندگی کو بناتے ہیں اک مثال
رکھتے ہیں اپنے بعد بھی زندہ روایتیں

آنکھوں میں کوئی خواب تھا ملت کے واسطے
جذبہ خدا کی راہ میں لیتا تھا کروٹیں

اک عکس جیسے نور کا بکھرا ہو چار سو
چہرے پہ یوں چمکتی تھی ان کے محبتیں

نصرتؔ شمار اپنا رہا خوش نصیب میں
جن پر رہی ہیں ان کے کرم کی عنایتیں

خوددار و باوقار تھے استادِ محترم

(نذرانۂ عقیدت بہ حضور استاد محترم مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ)

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن ضیاؔ فلاحی

خوددار وباوقار تھے استاد محترم
ہمدرد وغمگسار تھے استادِ محترم

سرتا پاانکسار تھے استاد محترم
قدرت کا شاہکار تھے استادِ محترم

چشمہ تھا ان کے فیض کا ہردم رواں دواں
مانند آبشار تھے استادِ محترم

تعلیم وتربیت ہوکہ میدان نظم ونسق
ہر اک کے شہسوار تھے استاد ِمحترم

مودودیؒ کی ہو فکر کہ فکر حمیدؒ ہو
دونوں کے رازدار تھے استادِ محترم

غوطہ زنی تھی آپؒ کو قرآن میں عزیز
غوّاص گہردار تھے استادِ محترم

شاہد ہے عالی شان یہ مسجد فلاح کی
معمارِ بردبار تھے استادِ محترم

سینچا تھا اپنے خون سے گلشن فلاح
کا اسباغ کی بہار تھے استاد ِمحترم

تا عمر کب کیا کبھی دستِ طلب
درازغیرت کے پاس دار تھے استادِ محترم

نام ونمود و اجروستائش سے بے نیاز
مصروفِ کار زار تھے استادِمحترم

ر بِّ کریم اُن کی کرے مغفرت ضیاءؔ !
محبوبِ کرد گار تھے استادِ محترم

●◘●

آپ کے خطوط

مدیر محترم!

معروضات برائے جریدہ حیات نو

براہ کرم درج ذیل سلسلۂ موضوعات کو متعارف کرنے پر غور کریں:

☆ آج کے کسی اہم موضوع پر مضمون بیک وقت ۲ یا ۳ حضرات سے یا سوال نامے کی شکل میں۔ پھر اس پر قارئین میں آرا کا تبادلہ ہو۔

☆ فکر مغرب / غیر اسلامی اداروں / نظام کا مختصر تنقیدی تعارف۔ انداز مجادلانہ یا محاربانہ نہ ہو۔

☆ اہم کتب بشمول غیر اسلامی کتب پر تعارف اور تبصرہ۔

☆ بہتر مسلمان / بہتر شہری / بہتر انسان بننے کی ترغیب پر مشتمل سلسلہء مضامین

☆ درس قرآن / درس حدیث کا نظم

☆ بین المسلکی اتحاد اور اتفاق کا پیغام

☆ اسلامی شخصیات کے درخشاں کارناموں کا ذکر

☆ نوجوان مقالہ نگاروں کی ہمت افزائی اور نقد انعام میں سالانہ دس ہزار کا اس مد میں تعاون کر سکتا ہوں۔

بہترین خواہشات

والسلام

عبدالرحیم قدوائی

●□●

اہم اعلان

ان شاءاللہ العزیز حیاتِ نو مادرِ درس گاہ کے قابلِ فخر طالب علم مولانا ڈاکٹر منور حسین فلاحیؒ (۱۹۵۹ء۔۲۰۰۰) کی حیات وخدمات پر نومبر۲۰۲۰ء کے شمارے کو مختص کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مولانا منور حسین ۱۹۷۶ء میں جامعۃ الفلاح سے فضیلت کی سند لے کر مسلم یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کیے گئے اور وہیں شعبۂ اردو میں لکچرار ہوگئے۔ ان کی زندگی علم وادب، ذکر وفکر، دعوت وارشاد۔ تعلیم وتربیت اور تحقیق وتدوین سے عبارت تھی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں وہ رفیقِ منزل، تحقیقاتِ اسلامی، جماعت اسلامی، ایس آئی او اور شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے منسلک رہے اور ہر جگہ تہذیب وشائستگی، سادگی وشرافت اور محبت واخلاص کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وہ اپنے عمدہ اخلاق اور بے لوث خدمات کی بنا پر آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

قارئین سے التماس ہے کہ ان کی زندگی کے قابل عمل وتقلید گوشوں کو قلم وقرطاس کے حوالے کرکے عنداللہ ماجور ہوں۔

[ادارہ]

JAMIATUL FALAH

P.O. Bilariaganj, Distt. Azamgarh-276121(U.P.) INDIA

جَامِعَةُ الفَلاح

بلریاگنج، اعظم گرہ، ۲۷۶۱۲۱ (یو.پی) الھند

Ref. 8320/20 الرقم

Date 13/04/2020 التاریخ

بنام طلبۂ قدیم وخیر خواہان جامعۃ الفلاح، اعظم گڑہ

عزیز گرامی!

الحمدللہ، آپ اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھیں جامعۃ الفلاح سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کے مقاصد آج بھی آپ کے پیشِ نظر ہوں گے، اور یہاں سے آپ نے جو کچھ سیکھا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر جامعہ کی بہترین نمائندگی کرتے ہوں گے۔

جامعہ سے نسبت کے تقاضے سے آپ کے حقوق جامعہ پر اور جامعہ کے حقوق آپ پر عائد ہوتے ہیں۔ جامعہ مسلسل آپ کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کی فکر کرتا ہے اور آپ کو حاصل ہونے والی ہر کامیابی اور ترقی سے خوش ہوتا ہے، نیز زندگی کے ہر موڑ پر ہر ممکن تعاون کے لیے تیار اور دست بدعا ہے۔

اِس تعلق کا لازمی تقاضا ہے کہ آپ مادرِ علمی کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔ نیز اپنے میدانِ اختصاص کے لحاظ سے آپ جامعہ کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں تجاویز اور مشورے اور ہر طرح کا معنوی و مادّی تعاون جامعہ کو دیتے رہیں۔

جامعہ اور وابستگانِ جامعہ کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کا ایک بہترین ذریعہ ماہنامہ ''حیاتِ نو'' ہے۔ اس کے ذریعے آپ جامعہ کی پیش رفت اور منصوبوں سے بھی واقف ہوتے ہیں اور فارغینِ جامعہ کی علمی کاوشوں سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔

☆ <u>مادرِ علمی کے ساتھ ربط وتعاون کی چند صورتیں:</u>

۱- اپنے حلقۂ احباب و متعلقین میں وسیع پیمانے پر جامعہ کی تعلیمی تحریک کا تعارف کرائیں اور طالبانِ علم کو اس کی طرف رجوع کرائیں۔

۲- خصوصاً آپ کے قریبی لوگوں میں کوئی طالب/طالبہ جو مالی عدمِ استطاعت کی بنا پر تعلیم حاصل نہ کر پا رہا ہو، اسے جامعہ کی طرف متوجہ کریں۔

۳- آپ جس میدان میں ہوں، اپنے مفید تجربات سے جامعہ کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔

۴- جامعہ کے سالانہ بجٹ کی فراہمی میں خود بھی دستِ تعاون دراز کریں اور اپنے حلقۂ تعارف سے بھی مدد کرائیں۔

۵- چند اساتذہ/معلّمات کی تنخواہوں کی فراہمی یا کسی ایک طالب کی کفالت کا ذمہ لیں۔

۶- ادارۂ علمیہ سے ہر سال ایک کتاب شائع کرانے کی مالی ذمہ داری اٹھائیں۔

۷- مرکزی لائبریری میں ''ڈیجیٹل لائبریری'' کی سہولت کے لیے چند کمپیوٹر سیٹ فراہم کرائیں۔

۸- جامعہ میں قائم ''الفلاح ہاسپٹل'' میں غریب اور نادار مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے، اس میں مقدور بھر تعاون دیں۔

۹- اس کے علاوہ تعاون کی جو صورت بھی مناسب لگتی ہو، اس سلسلہ میں ذمہ دارانِ جامعہ سے رابطہ کریں۔

۱۰- <u>خصوصی توجہ کی ضرورت:</u> عزیز گرامی! کرونا وائرس کے عالمی وملکی وباء کے نتیجہ میں جو ناگہانی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے، اس نے مدارسِ دینیہ کے کفالتی اور سفارتی نظام کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ جامعۃ الفلاح اپنے ابناء واحباب سے اس امتحان کی گھڑی میں اپنے ساتھ کھڑے ہونے کی امید کرتا ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو جامعہ اور ملتِ اسلامیہ کے لیے مفید اور کارآمد بنائے، آمین۔ والسلام

۱۲/۴/۲۰۲۰ء

رحمت اللہ اثری فلاحی (ناظمِ جامعہ)

Web:- www.jamiatulfalah.org, **Email**:- jamiatulfalah1962@gmail.com

Contacts:- Nizamat-9415985742, Taleemat-9651046619, P.R.O.- 9452203788, Girl's Sec.-7843850399

JAMIATUL FALAH

P.O. Bilariaganj, Distt. Azamgarh-276121(U.P.) INDIA

جامعۃ الفلاح

بلریاگنج، اعظم گڑھ، ۲۷۶۱۲۱ (یو.پی) الھند

Ref. 8322/20 — الرقم

Date — التاریخ: تاریخ: ۱۶/اپریل ۲۰۲۰ء

برادرانِ ملت کے نام ایک اہم اپیل

برادرانِ ملت! کرونا وائرس کے عالمی وملکی وباء کے نتیجہ میں جو ناگہانی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے، اس نے مدارس اسلامیہ کے کفالتی وسفارتی نظام کو بری طرح متأثر کیا ہے، حالانکہ اسی نظام پر مدارس کے سالانہ بجٹ کا انحصار ہوتا ہے۔ جامعۃ الفلاح ملت کے تمام اہل خیر اور بہی خواہان سے اس آزمائش کی گھڑی میں جامعہ کے ساتھ کھڑے ہونے کی امید کرتا ہے۔ جزاکم الله خیر الجزاء

جامعۃ الفلاح

بیسویں صدی میں تحریکات اسلامی کی کوششوں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اسلامی بیداری کی لہر نے اس بات کا شدید احساس پیدا کیا کہ تحریکی ضروریات کی بنیاد پر ایک جامع، مناسب، متحرک اور مؤثر نظام تعلیم وتربیت ترتیب دیا جائے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک طرف اگر طلبہ میں علوم دینیہ کی ماہرانہ صلاحیت پیدا کرے تو دوسری طرف ضروری عصری علوم سے بھی انہیں بہرہ ور کرے۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت ۱۹۶۲ء میں **جامعۃ الفلاح** کا قیام عمل میں آیا۔

آج سن ۲۰۲۰ء میں جامعہ کی عمر تقریباً ۶۰ سال ہونے کو ہے۔ کسی ادارہ کو تاریخی تشخص عطا کرنے کے لئے یہ مدت کافی ہے۔ امید ہے کہ جامعہ اپنے نظام اور فارغین کے ذریعہ ملک وملت کی تعمیر میں ایک قابل لحاظ کردار ادا کر سکے گا۔

مقاصدِ جامعہ

ا۔ جامعہ کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو

الف۔ قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔ ب۔ جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں۔ ج۔ جو اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔

د۔ جن میں احیاءِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔ ہ۔ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

۲۔ ایسا نصابِ تعلیم زیرِ عمل لانا جس میں دینی وعصری علوم کا بہترین امتزاج ہو اور جو جامعہ کی دینی اساس سے ہم آہنگ ہو۔

۳۔ اسلام کی خدمت کے لیے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق فکری، علمی اور تحقیقی مواد فراہم کرنا۔

۴۔ فنی، تیکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا اس طرح نظم کرنا کہ جامعہ کا بنیادی مقصد متأثر نہ ہو۔

نصاب تعلیم کے امتیازات

☆ ابتدائی سے فضیلت تک کا ایک جامع مربوط نصاب تعلیم ہے جس میں اسلامیات، عربی زبان وادب کے ساتھ بعض اہم عصری مضامین کو مناسب توازن کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

☆ قرآن وحدیث کی تعلیم میں مروج روایتی طرز تدریس کے بجائے تحقیقی واستخراجی طریقہ تدریس اختیار کیا جاتا ہے اس سے طلبہ میں استنباطی وتحقیقی صلاحیت فروغ پاتی ہے۔

☆ نصاب تعلیم کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک جامع خاکہ زیرِ عمل ہے، جس سے طلبہ کے اندر دعوتی وتحریکی شعور بیدار ہوتا ہے، انتظامی صلاحیت پروان چڑھتی ہے اور فکری وعملی بالیدگی کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام کے عمل کے لئے ضروری تیاری ہو جاتی ہے۔

☆ فقہِ اسلامی کی تدریس کے لیے تقابلی انداز اختیار کیا جاتا ہے، تاکہ مسلکی تعصب ختم ہو اور طلبہ وطالبات احوال وظروف کی رعایت کرتے ہوئے جملہ مسائلِ حیات میں اسلامی مزاج کو سمجھ سکیں اور معاشرے کی رہنمائی کر سکیں۔

آئینۂ جامعہ

تعداد	بورڈر	غیر بورڈر	مستطیع	غیر مستطیع		
					ماہانہ مصارف مشاہرہ	Rs.2209526/-
طلبہ	300	1252	107	193	ماہانہ مصارف وظائف طلبہ	Rs.250000/-
طالبات	415	2736	307	108	ماہانہ دیگر مصارف (اوسط)	Rs.1203013/-
میزان	715	3988	414	301	ماہانہ مصارف	Rs.3662539/-
اساتذہ ومعلمات	160	غیر تدریسی عملہ	86	کارکنان مطبخ=34	سالانہ مصارف	Rs.43950468/=

ناظم جامعہ

(رحمت اللہ اثری فلاحی)

JAMIATUL FALAH INDIA جامعۃ الفلاح الھند BILARIYAGANJ, DISTT. AZAMGARH 276121 U.P. بلریاگنج، اعظم گڑھ، یو.پی ۲۷۶۱۲۱

Web:- www.jamiatulfalah.org, Email:- jamiatulfalah1962@gmail.com
Contacts:- Nizamat-9415985742, Taleemat-9651046619, P.R.O.- 9452203788, Girl's Sec.-7843850399

With best compliments from

ADHAM ALI
Managing Director

+91-9821 03 2562

Swaidan

MANPOWER CONSULTANTS

Regn. No. B0513/MUM/PER/1000+/10/8522/2009

Real Tech Park, 1013, 10th Floor, Sector 30/A
Near Vashi Railway Station, Vashi
New Mumbai-400703 (India)
Tel: +91-22-66441600, Fax: +91-22-66441688
E-mail: admin@swaidan.in
Website: www.swaidan.in

www.vision2026.org
hwfindia2026
PURIFY YOUR WEALTH
PAY YOUR ZAKAT
TO THE MOST NEEDY
Zakat ul Fitr 100/-
Eid Gift 500/-
Iftar Kit for a family 3000/-
ORPHAN CARE PROJECT
18,000/- Per year
SCHOOL KIT PROJECT
1,500/- Per Kit
SELF EMPLOYMENT
Thela, Sewing Machine
E-Rikshaw, VTC
8,000 - 50,000/-
GRAMIN DOSTI
Village Development
10,00,000/- Per year
SCHOOL PROJECT
New Building & Improvment
of existing schools
10,00,000 -1,00,00,000/-
MICRO FINANCE
Establishment of
Credit cooperatives
2,00,000/-
ORPHANAGE / HOSTEL
50,00,000 - 80,00,000
COMMUNITY LEARNING CENTRE
2,50,000/- Per year
SCHOLARSHIPS
Under Graduation
Post graduation
10,000 - 1,50,000/-
HEALTH CARE
Medical Centre
Ambulance, Medical Camps
25,000 - 25,00,000/-
SKILL DEVELOPMENT PROJECT
10,000 - 3,50,000/-
HOUSING PROJECT
Low Cost House
1,50,000/-
DRINKING WATER
Hand Pump, SubMersibe
Openwell, Ro Plant
35,000 - 3,00,000/-
WOMEN EMPOWERMENT
Scholarships
Skill Development Training
15,000 - 30,000/-
NAGRIK VIKAS KENDRA
We help general public to get
Access to the government
welfare schemes
3,00,000/-
WINTER RELIEF PROJECT | COMMUNITY CENTRE | ADHAHI PROJECT | MOBILE MEDICAL VAN | CAREER GUIDANCE CENTRE
VISION 2026
Creating Partnership with the Needy
HUMAN WELFARE FOUNDATION
E-89, 4th Floor, Hari Kothi Lane, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025 (India)
Email: pr@hwfindia.org, Phone: +91 11 29945999,
Mob: +91 70428 98301 | 70428 98315
DEPOSIT YOUR DONATIONS
HUMAN WELFARE FOUNDATION
INDIAN BANK, JAMIA MILLIA ISLAMIA BRANCH
Saving A/C No. 894737750
IFSC : IDIB000J029
email us the detail of transaction with postal address at account@hwfindia.org or whatsapp 7042892026
— Core implementing Partners —
Donation to Human Welfare Foundation is eligible for Tax exemption under section 80G of Income Tax Act